اردو لسانیات

ایم۔اے اردو، سال اول

نصاب۔I
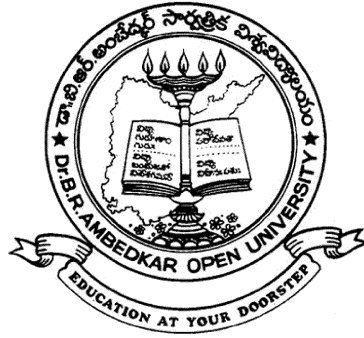
ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

حیدرآباد

2018

مجلس نصاب

مدیر

پروفیسر نسیم الدین فریس

مصنفین

پروفیسر خلیل احمد بیگ	(اکائی 8)
پروفیسر مجید بیدار	(اکائی 9,18,19,20)
پروفیسر خطیب مصطفیٰ	(اکائی 4,5)
ڈاکٹر معزہ قاضی	(اکائی 11)
ڈاکٹر نشاط احمد	(اکائی 13)
ڈاکٹر محمد خواجہ مخدوم محی الدین	(اکائی 10,16,17)
ڈاکٹر سمیہ تمکین	(اکائی 1)
ڈاکٹر رضیہ بیگم	(اکائی 6,7)
ڈاکٹر غوثیہ بانو	(اکائی 12)

کورس انچارج

پروفیسر شکیلہ خانم

ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ انچارج صدر شعبہ اردو،

ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

کوآرڈینیٹرس:

ڈاکٹر سمیہ تمکین

اکیڈمک اسوسیٹ ،ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

ڈاکٹر محمد خواجہ مخدوم محی الدین

اکیڈمک اسوسیٹ ،ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

سرورق : وینکٹ سوامی

پہلا ایڈیشن 2018ء

یہ کتاب ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی کے درسی نصاب کا جزو ہے۔ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی کے پروگرام کورس سے متعلق مزید معلومات ڈائرکٹر (اکیڈیمک) ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی، پروفیسر جی۔رام ریڈی مارگ، روڈ نمبر 46، جوبلی ہلز، حیدرآباد۔500033 (تلنگانہ) سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

web: www.braou.ac.in

نصاب کے مقاصد

اردو لسانیات کی یہ کتاب ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی کے ایم۔اے سال اول کے پہلے پرچے کے نصاب پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں لسانیات کے بنیادی مباحث اور موضوعات و نیز اردو کے عام لسانی مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ لسانیات میں زبان کا سائنٹفک مطالعہ کیا جاتا ہے۔لسانیاتی مطالعے میں زبان کی ساخت،قواعد (گرامر)،نحو،صرف،معنیات وغیرہ زیر بحث آتے ہیں۔لسانیات کی خصوصی شاخوں میں سماجی لسانیات، تقابلی لسانیات،نفسیاتی لسانیات، ساختیاتی لسانیات، تاریخی لسانیات وغیرہ شامل ہیں۔

مغرب میں لسانیات کا علم بہت زیادہ ترقی کر گیا۔ہندوستان کی بعض اہم زبانوں میں بھی لسانیات پر کافی کام ہوا ہے لیکن اردو میں اس علم سے خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی گئی۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو میں لسانیات کی عمر زیادہ نہیں ہے دوسرے اہل اردو لسانی مسائل پر روایتی انداز سے سوچنے کے عادی ہیں،لسانیات ہمارے مزاج کا حصہ نہیں بن سکی ہے۔تاہم اردو میں زبان کے سائنٹفک مطالعے پر مبنی کچھ کام ضرور ہوئے ہیں جن کی نوعیت تجزیاتی،توضیحی اور اطلاقی ہے۔علم لسانیات جدید ترین مسائل و مباحث پر فنی و تکنیکی نقطہ نظر سے بہت کم لکھا گیا ہے۔اردو میں لسانیات کے ابوآلا ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ہیں۔ان کی تصانیف انڈین فونی ٹکس (Indian Phonetics) اور ہندوستانی لسانیات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔زور صاحب سے قبل محمود شیرانی کی قابل قدر تصنیف ''پنجاب میں اردو'' بھی اردو کے لسانیاتی ذخیرے میں اپنی ایک پہچان رکھتی ہے۔ان کے علاوہ عبدالقادر سروری،مسعود حسین خاں،شوکت سبزواری،سہیل بخاری،گوپی چند نارنگ، گیان چند جین،عبدالستار دلوی وغیرہ کی تحریروں نے اردو میں علم لسانیات کے مختلف شعبوں میں وقیع اضافہ کیا ہے۔

ہمیں نہ صرف زبان کے بارے میں بلکہ اس کے اندرون میں اتر کر اس کی گہرائیوں اور باریکیوں سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔زبان کے عرفان کے اس عمل کو لسانیات کہتے ہیں۔لہٰذا زبان کا عارف بننے کے لیے اس علم کے اسرار و رموز،اصول وضوابط اور دیگر مسائل و مضمرات سے آشنائی لازمی ہے۔خصوصاً ادب کے طالب علموں کے لیے علم لسانیات کی آگہی نہایت ضروری ہے کیوں کہ ادب کے مطالعہ میں لسانیات کی روشنی ادب کی نئی جہتیں اجاگر کرتی ہے۔زبان کا آغاز وارتقا لسانیات کا موضوع ہے اور اس پر نظر رکھے بغیر ادب کا مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا۔انھیں اسباب وحقائق کے پیش نظر ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی کے ایم۔اے سال اول کے نصاب میں اردو لسانیات کا پرچہ شامل کیا گیا ہے۔

لسانیات کی یہ کتاب بیس (20) اکائیوں پر مشتمل ہے جنھیں پانچ بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان اکائیوں میں اردو لسانیات سے متعلق مواد کو منطقی ترتیب کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعے سے موضوع سے متعلق مختلف مسائل اور مباحث بہ تدریج آگے بڑھتے رہیں تاکہ طلبہ کو انھیں ذہن نشین کرنے میں آسانی ہو۔اکائیوں کے مواد میں علم لسانیات کی

تعریف، توضیحی لسانیات اور اس کے ضمنی مسائل، اطلاقی لسانیات اور اس کے ذیلی عنوانات اور لسانیات اور دیگر علوم سے اس کے تعلق کے علاوہ اردو زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق اہم موضوعات کی تفصیلی وضاحت شامل ہے۔ایم۔اے اردو کے اس پہلے پرچے کے کام کا آغاز عرصہ قبل کیا گیا تھا۔چار(4) اکائیوں کے لکھنے والوں کے نام دستیاب نہیں ہو پائے ہیں۔ مابقی سولہ(16) اکائیوں کے متعلق تفصیلات شامل ہیں۔

طلبہ سے خواہش کی جاتی ہے کہ اس کتاب میں فراہم کیے گئے مواد ومعلومات کے علاوہ اردو لسانیات سے متعلق دیگر علما اور محققین کے مضامین اور کتابوں کا بھی مطالعہ کریں تا کہ علم لسانیات اور اردو زبان کے لسانیاتی مسائل کے بارے میں ان کی معلومات میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو اور علم لسانیات سے ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہے۔

چوں کہ یہ کتاب ایم۔اے(اردو) کے نصاب کی کتاب ہے اس لیے اس میں اپنی معلومات کی جانچ شامل نہیں ہے البتہ ہر اکائی کے آخر میں نمونہ امتحانی سوالات دیے گئے ہیں تا کہ طلبہ کو امتحانی سوالات کا اندازہ ہو۔طلبہ کی سہولت کے لیے ہر اکائی کے آخر میں امدادی کتب کے نام دیے گئے ہیں۔توقع ہے کہ طلبہ ان کتابوں سے استفادہ کریں گے۔

ریڈیو، ویڈیو، ٹیلی کانفرنسنگ اسباق کے لیے طلبہ اپنے تعلیمی مرکز کے انچارج سے ربط پیدا کریں۔

فہرست

بلاک۔I

لسانیات کی تعریف

یہ بلاک علم لسانیات کی تعریف اور تعارف پر مشتمل ہے۔اس بلاک کے تحت دو اکائیاں ہیں۔ پہلی اکائی میں علم زبان کی تعریف اور تشریح کی گئی ہے۔مغرب میں لسانیات سے قبل علم زبان (Philology) کی اصطلاح رائج تھی۔ فائلا لوجی دراصل ادبی تنقید، تاریخ اور لسانیات کا امتزاج تھی۔ یہ تاریخی اور تقابلی لسانیات پر مشتمل تھی اور اس میں ادبی متن، اسلوب اور ساتھ ہی ساتھ تحریری اور تقریری ریکارڈز کا مطالعہ بھی کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں الفاظ اور ان کے معنی اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کے ارتقا کا جائزہ اور مردہ زبانوں کی (Decyphering) بھی اس کے دائرہ کار میں شامل تھی۔

زبان کے سائنٹفک مطالعہ کے لیے لسانیات (Linguistics) کی اصطلاح بعد میں وضع کی گئی۔ اس بلاک کی دوسری اکائی میں لسانیات کی تعریف، اس کے تفاعل اور دائرہ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس طرح یہ بلاک دو اکائیوں پر مشتمل ہے جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

اکائی 1 : علم زبان

اکائی 2 : لسانیات کیا ہے؟

اکائی 1 علم زبان

ساخت

1.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں علم زبان کی تعریف، اہمیت، علم زبان کی تاریخ اور اس کی شاخوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان اور علم کی تعریف کرتے ہوئے مختلف ماہرین زبان کے دو ایک اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور آخر میں علم زبان کی شاخوں پر تفصیلی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- علم زبان کی تعریف اور اس کی اہمیت بیان کر سکیں

- علم زبان کی تاریخ کو واضح کر سکیں اور
- علم زبان کی اہم شاخوں سے متعلق معلومات فراہم کر سکیں اوران کے مابین فرق کو واضح کر سکیں۔

1.1 تمہید

زبان کو عربی میں لسان کہا جاتا ہے اور انگریزی میں یہ Language کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ملفوظ آوازوں کی مدد سے انسان اپنے خیالات کی بہترین ترسیل کرتا ہے۔ اگر زبان نہ ہوتی تو ہماری زندگی دشوار ہو جاتی کیوں کہ سماج میں رہنے کے لیے زبان کا بولنا اور سیکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ زبان کے ذریعہ ہم اپنے خیالات کی بہ آسانی ترسیل کر سکتے ہیں۔ زبان کے باقاعدہ مطالعہ کو علم زبان کہتے ہیں جس میں لسانی عمل کے مختلف پہلوؤں جیسے اصوات اور ان کی تبدیلی وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

لہٰذا اس اکائی میں ہم ان امور پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے علم زبان اور اس کی شاخوں پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

1.2 زبان کی تعریف

زبان اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی عظیم نعمتوں میں سے ایک بیش بہا نعمت ہے۔ زبان، انسان کے جذبات و احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ زبان کے ذریعہ انسان اپنے خیالات، سماج میں ظاہر کرتا ہے۔ ماہرین لسانیات کے نزدیک زبان ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ انسان شعوری طور پر اپنے ارادے کے ساتھ اپنے خیال کو واضح انداز میں پیش کرتا ہے۔ زبان کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ دوسرے اس کی بات کو سنیں اور سمجھیں۔ گویا زبان خیال کو دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ دراصل زبان اور خیال ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ زبان کا وجود خیال کے بغیر ممکن نہیں۔

ماہرین لسانیات نے زبان کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ہنری سویٹ کے مطابق زبان:

"تکلمی آوازوں کے ذریعہ خیالات کے ظاہر کرنے کو زبان کہتے ہیں۔"

یعنی کہ وہ آواز جس کے ذریعہ انسان اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے زبان کہلاتا ہے۔ زبان کی تعریف کرتے ہوئے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> **"زبان لسانیات کی اصطلاح میں وہ ملفوظ آوازیں ہیں جو انسان اپنے منھ سے ادا کرتا ہے اور جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مافی الضمیر کو دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔" (بہ حوالہ زبان اور علم زبان، ص:9)**

زبان کی تعریف اور اس کے استعمال پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے "لوئی گرے" لکھتا ہے:

"زبان اپنے وسیع ترین اور عام مفہوم میں کسی جاندار کے جذباتی یا ذہنی تصورات کو ظاہر

کرنے اور دوسرے جانداروں تک پہنچانے یا ان سے حاصل کرنے کا کوئی بھی ذریعہ ہوسکتا ہے۔

اپنے خالص اور مروجہ مفہوم میں زبان وہ اظہار ہے جس کا ذریعہ انسان کا کلام ہے اور جسے دوسرے انسان سن سکتے ہیں۔ وہ آوازیں جو اظہار کا ذریعہ ہیں ایک ایسے مقررہ نظام میں اور اس طرح سے مربوط ہوتی اور سنائی دیتی ہیں جو عام استعمال کے لحاظ سے کسی مخصوص زمانے میں، ایک مخصوص سماجی گروہ کے عام افراد کے لیے عموماً قابل فہم ہو۔

اپنے ایک خاص اور مستعار مفہوم میں زبان کا لفظ، انسانوں کے آپس میں ایک دوسرے پر اپنے خیالات کو ظاہر کرنے اور انھیں حاصل کرنے کے دوسرے ایسے سارے وسائل اظہار جیسے اشاروں، علامتوں، نشانیوں اور اسی طرح کے دوسرے طریقوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اظہار کے ایسے ذریعوں میں بعض وقت بے جان اشیاء کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ جذبات، احساسات یا کسی خاص مفہوم کو ظاہر کرسکتے ہیں جیسے گھوڑے کی نعل، گلاب وغیرہ۔'' (بہ حوالہ زبان اور علم زبان، ص:12)

مندرجہ بالا تعریفوں سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ زبان انسان کے جذبات وخیالات اور تصورات وخواہشات کو ملفوظ آوازوں کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے۔

1.3 زبان کی تین صورتیں

ماہرین لسانیات کے مطابق زبان کی تین صورتیں ہیں (i) اشارے، (ii) تکلمی زبان اور (iii) تحریری زبان۔

1.3.1 اشارے

زبان کے ارتقا میں یہ پہلا مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔ اشاری زبان دراصل انسان کے اشاروں پر مبنی ہوتی ہے۔ جس کے مختلف گروہوں میں مختلف معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ انسان ایک سماجی حیوان ہے وہ سماج کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ابتدائی دور میں بھی انسان سماجی گروہوں میں اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زبان، بولی وغیرہ کا کوئی وجود نہیں تھا لیکن سماج میں رہتے ہوئے انسانوں کو اپنی ضروریات، اپنے خیالات واحساسات کو دوسرے ساتھیوں پر ظاہر کرنا زندگی کی اہم ترین ضرورت تھی لہذا ایسی صورتوں میں انھوں نے اشارے سے کام لینا شروع کیا۔ مثلاً اگر کسی کو پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کٹورے کی شکل بنائے پانی مانگتا ہے یا اگر بھوک محسوس ہونے لگے تو وہ اپنا ایک ہاتھ منہ کی جانب کرکے کچھ کھانے کے

لیے مانگتا ہے وغیرہ۔غرض یہ تمام حرکات وسکنات یا اشارے جو ہم آج بھی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں جس کا مقصد اشاروں کے ذریعہ ہماری گفتگو کو اور موثر بنانا ہوتا ہے۔

1.3.2 تکلمی زبان

یہ زبان کی ایک اہم صورت ہے۔یعنی انسان اپنے منہ سے کچھ بامعنی آوازیں نکالتا ہے اور ان آوازوں سے وہ اپنا مفہوم دوسروں تک پہنچاتا ہے۔آوازوں کو سمجھنے، سمجھانے کا یہ عمل صدیوں سے چلا آرہا ہے۔آوازوں کے اس عمل کو سمجھنے کے لیے ہمارے حواس خمسہ بھی بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔تکلمی زبان کے لیے دوسرا سامع کا ہونا نہایت ضروری ہے۔اگر ہم کچھ منہ سے بول رہے ہیں تو اس بات کو سننے کے لیے سامنے کوئی موجود رہنا نہایت ہی ضروری ہے اس کے ساتھ اس شخص میں سننے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔اگر کوئی بہرہ یا سماعت سے معذور ہے تو وہاں زبان کی یہ صلاحیت کام نہیں آئے گی بلکہ اپنے خیالات اس سامع تک پہنچانے کے لیے دیگر ذرائع اختیار کرنا پڑتا ہے۔لیکن زبان کی نشو ونما میں بول چال کی زبان شروع ہی سے کافی مددگار ثابت ہوئی ہے۔آج بھی ہم اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے تکلمی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔روزمرہ کی گفتگو میں بھی بول چال کی زبان کا عنصر لازمی ہے۔

1.3.3 تحریری زبان

زبان کے ارتقا میں تحریری زبان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔تحریر کو زبان کے ارتقا کا اہم زینہ تصور کیا جاتا ہے۔ تحریر، زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔انسان نے جب لکھنے کا فن سیکھ لیا تو پہاڑوں کی چٹانوں پر، جانوروں کی کھالوں پر، پتوں وغیرہ پر اپنے اس ہنر کو آزمانے لگا تاکہ اس کے خیالات کی ترسیل دوسرے لوگوں تک ہو۔انسان کا یہی عمل رسم الخط کا ذریعہ بنا۔انسان نے بامعنی آوازوں کو شکل کا جامہ پہنایا تو اس کی زبان کے حروف تہجی وجود میں آئے اور ان حرفوں کو جوڑنے سے الفاظ بنے اور ان الفاظ نے جملوں کا روپ اختیار کرلیا۔جس کی وجہ سے تحریر کے فوائد منظر عام پر آنے لگے۔زبان کی تحریری شکل میں وجود میں آنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ انسان کے خیالات تحریری شکل میں محفوظ ہونے لگے۔تحریری شکل میں ادبی سرمایہ نسل درنسل منتقل ہوا۔تحریر کی وجہ سے اعلیٰ پیمانے پر خیالات کی ترسیل عمل میں آنے لگی۔کسی بھی تحریر کو سمجھنے کے لیے انسان کا بڑے پیمانہ پر تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں بلکہ انسان کا ذہن اور اس کی نظر ہی کسی بھی تحریر کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔تحریر ہی کی وجہ سے کئی کتابیں وجود میں آئیں اور علوم وفنون کا خزانہ تحریری شکل میں موجود ہے لہذا زبان کی نشو ونما میں تحریر اور تقریر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

1.4 علم زبان کی تعریف واہمیت

علم زبان دراصل زبانوں سے متعلق ایک اہم علم ہے جس کے تعلق سے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

”علم زبان یا لسانیات ایک مستقل علم ہے جس میں لسانی عمل کے مختلف پہلوؤں جیسے

اصوات، ان کی تبدیلیوں، زبانوں کی ساخت، ان کی نوعیت، تبدیلیوں کی نوعیت، معنی وغیرہ کی چھان بین کی جاتی ہے اور زبان کی ساخت پر ان کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کی تحقیق اور ہر ایسے واقعہ کے اسباب و علل کی عام طور پر تحقیق کی جاتی ہے جو زبان پر اثر انداز ہوتا ہے۔'' (بہ حوالہ زبان اور علم زبان، ص: 31)

زبان کے باقاعدہ مطالعہ کو لسانیات یا علم زبان کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق علم زبان ایک طویل نام ہے اس پر لسانیات کو ترجیح دینا چاہیے۔ ان کے مطابق زبان کا مطالعہ دو طریقوں سے کیا جا سکتا ہے:

i۔ زمانے کے ایک مخصوص نقطہ کے مطابق (یہ نقطہ زمانہ حال ہی کا ہوتا ہے)۔

ii۔ تاریخ کی رو میں عہد بہ عہد ارتقا کو پیش نظر رکھ کر۔

جہاں تک علم زبان کا تعلق ہے اس کا موضوع تحریر نہیں ہے بلکہ بول چال کی زبان ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تحریر ہماری بول چال کی ہو بہو نقل ہوتی ہے لیکن یہ صد فی صد صحیح نہیں ہے کیوں کہ ہم بول چال کی زبان میں جو الفاظ استعمال کرتے ہیں تحریر اس کا کماحقہ حق ادا نہیں کر سکتی۔ اگر ہمیں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بول چال کے بجائے تحریر کا استعمال کرنا پڑتا ہے تو بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ جس کی وجہ سے بول چال کے جو الفاظ ہیں وہ معیاری زبان کا روپ دھار لیں گے اور بول چال کی زبان کہیں غائب ہو جائے گی یا پھر اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی لفظ کو مختلف لوگ مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں جیسے کہ عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''زبان اور علم زبان'' میں اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی شخص لفظ فرق کو ''فرق'' یا پھر ''پھرق'' یا ''فرک'' یا ''پھرک'' جیسے مختلف طریقوں سے ادا کر سکتا ہے غرض جس کا جو معیار ہوگا وہ اسی کے تحت اس لفظ کو استعمال کرے گا۔ ان کی بات چیت کے اس فرق کو اگر ہم یاد کر لیں تو اس طرح کے ''اختلافات تلفظ'' کی ہم کو بے شمار صورتیں دستیاب ہو سکیں گی جس کا مطالعہ ہم علم زبان یا لسانیات کے علم کے ذریعہ مناسب انداز میں کر سکیں گے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق علم زبان زیادہ تر تکلمی زبان سے تعلق رکھتا ہے اور بول چال کی زبان ہی دراصل حقیقی زبان ہے اور تحریر اکثر صورتوں میں اس کی نامکمل تصویر ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم زبان کے تحت جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ کہ زبان کی نوعیت سے کیا مراد ہے؟ زبانوں میں تبدیلی کے اسباب کیا ہیں؟ اور ایک سے زائد زبانوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ بھی اس علم کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے و نیز اس علم کے تحت زبانوں کا آغاز کس طرح سے ہوا؟ زبان کے فروغ میں کون کونسے عوامل کارفرما تھے؟ (ان پر بھی کھوج کی جاتی ہے) ان پر تفصیلی نظر ڈالی جاتی ہے علم زبان کی ضرورت کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''علم زبان کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ زبان کوئی جامد چیز نہیں وہ ایک نمو پذیر شئے ہے اور اس کے نمونوں میں ایک وسیع قسم کی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے لسانیات کا مطالعہ ایک دلچسپ مطالعہ ثابت ہو سکتا ہے۔''

علم زبان، ایک ہمہ گیر علم کی حیثیت رکھتا ہے اس کا خالص تعلق انسان سے ہے اور اس کا یہ عنصر اس علم کو میکانیکی حدود

میں داخل ہونے نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے علم زبان کو جب سائنسی علوم میں شامل کر لیتے ہیں تو یہ ایک محدود معنی بن جاتے ہیں جو صرف اس لیے کہ دونوں کا طریقہ کار ایک ہی ہے۔

علم زبان، ایک طرح سے سائنس کا کام انجام دیتی ہے یعنی کہ سائنسی علوم کی طرح مظاہر اور حقائق کی چھان بین اور تحقیق سائنسی اصولوں پر کی جاتی ہے۔ چناں چہ ہنری سویٹ کے مطابق:

''علم زبان کو اس حیثیت سے ایک طرف طبعی علوم اور دوسری طرف تاریخ اور ادبیات کے درمیان ایک اہم مقام حاصل ہے۔''

عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''علم زبان کو سائنس بھی کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ علم زبان میں بھی سائنسی علوم کی طرح، مظاہر اور حقائق کی چھان بین اور تحقیق اور اسباب و علل کی سائنسی یا حکمی اصولوں پر جانچ کی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ علم زبان میں بعض وقت مفروضات سے بھی مدد لینی پڑتی ہے لیکن استدلال اور تحقیق کی حد تک علم زبان اور علم سائنس کا طریقہ عمل ایک ہی ہے۔ یہاں کوئی بات بغیر حکمی شواہد اور دلائل کے قابل اعتماد نہیں ہوسکتی۔ اس پہلو سے لسانیات کا مطالعہ ایک نہایت ہی کارآمد مطالعہ بھی ثابت ہوتا ہے۔''

الغرض علم زبان بھی سائنس ہی کی طرح اپنے امور انجام دیتا ہے اور زبان کی ترقی میں نہایت ہی اہم رول انجام دیتا ہے۔

علم زبان کا تعلق زبان ہی سے متعلق ہے یہ سرے سے زبان پر انحصار کرتی ہے کیوں کہ زبان کے سائنسی تجربہ کا نام لسانیات ہے۔ علم زبان کی سبھی شاخیں جیسے صوتیات، لفظیات، معنیات، صرفیات اور نحو وغیرہ لسانیات کا جز ولاینفک ہیں۔ اگر علم زبان نہ ہوتا تو لسانیات کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ لہذ السانیات کا دار و مدار زبان اور علم زبان پر ہے۔

زبان کے سائنسی تجزیے کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔ سائنس کی روز افزوں ترقی کے سبب یہ محسوس کیا جانے لگا کہ زبان کا مطالعہ بھی سائنسی نقطہ نظر سے کیا جائے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے زبان کا مطالعہ سائنٹفک طریقوں سے کیا جانے لگا جس کے نتیجے میں صوتیات، فونیمیات، معنیات وغیرہ کی اصطلاحات وجود میں آنے لگیں، زبان کو سمجھنے اور سمجھانے کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور تقابلی قواعد کے تحت ان تمام کا تفصیلی مطالعہ کیا جانے لگا۔ بہ الفاظ دیگر زبان کے سائنسی طریقہ سے مطالعہ کو لسانیات کہتے ہیں۔ آج کے اس سائنٹفک دور میں ادب اور زبان کا مطالعہ سائنٹفک اصولوں پر کیا جارہا ہے لہذا علم زبان، ادب اور زبان کے سائنٹفک پہلوؤں کا مطالعہ ہے۔

علم زبان کے تعلق سے عموماً یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی خشک علم ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس علم کی بھی اپنی اہمیت اور دلچسپی ہے۔ علم زبان کی اہمیت کے تعلق سے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''علم زبان، ان قدیم اقوام کی زندگی اور تہذیب پر روشنی ڈالنے کا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے

جن کے آثار میں سوائے ان کی زبانوں کے کچھ اور سرمایہ نہیں ملتا۔"

غرض علم زبان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

1.5 علم زبان کی تاریخ

علم زبان کا باقاعدہ آغاز اس وقت ہوا جب لوگوں نے ان تمام امور پر سوچنے کا کام شروع کیا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ مختلف مقامات کے رہنے والے لوگ کیوں ایک ہی زبان نہیں بولتے؟ الفاظ پہلے پہل کیسے وجود میں آئے؟ کسی نام میں اور کسی چیز میں جس سے وہ نام منسوب ہے۔ کیا تعلق ہے؟ کسی بھی شخص یا کسی بھی چیز کو کوئی ایک نام کیوں دیا جاتا ہے؟ ان تمام سوالات کے جوابات ابتدا میں مذہبی امور کے تحت دیے جانے لگے۔

سئیس کے مطابق زبان کی نوعیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی سب سے پہلی کوشش بابل میں کی گئی۔ بابل کے تعلق سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہاں کے مشہور مندر میں جسے "ٹاور آف بیبل" کہتے ہیں مختلف نسلیں اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ اکٹھے ہوتے تھے جس کی بنیاد پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ زبان کا آغاز یہیں سے ہوا۔ سئیس لکھتا ہے کہ "تقابلی لسانیات کی قسم کی سب سے پہلی تحریر "بابل" کے آثار میں ملتی ہے۔" بابل کے لوگ جو زبان بولتے تھے وہ اکاڈین کے نام سے موسوم کی جاسکتی ہے۔ اس زبان کا رواج سترہویں صدی قبل مسیح میں مفقود ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہاں کی سرزمین پر دوسری قوم آباد ہوئی اور دوسری قوم کو پہلی قوم کی زبان سمجھنے کے لیے لغات اور قواعد لکھنے پڑے۔ اس کے لیے اہل بابل نے مشترک مادوں کی چھان بین کا عمل شروع کیا اور علما کے مطابق مادوں کا اصول علم زبان کا بنیادی اصول ہے اس لیے اہل بابل کی ان کوششوں کو اولین لسانی کوششوں کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد ہندوستانی قواعد نویسی کا دور آتا ہے۔ ویدوں کی زبان جب متروک ہوگئی اور بدھ مت اور جین مت کے ابھرنے کی وجہ سے پراکرتوں کو تحریری اور علمی زبان کا درجہ حاصل ہونے لگا تو ہندوؤں کو اپنی زبان کے علاوہ سنسکرت کے پڑھنے اور بول چال کی زبانوں سے اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہندوستان کے علما جیسے پانِنی وغیرہ نے زبان کے مطالعہ میں جو توضیحی اور تجزیاتی طریقہ اختیار کیا تھا اس سے مغربی علما بہت بعد کو واقف ہوئے اور سنسکرت زبان اور اس کے تجزیہ کے اصولوں سے واقف ہونے کے بعد مغربی علما کے فکر کی نہج بدل گئی اور جدید علم زبان کی بنیاد پڑی۔

یونانیوں نے علم زبان کے ارتقا کے سلسلہ میں ایک نئے رجحان کا آغاز کیا یعنی کہ ان کے یہاں خطابت کو بہت مقبول فن مانا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں یونانی فلسفیوں کو لفظوں کے اثر کا پتہ چلانے کے لیے خیال اور لفظ کے باہمی تعلق کی چھان بین کا احساس ہوا اور وہ اس میں مصروف ہوگئے لیکن لفظوں کی چھان بین میں علم بیان کو اتنا زیادہ فائدہ نہیں ہوا جتنا کہ منطق کو مدد ملی اور اس سے متعلق علم کو وہاں علم اشتقاق کے نام سے موسوم کیا گیا۔ رومی، علم زبان کے فروغ میں یونانیوں کے نقش قدم پر چلتے رہے اور انھوں نے زبان کے بنیادی اصول تسلیم کر لیے تاہم ان کے مطابق عملاً گفتگو میں ہر اصول کا ایک مستثنیٰ ہوتا ہے۔ ان کی اس توجہ کی وجہ سے انالوگسٹ (Analogist) اور انامولسٹ (Anamolist) کے طویل جھگڑوں کا خاتمہ ہوگیا۔

چودہویں اور پندرہویں صدی عیسوی کے اہم واقعات میں رومی اقتدار کا خاتمہ اور عیسائیت کی ترقی تھی جس کی بنا پر عیسائی علما مذہبی صحائف کا مطالعہ وسعت سے کرنے لگے۔ ان کے اس مطالعہ سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ ایک طرف یونانی اور لاطینی کے قریبی رشتہ کو سمجھنے کے قابل ہوئے تو دوسری طرف انھیں عربی، سریانی اور عبرانی میں بھی گہرا تعلق دکھائی دینے لگا و نیز اٹھارویں صدی عیسوی سے ایرانی زبان کے مطالعہ کا بھی دلچسپ سلسلہ یوروپ میں شروع ہوا۔

واسکوڈی گاما نے جب ہندوستان کا راستہ دریافت کرلیا تو یوروپی لوگوں کی آمد و رفت یہاں بھی شروع ہوگئی۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ سنسکرت زبان سے دھیرے دھیرے واقف ہونے لگے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں لایا تو وہاں اردو، بنگالی، مرہٹی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ ان کاوشوں کے نتیجہ میں اہل یوروپ ہندوستان کے ادبی کارناموں سے واقف ہونے لگے اور سنسکرت اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ترجمے یوروپی زبانوں میں شائع ہونے لگے۔ جب ہندوستانی زبانوں بالخصوص سنسکرت کے کارناموں کی اشاعت یوروپ میں ہوئی تو یوروپ میں لسانی مطالعہ کے لیے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

سرولیم جونز (1746-1794ء) نے کلکتہ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم کر کے جدید لسانیات کا سنگ بنیاد رکھا۔

اٹھارویں صدی کے علما زبانوں کی ساخت کے فرق کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے اس کے علاوہ اصوات کا بھی کوئی تصور ان کے پاس موجود نہیں تھا جس کے نتیجہ کے طور پر زبان کی تاریخ مسخ ہو جاتی تھی۔ لہٰذا ان تصورات میں سنسکرت زبان کے علم نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستانیوں کے مذہبی علوم کا ابتدائی سرمایہ سنسکرت زبان میں محفوظ ہے۔ مروجہ زمانہ کی بول چال کی زبانیں جب مقدس صحائف سے ممیّز ہونے لگیں تو ہندوستانی علما کو ان مقدس کتابوں کے صحیح طور پر مطالعہ کرنے کے لیے تفصیلی اور توضیحی قواعد مرتب کرنے کی ضرورت پڑی۔ جس کی بنا پر سنسکرت کی قواعد کا تجزیہ شروع ہوا۔ اصوات کے علم پر پہلی کتاب ''پرتی شاکھیا'' لکھی گئی۔ دوسرا اہم قدم ''یاسک'' نے اٹھایا جس نے اپنی کتاب ''نی رُکت'' میں علم اشتقاق سے بحث کی۔

سنسکرت قواعد نویسیوں میں پانی نی (تقریباً 350 تا 250 ق م) کا نام سرفہرست ہے۔ پانی نی نہ صرف سنسکرت کا بڑا قواعد نویس ہے بلکہ ساری دنیا کے قواعد نویسوں میں اونچا مقام رکھتا ہے۔ پانی نی کا شاہکار کارنامہ ''اشٹھا دھیائے'' ہے جو زبان کے تجزیہ اور توضیح کے اعتبار سے دنیا کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

پانی نی کے بعد دوسرا اہم قواعد نویس ''پتنجلی'' ہے جس کی کتاب ''مہابھاشیہ'' دراصل پانی نی کے اصولوں کی تشریح اور توضیح پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد جینی عالم ہیم چندر کو اہم مقام حاصل ہے۔ جب سنسکرت زبان کی قواعد یوروپ پہنچی تو یوروپی علما کو زبان کے اصول اور اس کے صحیح تجزیہ کے طریقے معلوم ہوئے۔ ان تجزیوں کی بنیاد نظریوں پر نہیں بلکہ گہرے مشاہدے پر مبنی تھی۔ تجزیہ کی بدولت جب صحیح روپ معلوم کرنے کے طریقے دریافت ہوئے تو الفاظ اور تشکیلوں کے روپ میں جو مشابہتیں پہلے دور میں مبہم نظر آرہی تھیں اب زیادہ علمی اور قطعی صورت میں دکھائی دینے لگیں۔

علم زبان کی اس توسیع سے زبانوں کے تاریخی اور تقابلی مطالعہ کو مزید ترقی ہونے لگی۔ تاریخی مطالعہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا یہ بات بھی واضح ہوتی گئی کہ زبانیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر تک علم زبان کے مطالعہ اور تحقیقات کو بڑی ترقی حاصل ہوئی جس کے نتیجہ میں ماہرین زبان

کے کارنامے شاہکار کی حیثیت اختیار کرنے لگے۔ دیگر ماہرین زبان کے علاوہ امریکی ماہرین لسانیات آگے آنے لگے اور اپنی کاوشوں کی بدولت علم زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ ان میں پہلا نام ولیم ڈوائٹ وٹنی (1894-1827ء) کا ہے جس نے اپنی دو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں پہلی کتاب زبان اور مطالعہ زبان پر مبنی ہے جو 1867ء میں شائع ہوئی، دوسری کتاب زبان کی زندگی اور اس کی نشو ونما کے موضوع پر 1874ء میں شائع ہوئی۔

آج علم زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہے لیکن وٹنی کے کارنامے علم زبان کی ترقی میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

الغرض علم زبان اپنی ابتدائی شکل سے لے کر آج تک ترقی کے زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے اور جیسے جیسے دنیا آگے بڑھتی جائے گی نئی زبانیں وجود میں آنے لگیں گی اور علم زبان کا مطالعہ ہوتا رہے گا اور سائنسی تجزیوں پر اس کے اصول متعین کیے جائیں گے۔

1.6 علم زبان کی شاخیں

علم زبان کے مطالعہ کو ہم کئی شاخوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی شاخ عام General اور اطلاقی Applied کی ہے۔ دوسری اہم ترین شاخ زمانے کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔ اگر زبان کا مطالعہ کسی مخصوص زمانہ کے نقطہ نظر سے کیا جائے تو اسے عصری لسانیات کہتے ہیں۔ اگر یہ مطالعہ زمانہ کے تسلسل میں کیا جائے تو اسے عصریاتی لسانیات یا عصریاتی مطالعہ کہتے ہیں۔

علم زبان ایک لامحدود علم ہے جیسے جیسے زبان کا ارتقا عمل میں آیا ویسے ویسے اس کی شاخیں بھی وجود میں آنے لگیں۔ علم زبان دراصل کئی ایک شاخوں پر مشتمل ہے۔ ماہرین لسانیات نے علم زبان کو آسان اور سہل بنانے کے لیے زبان کے مطالعہ کے لیے چند شاخیں متعین کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

i۔ صوتیات

ii۔ فونیمیات

iii۔ معنیات

iv۔ صرف

v۔ نحو

1.6.1 صوتیات

یہ زبان کے مطالعہ کی وہ اہم شاخ ہے جس میں زبان کی آوازوں یا اصوات کے ادا کیے جانے، ان کی ترسیل، ان کے سنائی دینے کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ عبدالقادر سروری کے مطابق:

> **''صوتیات میں پھیپھڑوں، حلق، منہ، کان، ناک کی کل یا مشینری کی بھی تفصیلی شرح کی جاتی ہے کیوں کہ یہ اصوات کے ادا کرنے اور سنائی دینے کے ذریعہ ہیں۔'' (بہ حوالہ**

زبان اور علم زبان، ص:42)

صوتیات میں اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ شاخ کسی ایک زبان تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس میں تمام زبانوں کا مجموعی مطالعہ کیا جاتا ہے باوصف اس کے اس میں کسی ایک بولی یا ایک زبان کی صوتیات پر بھی بحث کی جاتی ہے۔

صوتیات میں کسی زبان کی کُل صوتوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ آوازیں کس طرح پیدا ہوئی ہیں اور ان آوازوں کا مطالعہ اور تقابلی جائزے کے لیے کس طرح درجہ بندی کر سکتے ہیں اس کے تعلق سے اختر حسین اختر لکھتے ہیں:

''اصوات کے بغیر حروف تہجی اور الفاظ تشکیل نہیں پاسکتے۔ علم صوت میں آواز کیا ہے؟ کہاں پیدا ہوتی ہے؟ کیسے پیدا ہوتی ہے؟ دو آوازیں کیوں اور کیسے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں؟ وغیرہ کے بارے میں سائنسی رائے قائم کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اعضائے صوت کہاں واقع ہیں؟ آواز میں زیر و بم کیسے واقع ہوتا ہے؟ جیسے بے شمار سوالات پر مبنی مضامین کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔'' (بہ حوالہ لسانیات کی الف بے، ص: 42-43)

صوتیات کہہ کر بالعموم تلفیظی صوتیات مراد لی جاتی ہے اس شاخ میں ان آوازوں کی تخلیق کے عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جو نطق انسانی میں کام آتی ہیں۔ صوتیات کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر صورت کا صحیح ترین اور مفصل ترین بیان پیش کیا جائے اس کے لیے پہلی منزل انسان کے اعضائے نطق سے واقفیت ہے ان اعضا کی تکنیکی تفصیل تو علم تشریح الابدان (Anatomy) میں دی جاتی ہے جب کہ لسانیات میں صرف اسی پہلو سے سروکار رکھا جائے گا جس کا تعلق آواز کی تخلیق سے ہے۔

اعضائے نطق کو چار بڑے جونوں یا خلاؤں میں بانٹا جاسکتا ہے (1) خلائے دہن، (2) خلائے بنی، (3) خلائے حلق اور (4) خلائے حنجرہ۔

خلائے دہن میں ہونٹوں اور دانتوں کے علاوہ اوپری چھت کے چار حصے ہیں (1) اوپری مسوڑھا، (2) سخت تالو، (3) نرم تالو یا غشا، (4) کوایا لہات۔ خلائے بنی حلق سے ناک کو جانے والے پورے راستہ کو کہتے ہیں۔ حلق سے نیچے دو نلیاں جاتی ہیں پیچھے کی طرف کھانے کی نلی ہے اور آگے کی طرف سانس کی نلی۔ بیچ میں ایک دیوار ہے۔ سانس کی نلی کے منہ کے اوپر زبان کا سب سے نچلا حصہ کنٹھ ڈھکنا کہلاتا ہے جو ایک قسم کی چھوٹی سی جیبھ ہے۔ جب ہم کچھ کھاتے یا پانی نگلتے ہیں تو یہ ڈھکنا پھرتی سے سانس کی نلی کے اوپر آ کر اسے ڈھک لیتا ہے جس سے کھانا یا پانی سانس کی نلی میں نہیں جاتا۔ اگر کبھی اس ڈھکنے سے کوتاہی ہوتی ہے تو کھانے پینے کی تھوڑی سی مقدار سانس کی نلی میں چلی جاتی ہے اس پر اس نلی کے عضلات اسے زور سے باہر کو پھینکتے ہیں اور اسے اچھولگنا کہتے ہیں اس علاقہ کو خلائے حلق کہتے ہیں۔

سانس کی نلی کے اوپری حصہ میں عضلات کا ایک ڈبہ ہوتا ہے جسے حنجرہ کہتے ہیں۔ اس کے خارجی حصہ کو ٹیٹوا کہتے ہیں حنجرے میں دو صوتی تار ہوتے ہیں جو تار سے زیادہ گوشت کے ہونٹ جیسے ہوتے ہیں یہ آگے کی طرف جڑے اور پیچھے کی طرف

کھلے ہوتے ہیں۔

صوتی تاروں کے نزدیک آنے پر ارتعاش سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو اصطلاح میں Voice کہتے ہیں۔ صوتی تاروں کے دور معمول کی حالت میں اپنے طور پر جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں انھیں Voiceless کہا جاتا ہے۔

صوتیات کا علم کسی خاص زبان سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اس میں تمام زبانوں کی آوازوں کا عمومی مطالعہ کیا جاتا ہے ان کی نزاکتوں کو کاغذ پر ظاہر کرنے کے لیے نشانات متعین کر لیے جاتے ہیں بہ قول گیان چند جین ان میں سب سے مشہور بین الاقوامی صوتی لہجہ (International Phonetic Alphabet یا P.A 10) ہے۔ 1886ء میں سپرسن نے دنیا بھر کی زبانوں کے لیے ایک رسم الخط تیار کرنے کے بارے میں پال پاسی کو ایک خط لکھا تھا اس کے نتیجہ میں 1888ء میں پیرس میں بین الاقوامی صوتی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کا مقصد ایک ایسے لہجہ کو تخلیق کرنا تھا جس میں نطق انسانی کی ہر آواز کے لیے ایک واضح نشان ہو۔ اس وقت انجمن کے ارکان کو غیر یوروپی ممالک کی آوازوں کا علم نہیں تھا اس کے لیے ان کے چارٹ میں صرف انہی آوازوں کے لیے نشانات مقرر کیے گئے تھے جو وہ جانتے تھے بحث ومباحثہ کے بعد ان میں ضرورت کے حساب سے ترمیمات اور اضافے ہوتے رہتے تھے۔ اس چارٹ کے مقابلے میں دنیا بھر کی زبانوں میں آوازوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لہجہ میں یہ اہتمام ہے کہ کسی بھی زبان کی مزید آوازوں کے لیے حسب ضرورت نئی علامات کے اضافے کی اجازت ہے۔ امریکہ میں مختلف مصنفوں کے اس چارٹ سے ہٹ کر زیادہ تفصیلی علامات کا استعمال کیا گیا۔

غرض صوتیات کا مطالعہ امریکہ میں بڑی تفصیل سے ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں اس پر صرف کرنے کے لیے وسائل زیادہ نہیں ہیں لیکن پونا اور آگرہ میں صوتیات پر مبنی ایک اچھی لیباریٹری کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض دوسری جگہوں پر بھی اس پر کام کیا جا رہا ہو۔

1.6.2 فونیمیات

اس میں کسی ایک زبان کے صوتیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ صوتیات میں آوازوں کی زیادہ سے زیادہ نزاکتیں دریافت کی جاتی ہیں لیکن اس کے برخلاف فونیمیات میں غیر ضروری نزاکتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے و نیز صرف انھیں اختلافات کا جائزہ لیا جاتا ہے جو معنی کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس طرح اصوات کی متعدد ''ذریات'' کی گروہ بندی کر کے انھیں کم سے کم صوتیوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے اس شاخ کو Phonology بھی کہتے ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب بین الاقوامی صوتیاتی انجمن کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ دنیا کی تمام زبانوں کی آواز کو صفحہ قرطاس پر لایا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ناممکن ہے کیوں کہ محل تلفظ کی رو سے آوازوں کے لیے لامتناہی امکانات ہیں۔ لہذا 1920ء کے بعد کئی ماہرین لسانیات نے آزادانہ طور پر یہ دریافت کیا کہ آوازوں کی جملہ نزاکتیں اور اقسام روانہ کرنے کا کام اہم نہیں بلکہ عملی حیثیت سے کار آمد اکائیاں ہی اہم ہیں جنھیں فونیم کا نام دیا گیا۔

لفظ فونیم کا استعمال سب سے پہلے ہیویت نے 1876ء کے قریب میں کیا تھا لیکن اس نے محض اسے زبان کی

آوازوں کے معنی میں لیا تھا۔ 1920ء کے بعد کئی ایک ماہرین صوتیات نے فونیم کا نظریہ پیش کیا جس میں چیکوسلوا کیہ کے پرنس نکولس ٹروبیز کوئی اور امریکہ کے پیسر اور بلوم فیلڈ قابل ذکر ہیں۔ بعد میں Pike نے اس موضوع پر غور کیا تو اس موضوع پر ایک کتاب ''Phonemics'' کے نام سے لکھ دی۔

فونیمکس یا فونیمیات وہ علم ہے جو کسی زبان کے فونیم دریافت اور متعین کرے اور اس کے ذیلی اقسام کا بھی مطالعہ کرے۔ بعض لکھنے والے فونیمکس کو Phonology بھی کہتے ہیں۔

فونیم کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''کسی زبان کے نظام اصوات میں فونیم صوتی حیثیت سے مماثل آوازوں کا ایسا گروہ ہے جو کسی قسم کے دوسرے گروہوں سے مختلف اور متضاد ہے۔''

واضح ہو کہ فونیم اور فونیمیات کا تعلق کسی مخصوص زبان یا بولی سے ہوتا ہے جب کہ صوتیاتی مطالعہ کسی مخصوص زبان کا بھی ہوسکتا ہے اور عام طور سے نطق انسانی کا یا کئی زبانوں کا۔

ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق ایک فونیم کی ذیل میں نازک سے نازک فرق کی بنا پر جتنی آوازیں شامل ہوتی ہیں انھیں ہم صوت یا ذیلی صوت کہتے ہیں۔ ایک فونیم کے مختلف ہم صوتوں کا فرق محض صوتیات کی بنا پر کیا جاتا ہے یہ فرق عملی طور پر اہم اور بامعنی نہیں ہوتا۔ ہم کسی لفظ میں ایک فونیم کا ایک ہم صوت نہ بول کر دوسرا ہم صوت بول دیں تو معنی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ مثلاً انگریزی میں PIN کو پھن بولا جائے تو کوئی فرق نہیں آئے گا لیکن اس کے باوجود کوئی دوسرا فونیم استعمال کیا جائے تو بہت فرق آئے گا اور معنی بدل جائیں گے۔ لہذا کسی بھی زبان کے فونیموں کی شناخت میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ ''دو فونیم مختلف الفاظ میں یکساں ماحول میں آسکتے ہیں (بلکہ آتے ہیں) لیکن ایک فونیم کے دو صوت کبھی یکساں ماحول میں نہیں آسکتے۔''

اگر ہمیں لفظوں کا ایسا جوڑا مل جائے جس کے دونوں الفاظ میں محض ایک ایک آواز مختلف ہو بقیہ سب یکساں ہوں اور ان الفاظ کے معنی میں فرق ہو تو یہ قطعی طور پر طے ہو جاتا ہے کہ یہ مختلف آوازیں مختلف فونیم ہیں کیوں کہ محض انہی کی بنا پر لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں لہذا ایسے جوڑوں کو اقلی جوڑا کہتے ہیں۔ جیسے بار۔ پار، کل۔ کیل، آب۔ آپ، وغیرہ۔ یہ سب اس قسم کے اقلی جوڑے ہیں جس سے ب اور پ، اَ اور اِی، ز اور ژ کی علاحدہ فونیمی حیثیت طے ہو جاتی ہے۔

اگر ہمیں دو آوازوں کا اقلی جوڑا دستیاب نہ ہو تو یہ کافی ہے کہ ایک ایسا جوڑا تلاش کرلیا جائے جس کے دونوں الفاظ جزوی طور پر مشترک ہوں اور یہ مشترک حصہ زیر غور آوازوں کو اپنے بیچ پرکھتا ہو یعنی یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں آوازیں یکساں ماحول میں واقع ہوئی ہیں یعنی ایسا کوئی جوڑا ہاتھ میں آجائے جس کے ان اجزا میں مطابقت ہو جہاں یہ آوازیں واقع ہوتی ہیں اور بقیہ میں اختلاف ہو تو بھی کام چل سکتا ہے ایسے جوڑے کو مماثل جوڑا کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ن۔ ں کے تضاد کے لیے منکا۔ ڈنکا، سنکی۔ جھینگی ایسے ہی دو مماثل جوڑے ہیں۔

جو آوازیں ایک دوسرے کے ساتھ یکساں ماحول میں واقع ہوتی ہیں انھیں تضاد کی حالت کہا جاتا ہے جب وہ معنی کا فرق بھی کر دیتی ہیں تو ان کی حیثیت جداگانہ فونیم کی ہو جاتی ہے تضاد کے لیے محض ایک قلی یا محض ایک مماثل جوڑا کافی ہے۔ فونیم کے ادراک کے لیے مندرجہ ذیل اصول پیش نظر رکھنے چاہیے:

(i)صوتی مماثلت (ii)نظام اصوات میں باضابطگی (iii) کفایت کا اصول۔

اس کے علاوہ اردو فونیم میں ستائیس (27) مصمتے ہیں اور آٹھ (8) مصوتے پائے جاتے ہیں جو اس طرح ہیں:

اکتالیس (41) مصمتے

ب پ ت ٹ ج چ ح خ د ڈ ر ڑ ز ژ س ش ع غ ف ق ک گ ل م ن ںُ بھ پھ تھ ٹھ جھ
چھ دھ ڈھ رھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ

دس (10) مصوتے

(و)(µ)وو(O)و(δ)اَ(a)ے(e)ئَ(ʌ)ے(E)آ(a)اَے(ae)اَو(au)

ہر زبان کا رسم الخط اس کی آوازوں اور تلفظ کو صحت سے ادا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔کوئی اس تلفظ کو نہایت ناقص طریقہ سے ادا کرتا ہے تو کوئی اچھے طریقہ سے۔ جسے دیکھ کر انیسویں صدی کے درمیان بین الاقوامی صوتیاتی لہجہ (International Phonetic Alphabet) کو ایجاد کیا گیا جس میں مختلف زبانوں کی جملہ آوازوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کیا گیا۔دنیا بھر کی زبانوں کا کام تو مشکل تھا البتہ اہم مغربی زبانوں کی آوازوں کو ضرور لیا گیا۔اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ جس آواز کے لیے علامت نہ ہو اسے کسی نئی علامت یا مروجہ علامتوں میں سے کسی پر خصوصی نشانات کا اضافہ کر کے ظاہر کیا جائے۔

فونیم کا تصور ابھرنے پر سب سے سادہ تحریر وہ مانی گئی جو فونیم کے لیے ایک نشان اور ایک نشان سے ایک فونیم ظاہر کرے۔

1.6.3 معنیات

معنیات میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔یہ زبان کے مطالعہ کا وہ شعبہ ہے جس میں لفظوں اور ان کے معنوں میں تعلق اور ان کی تبدیلیوں سے بحث کی جاتی ہے۔معنیات کا تعلق علم زبان کے انسانی پہلو سے ہے۔علم زبان میں معنی کا مسئلہ نہایت ہی اہم ہے۔الفاظ کے معنی ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں جس کے تعلق سے اسٹرنے ونٹ لکھتا ہے:

''لفظ کے معنی اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔''

معنیات دراصل علم زبان کا جدید شعبہ ہے جس کی وجہ سے یہ ابھی تک اتنا زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوا جتنا صوتیات کا ہوا ہے لیکن اس کے باوصف علم زبان کے مطالعہ کی یہ نہایت ہی دلچسپ شاخ ہے۔

لفظوں کے معنی میں تبدیلی کے کئی اسباب ہوتے ہیں لیکن ان میں سب سے اہم سبب لفظوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں مستعار لینا ہوتا ہے۔مستعار لفظ جب نئے ماحول میں آموجود ہوتے ہیں تو ان کے معنوں میں تغیر کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ تغیر تدریجی ہوتا ہے۔

عبدالقادر سروری نے معنوی تغیر کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔(i) معنوں کی توسیع (ii) معنوں کی تجدید (iii) معنوں کے انتقال۔

(i) معنوں کی توسیع

کسی لفظ کے معنوں میں اکثر اوقات توسیع ہو جاتی ہے عموماً مخصوص الفاظ کے معنوں میں عمومیت پیدا کر لی جاتی ہے۔

(ii) معنوں کی تجدید

زبانوں میں معنوں کی تجدید یا سکڑاؤ کی مثالیں معنوں کی توسیع کہ بہ نسبت کہیں زیادہ ملتی ہیں۔الفاظ جو عام اور وسیع معنوں کے حامل ہوتے ہیں وہ کسی خاص معنوں کے کسی مخصوص پہلو کے لیے استعمال ہونے لگتے ہیں۔

(iii) معنوں کا انتقال

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ الفاظ میں ایک ثانوی مفہوم کا شائبہ موجود ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ اصلی مفہوم کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ صورت لفظ کے معنی کی ایک مفہوم سے دوسرے مفہوم میں منتقلی کی ہے۔مثلاً گنوار کے اصلی معنی گاؤں والے کے ہیں مگر آج اس لفظ کے معنی ناشائستہ اور بعض وقت ناسمجھ کے بھی لیے جاتے ہیں۔

الفاظ کے معنی میں تبدیلی کا سب سے اہم سبب نفسیات سے متعلق ہوتا ہے کیوں کہ انسانی تصورات ایک دوسرے سے ملحق یا ملے جلے ہوتے ہیں اور یہی تصورات ایک لفظ کے معنوں کے دوسرے لفظ کے ساتھ وابستہ کر دیے جانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔صوتی تبدیلیوں کے فائدے بتانا ممکن ہے لیکن معنیاتی تبدیلی کے فائدے بتانا ناممکن نہ سہی بے حد مشکل امر ہے۔ ہاں اس کے اسباب کی توضیح کی جاسکتی ہے۔لہذا اس سلسلہ میں ٹکر نے حسب ذیل اسباب کو اہمیت دی ہے:

''i۔ وضاحت بیان کے لیے استعارے کا استعمال
ii۔ ماحول کی تبدیلی
iii۔ تخاطب میں احترام کا لحاظ
iv۔ نرم گوئی
v۔ جذباتی زور
vi۔ لفظوں کے استعمال میں لچک
vii۔ لفظوں کے معنی کا عدم تعین
viii۔ لفظ کے مفہوم کو اخذ کرنے میں افراد کے درمیان فرق
ix۔ لفظ میں کسی خاص عنصر کا نمایاں ہونا
x۔ لفظ میں غیر شعوری طور پر ثانوی مفہوم کا شامل ہو جانا۔''

الغرض معنیات علم بیان کی ایک نہایت ہی دلچسپ شاخ ہے اور اس سے مختلف سرزمینوں میں انسانی نسل کے جو

تجربات رہے ہیں ان پر روشنی پڑتی ہے اسی لیے معنیات کو زبان کا انسانی پہلو کہا گیا ہے۔

علم زبان کی اہم شاخ معنیات کو نواحی شعبہ بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل ڈی ساسور کے کورس سے معنیات کا نیا نقطہ نظر وجود میں آیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس شعبہ کو بہت سے نام دیے گئے جن میں Sematalogy، Semontics، Semasiology، Semology وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن 1883ء میں مشہور ماہر معنیات Breal کی اصطلاح Semontics کو معنیات کے لیے مستند مان لیا گیا۔ معنیات کی دو اہم شاخیں ہیں (i) بیانی معنیات، (ii) تاریخی معنیات۔

معنیات کے نقطہ نظر سے مسلسل کلام کو جن اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے وہ مارفیم ہیں، الفاظ ہیں۔ لفظ کی بہت ساری تعریفیں کی گئیں مگر ان میں ابہام پایا جاتا ہے بعض لوگوں نے تو لفظ کو اصطلاح کے طور پر ماننے سے انکار کردیا لیکن معنیات میں لفظ کو اکائی ماننا ہی سب سے زیادہ عملی اقدام ہے بہ قول گیان چند جین لفظ کے مطالعہ کو علم اللغات (Lexicology) کہتے ہیں۔

لغاتیات کے دو حصے ہیں (i) لفظ کی ساخت کا تجزیہ کرنا یعنی لغاتی مارفیمیات اور (ii) لفظ کے معنی بیان کرنا یعنی لغاتی معنیات۔

اس طرح لغاتیات کا تعلق معنیات سے بہت گہرا ہے۔

لفظوں کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے (i) خاص لفظ اور (ii) معاون یا امدادی لفظ۔

خاص لفظ وہ ہے جو خاص معنی کے حامل ہوتے ہیں اس میں اسم اور فعل وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ لغاتی معنیات کا کام انجام دیتے ہیں۔

معنی کے علم کا عصری یا تجزیاتی مطالعہ بیانی معنیات کہلاتا ہے اور عصریاتی مطالعہ تاریخی معنیات کہلاتا ہے۔ بیانی معنیات میں معنی کی تعریف، علامت و رموز کا تعلق، صوتی نام اور مفہوم کی خصوصیات، نام اور مفہوم کے تعلق کی مختلف صورتوں پر غور کیا جاتا ہے۔ تاریخی معنیات معنی کے ارتقا یعنی معنوی تبدیلی کے مطالعہ کا نام ہے اور اس کا موضوع تبدیلی کی نوعیت معنوی، تبدیلی کے اسباب اور ان اسباب کی گروہ بندی۔ معنوی تبدیلی کے مظاہر اور معنوی تبدیلی کے قوانین پر بحث کرنا ہے۔

غرض علم زبان کی اہم شاخ معنیات میں الفاظ کے معنوں سے بحث کی جاتی ہے۔

1.6.4 صرف

صرف یا مارفیمیات (Marphology) میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مادہ میں سابقے اور لاحقے لگا کر نئے الفاظ کا اشتقاق کیوں کر ہوتا ہے وغیرہ۔

صرف کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''مارفیم چھوٹی سے چھوٹی بامعنی اکائی ہوتی ہے۔''

یعنی مارفیم یا صرف وہ چھوٹی سی چھوٹی اکائی ہے جس میں ہیئت اور موضوع کے بیچ ایک رشتہ ہو۔

مارفیم چھوٹے سے چھوٹا بامعنی جزو ہے۔ مثلاً گھر، میز، کرسی واحد مارفیم ہیں۔ ہوشیار، روزگار، دو دو مارفیموں کے

مجموعے ہوتے ہیں ہوش+یار، روز+ گار۔بعض اوقات ایک مارفیم کی کئی ذیلی شکلیں ہوتی ہیں مثلاً وہ کھا کر گیا یا وہ کھا کے گیا، یا دس بجنا چاہتے ہیں یا دس بجا چاہتے ہیں۔ان جملوں میں کر اور کے یا بجنا اور بجا کے نا اور آ ہم معنی ہیں یہ ایک ہی مارفیم کی شکلیں ہیں جنھیں ایلو مارف کہتے ہیں۔

مختلف اجزا کی ترتیب کی بنا پر مارفیم کی دو قسمیں ہیں (i) مسلسل (ii) غیر مسلسل۔

مسلسل مارفیم وہ ہیں جن کے فونیم ایک سلسلہ میں آتے ہیں۔ بیشتر مارفیم اسی قسم کے ہوتے ہیں۔لہذا آریائی زبانوں کے مارفیم بیشتر مسلسل ہوتے ہیں۔غیر مسلسل مارفیم وہ ہیں جن کے فونیم ایک جیسے نہیں ہوتے یا ایک سلسلہ میں نہیں ہوتے۔عربی میں ان کی تعداد بہت ہے اور عربی کے اثر سے اردو میں بھی ہندی کی بہ نسبت غیر مسلسل مارفیم کہیں زیادہ ہیں۔

1.6.5 نحو

نحو میں کسی بھی زبان کے جملوں کی ساخت اور جملوں میں لفظوں کی ترتیب کے قاعدوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

نحو کی تعریف کرتے ہوئے مختلف ماہرین زبان اس طرح سے لکھتے ہیں۔

گلیسن کے مطابق نحو:

''جو ترکیبیں تعریف اور اشتقاق کے عمل سے بنتی ہیں انھیں اور بڑی بندشوں میں ترتیب دینے کے اصولوں کو نحو کہتے ہیں۔''

ہاکیٹ نحو کے تعلق سے یوں لکھتا ہے:

''نحو میں وہ طریقے شامل ہوتے ہیں جن سے کلام میں الفاظ اور فوق قطعاتی مارفیموں کو ایک دوسرے کے رشتے میں ترتیب دیا جاتا ہے۔''

ہال نحو کے تعلق سے کہتے ہیں:

''نحو ان طریقوں کا مطالعہ ہے جن میں الفاظ استعمال ہوتے ہیں جب کہ مارفیمیات ان طریقوں کا مطالعہ ہے جن سے لفظ بنتے ہیں۔''

یعنی کہ مارفیمیات لفظ کی ساخت کا مطالعہ کرتی ہے اور نحو لفظ سے بڑی ترکیبوں میں لفظوں کی ترتیب کا۔ باوصف اس کے ان دونوں کی حدود بعض مقامات پر مبہم ہوتی ہیں اور بعض مقامات پر یہ دو شاخیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔مختصر یہ کہ نحو کے تحت جملہ اور فقرہ آتے ہیں اس طرح صرف و نحو کو ملا کر زبان کی قواعد کہا جاتا ہے۔

1.7 خلاصہ

زبان، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی عظیم نعمتوں میں سے ایک بیش بہا نعمت ہے۔ماہرین لسانیات کے مطابق زبان

ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ انسان شعوری طور پر اپنے ارادے کے ساتھ اپنے خیال کو واضح انداز میں پیش کرتا ہے۔ ماہرین لسانیات نے زبان کی تین صورتیں بتائی ہیں (i) اشارے، (ii) تکلمی زبان اور (iii) تحریری زبان۔

علم زبان دراصل زبانوں سے متعلق ایک اہم علم ہے۔ علم زبان کا موضوع تحریر نہیں ہے بلکہ بول چال کی زبان ہے۔

علم زبان کے تحت جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ کہ زبان سے کیا مراد ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ زبانوں میں تبدیلی کے اسباب کیا ہیں وہ بھی اس علم کے ذریعہ معلوم کیے جاسکتے ہیں و نیز اس علم کے تحت زبانوں کا آغاز کس طرح سے ہوا؟ زبان کے فروغ میں کون کونسے عوامل کارفرما تھے ان پر تفصیلی نظر ڈالی جاتی ہے علم زبان ایک ہمہ گیر علم کی حیثیت رکھتا ہے اس کا خاص تعلق انسان سے ہے۔ علم زبان ایک طرح سے سائنس کا کام کرتا ہے یعنی کہ سائنسی علوم کی طرح مظاہر اور حقائق کی چھان بین اور تحقیق سائنسی اصولوں پر کی جاتی ہے۔ علم زبان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ علم زبان کا آغاز اس وقت ہوا جب لوگوں نے ان تمام امور پر سوچنے کا کام شروع کیا کہ مختلف مقامات کے رہنے والے لوگ ایک زبان کیوں نہیں بولتے، الفاظ پہلے پہل کب وجود میں آئے، وغیرہ وغیرہ۔

علم زبان ایک لامحدود علم ہے جیسے جیسے زبان کا ارتقاعمل میں آیا ویسے ویسے اس کی شاخیں بھی وجود میں آنے لگیں۔ علم زبان دراصل کئی ایک شاخوں پر مشتمل ہیں۔ (i) صوتیات، (ii) فونیمیات، (iii) معنیات، (iv) صرف، (v) نحو۔

صوتیات زبان کے مطالعہ کی وہ اہم شاخ ہے جس میں زبان کی آوازوں یا اصوات کے ادا کیے جانے، ان کی ترسیل، ان کے سنائی دینے کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔

فونیمیات میں کسی ایک زبان کے صوتیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔

معنیات میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

صرف یا مارفیمیات میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

نحو میں کسی بھی زبان کے جملوں کی ساخت اور جملوں میں لفظوں کی ترتیب کے قاعدوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

غرض علم زبان ایک اہم علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان کے بغیر علم زبان کا وجود ناممکن ہے۔ لہذا جیسے جیسے زبان اپنے ارتقا کے مراحل طے کرتی رہتی ہے ویسے ویسے علم زبان اور اس کی وسعت میں پھیلاؤ آتا رہے گا۔ علم زبان کی وجہ سے دنیا کی ساری اہم زبانوں سے متعلق تفصیلات، علم زبان سے دلچسپی رکھنے والے افراد تک بہ آسانی پہنچ سکتی ہیں۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ علم زبان کی تعریف، اہمیت اور اس کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔

2۔ علم زبان کی تاریخ بیان کیجیے۔

3۔ علم زبان کی شاخوں پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ زبان کی تعریف کرتے ہوئے علم زبان کی تعریف واہمیت پر روشنی ڈالیے۔

2۔ معنیات کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کی اہمیت بیان کیجیے۔

3۔ صوتیات کسے کہتے ہیں؟ اس پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

1.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ زبان اور علم زبان : عبدالقادر سروری

2۔ لسانی مطالعہ : پروفیسر گیان چند جین

3۔ عام لسانیات : پروفیسر گیان چند جین

4۔ لسانیات کی الف بے : اختر حسین اختر

اکائی 2 لسانیات کیا ہے؟

ساخت

2.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں لسانیات کی تعریف، زبان کا مطلب، اظہار بیان کی ارتقائی صورتیں، آغاز زبان اور زبانوں کی خاندانی تقسیم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- لسانیات کی تعریف کر سکیں
- خیالات کی ترسیل کے طریقوں کو بیان کر سکیں
- آغاز زبان سے متعلق قیاس آرائیوں پر اپنی رائے پیش کر سکیں
- زبان کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات کی وضاحت کر سکیں اور
- زبانوں کی خاندانی تقسیم کے اصول بیان کر سکیں۔

2.1 تمہید

ہمارے چاروں طرف پھیلی کائنات اور اس میں موجود اشیا و مظاہر کو سمجھنے کی دو سطحیں ہیں۔ایک روحانی سطح ہے جہاں یہ عقیدہ کام کرتا ہے کہ اس کائنات کو بنانے میں کسی قادر مطلق یعنی سب سے بڑی غیبی طاقت کا ہاتھ ہے جو اس پورے کارخانے کو چلا رہی ہے۔اس طاقت کو دنیا کے مختلف مذاہب اور عقائد میں الگ الگ نام دیے گئے ہیں۔دوسری تعقلی یا سائنسی سطح ہے جس میں ہم اشیا کی ماہیت اور ان کے اصول عمل یا میکانزم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ تعقل یعنی سوچنے، سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت انسانوں کو قدرت کی طرف سے عطا کی گئی ہے۔سائنسی تحقیق کے مطابق روئے زمین پر انسان اپنی سب سے ابتدائی شکل میں پندرہ سے سترہ لاکھ سال پہلے پیدا ہوا تھا۔اس وقت سے آج تک اس کی سوچنے اور سمجھنے اور نتیجتاً تجسس کی صلاحیت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے۔ہم اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے بنیادی طور پر بولے ہوئے الفاظ کو کام میں لاتے ہیں لیکن اس بارے میں ہم نے شاید ہی سوچا ہوگا کہ خیالات کی ترسیل کا عمل ہوتا کیسے ہے۔اب چوں کہ آپ سائنسی نقطہ نظر سے ایک ایسی انسانی صلاحیت کا مطالعہ کر رہے ہیں جس کی روزمرہ زندگی میں بنیادی اہمیت ہے، لسانیات کے بنیادی تصورات کو سمجھنا آپ کے لیے ضروری ہے۔

2.2 لسانیات کیا ہے؟

لسانیات کا مطلب زبان کا سائنسی مطالعہ ہے۔سائنسی مطالعے سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ جس طرح اس کائنات کا ایک نظام ہے، ہمارے جسم کا ایک نظام ہے اسی طرح جو زبان ہم بولتے ہیں اس کا بھی ایک نظام ہے۔سائنسی مطالعے میں اسی نظام کے اجزا اور ان کی ساختوں کو سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے۔زبان بحیثیت آوازوں کے مکمل نظام (یا ساختوں کا مجموعہ) کا تصور بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے رائج نہیں ہوا تھا۔اس سے پہلے زبان کا مطالعہ، الفاظ کی تاریخ اور مختلف زبانوں کے الفاظ کے تقابل اور موازنے تک محدود تھا۔اس مطالعے کے لیے فیلولوجی (Philology) کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔

لسانیات کی باضابطہ تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ ایسا سائنسی علم ہے جس کا مقصد تمام موزوں نظری اور عملی پہلوؤں سے زبان و تکلم اور اس سے قربت رکھنے والے دیگر علوم سے اس کے رشتے کی وضاحت کرنا ہے۔اس کے مطالعے کے مقصد اور تفتیش و تحقیق کے طریقہ کار کی وجہ سے اس میں طبعی علوم (نیچرل سائنس) اور سماجی علوم (سوشیل سائنس) دونوں کی خصوصیات آجاتی ہیں۔

جب ہم زبان کی ساخت کا مطالعہ علامتوں یعنی آوازوں کے نظام کے طور پر کرتے ہیں تو ہمارا تعلق لسانیات کی اس شاخ سے ہوتا ہے جسے ''توضیحی لسانیات'' کہتے ہیں۔اس شاخ کے اہم شعبے یا ذیلی شاخیں (i) صوتیات، (ii) فونیمیات، (iii) صرف یا تشکیلیات، (iv) نحو اور (v) معنیات ہیں۔

جب ہم توضیحی لسانیات سے حاصل کردہ نتائج کا اطلاق بعض مخصوص مسائل پر کرتے ہیں تو اس مطالعے کو اطلاقی

لسانیات کہا جاتا ہے اور اس کی ذیلی شاخیں (i) اسلوبیات، (ii) ساختیات، پس ساختیات، (iii) تدریس زبان، (iv) لغت نویسی اور اصطلاح سازی، (v) ترجمہ اور مشین اساس ترجمہ، (vi) لسانی منصوبہ بندی ہیں۔

ان کے علاوہ ایک تیسری شاخ عام لسانیات کی بھی ہے جس کا تعلق زبان کی آفاقی خصوصیات سے متعلق نظریات وضع کرنے سے ہے۔

ان سب کے بارے میں آپ الگ الگ بلاک 2 اور بلاک 3 میں پڑھیں گے۔

2.2.1 زبان اظہار کا وسیلہ

حیاتیاتی نقطہ نظر سے زبان جسم کے اس عضو کو کہتے ہیں جس کا تعلق ہمارے ذائقے اور چکھنے کی حس سے ہے۔ لسانیاتی نقطہ نظر سے زبان سے مراد انسان کے منہ سے ارادتاً ادا کی گئی آوازوں کے اس مجموعے سے ہے جن کا کوئی مفہوم اور معنی ہو۔ بولنے کے عمل میں ہمارے جو اعضا کام کرتے ہیں ان میں زبان، دونوں ہونٹ، دانت، تالو، نتھنے اور حنجرہ اہم ہیں۔ ان میں متحرک ترین عضو زبان ہے جو اوپر، نیچے اور دائیں، بائیں ہر طرف حرکت کر سکتی ہے۔ زبان کے مقابلے میں بولنے کے عمل میں شامل باقی تمام اعضا ساکت رہتے ہیں۔

2.2.2 زبان باترتیب آوازوں کا مجموعہ

آوازوں کی الگ الگ نوعتیں ہوتی ہیں۔ تیز ہوا یا آندھی کا چلنا، بجلی کا کڑکنا، آبشار کا بہنا، گھوڑے کا ہنہنانا، پرندوں کا چہچہانا، دیوار کا گرنا، ریل کی سیٹی، گاڑی کا ہارن، یہ سب آوازیں ہیں لیکن ان کا زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا سروکار ان آوازوں سے ہے جو انسان مقررہ ترتیب سے ادا کرتے ہیں اور جنھیں وہ الفاظ کی شکل میں اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہاں ترتیب کا لفظ قابل غور ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''سوچنا'' آوازوں کو ایک خاص ترتیب میں ادا کرنے سے بنتا ہے جس کا ہماری زبان میں ایک معین مفہوم ہے۔ اگر ہم اس ترتیب میں ذرا سی تبدیلی کر کے ''وچناس'' (و چ ن ا س) بولیں تو یہ اپنی شکل کے اعتبار سے لفظ تو ہوگا لیکن ہم اس سے کوئی مفہوم نہیں اخذ کر سکتے جو ہماری زبان میں مستعمل ہو۔ اس لیے لسانیاتی اعتبار سے اس کی حیثیت غیر لفظ کی ہوگی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ ہمیشہ معنی کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ انسان بھی بعض آوازیں نکالتے ہیں مثلاً کھانسنا، کھنکارنا، تالی بجانا وغیرہ انھیں الفاظ کا درجہ کیوں نہیں حاصل ہے۔ ان آوازوں کو ہم الفاظ کا درجہ نہیں دے سکتے کیوں کہ ان کے مقررہ مفاہیم نہیں ہوتے بلکہ مختلف حالات میں بدلتے رہتے ہیں۔

2.2.3 زبان کی تعریف

مندرجہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں زبان کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ زبان انسان کے منہ سے الفاظ کی شکل میں ادا کی گئی ان آوازوں کا مجموعہ ہے جسے دوسرے انسان سن سکتے ہوں یا جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا یا فرض کیا جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے سن رہے ہیں۔ یہ آوازیں ایک مقررہ نظام سے مربوط ہوتی ہیں اور عام استعمال کے لحاظ سے کسی مخصوص زمانے

میں ایک مخصوص سماجی گروہ کے عام افراد کے لیے عموماً قابل فہم ہوتی ہیں اور اس طرح ترسیل کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ زبان کسی گروہ کے افراد کے درمیان ایک مسلمہ سمجھوتہ بھی ہے۔ کسی زبان کے بولنے والے کے لیے اس کے الفاظ الگ الگ مخصوص اشیا، تصورات اور کیفیات کی علامات ہوتے ہیں۔

2.2.4 اظہار کی تین ارتقائی صورتیں

انسانی زندگی کے مرحلہ وار ارتقا کی روشنی میں اظہار و ترسیل کی تین صورتیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ (i) اشاری اظہار، (ii) تکلمی اظہار اور (iii) تحریری اظہار۔

انسان اشارے کر کے یا اعضا کی مخصوص حرکات کو بھی اظہار کا وسیلہ بناتا ہے اور مختلف انسانی گروہوں میں اس کے الگ الگ مفہوم ہوتے ہیں۔ اسے زبان کی نشو و نما کا سب سے پہلا مرحلہ قرار دیا گیا ہے مثلاً ہاتھ اوپر اٹھا کر رکنے کا، ہاتھ نیچے کر کے پنجے کو حرکت دے کر بیٹھنے کا، ہاتھوں کو جوڑ کر کٹورے کی شکل بنا کر پانی مانگنے کا اشارہ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سامنے والا شخص بھی ان اشاروں اور حرکات کا مطلب سمجھتا ہو۔

تکلمی اظہار قریب یا سامنے موجود شخص تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ہوتا ہے یا دو افراد کے درمیان ٹیلی فون پر گفتگو سے اس کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ براہ راست تبادلہ خیال کی صورت کو پیش کرتا ہے۔ ہم گفتگو کرتے ہوئے بھی اشاروں سے کام لیتے ہیں تا کہ اپنے مفہوم کو زیادہ موثر بنا سکیں۔ اس طرح تکلمی اور اشاری زبان یک جا ہو جاتی ہیں۔

تحریری اظہار کے لیے سننے والے شخص یا اشخاص کی تعداد، مقام کی وسعت اور وقت کی مدت کی کوئی پابندی نہیں ہے یعنی اس کی مدد سے کسی انسان کے خیالات بے شمار افراد تک، دنیا کے مختلف مقامات تک اور مدتوں تک پہنچتے رہتے ہیں۔

2.2.5 آغازِ زبان سے متعلق قیاس آرائیاں

زبان کا مطالعہ کرنے والے ماہرین اس بارے میں برابر قیاس آرائیاں کرتے رہے ہیں کہ کسی شے، تصور، احساس یا کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص آوازوں کے مجموعوں کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ مشہور جرمن اسکالر میکس مولر نے اپنی کتاب ''سائنس آف لینگویج'' میں زبان کے آغاز کے بارے میں آج تک کی جانے والی قیاس آرائیوں کو چار نظریوں کی صورت میں پیش کیا ہے، ان کا جائزہ لیا ہے اور ان پر رائے زنی کی ہے۔ یہ نظریے ہیں:

(i) صوت تقلیدی نظریہ جس کے مطابق الفاظ فطری آوازوں کی نقلیں ہیں۔ یہ نظریہ اس خیال پر قائم کیا گیا ہے کہ بچے عموماً جانوروں کو اس آواز سے پہچانتے ہیں جو وہ ان سے سنتے ہیں مثلاً بھوں بھوں (کتا)، میاؤں (بلی)، چوں چوں (چڑیا)، میں میں (بکری)۔

(ii) فجائی نظریہ جس کے مطابق مختلف چیزوں اور مناظر کو دیکھ کر یا مختلف کیفیتوں میں اچانک انسان میں الگ الگ احساسات و جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کا اظہار وہ مختلف آوازوں کے ذریعے کرتا ہے۔ مثلاً ''اف'' اور ''اوہ'' حیرت کے لیے، ''ہائے'' اور ''آہ'' تکلیف اور رنج کے لیے ''واہ'' پسندیدگی کے لیے۔

(iii) ابتلازائی (پیتھوجینک) نظریہ کی بنیاد یہ تصور ہے کہ آواز اور اس کے مفہوم میں ایک خاص چھپا ہوا تعلق ہوتا ہے۔ اس کے

مطابق ابتدائی زمانے کا انسان جب خاص خاص چیزوں کا مشاہدہ کرتا تھا تو جوابی ردعمل کے طور پر اس کے منہ سے بے ساختہ کچھ آوازیں نکل جاتی تھیں۔ یہی آوازیں رفتہ رفتہ اس چیز کے نام کے طور پر استعمال ہونے لگیں۔ مثلاً اردو کے الفاظ ''جگ مگ''، ''جھل مل''، ''جل تھل''، ''دھک دھک'' وغیرہ۔

(iv) ہائی سونظریہ یہ کہتا ہے کہ جب انسانوں کو ساتھ مل کر کرنے والے کسی مشکل کام اور محنت کے کام میں زور لگانا پڑتا ہے تو سب مل کر کچھ آوازیں بلند کرتے ہیں مثلاً ''ہیں سا'' یا ملاح جب لنگر اور مچھیرے سمندر میں سے مچھلیوں سے بھرا ہوا جال کھینچتے ہیں تو ''ہے ہو'' کی آواز بار بار نکالتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ محنت و مشقت کے دوران جو آوازیں انسانوں کے منہ سے نکلتی ہیں وہ اس کام کو ظاہر کرتی ہیں جن میں وہ مصروف ہوں۔

ماہرین لسانیات نے مختلف زمانوں میں یہ قیاس آرائیاں کی ہیں اور یہ تمام نظریات ایک ساتھ مل کر بھی زبان کے تمام الفاظ کی ابتدا کو سمجھنے میں ہماری مدد نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ یہ کہ بے آرامی اور تکلیف، حیرت اور خوشی کی کیفیت میں، کسی منظر کو دیکھنے سے پیدا ہونے والے احساس میں اور اجتماعی محنت ومشقت کرنے کی حالت میں، منہ سے نکلنے والی آوازوں میں ''فجائیت'' یا ''فوری پن'' کا عنصر مشترک ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آغاز زبان سے متعلق نظریے صرف دو ہیں ایک صوت تقلیدی نظریہ اور دوسرا فجائی نظریہ۔

2.2.6 دنیا کی زبانوں کی خاندانی تقسیم

دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ ایسی زبانوں کی تعداد کم ہی ہے جن کے بارے میں ہم اپنی معلومات کو تشفی بخش کہہ سکتے ہوں۔ اب تک ہم جن زبانوں کے بارے میں جان پائے ہیں ان میں روزمرہ استعمال کی چیزوں، جانوروں، عام کاروبار کی باتوں، رسوم ورواج، رشتے ناتوں کے نام اور گنتیوں کی صوتی مشابہتوں اور قواعدی ساخت کی مماثلتوں کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پر انھیں مختلف خاندانی گروہوں یا خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان گروہوں یا خاندانوں کی تعداد چودہ ہے اور ان کی شاخیں اور ذیلی شاخیں بھی ہیں:

1۔ ہندیوروپی:

(i) جرمنک (انگریزی، ڈچ، سویڈش)
(ii) کلٹک (برٹن، آئرش، ویلش)
(iii) رومانش (فرانسیسی، ہسپانوی، روماتین، پرتگالی)
(iv) سلاوک (روسی، پوش، زچ، بلغاری)
(v) بالٹک (لتھوانی، لاٹوین)
(vi) ایرانی (فارسی، کردی، افغانی)
(vii) انڈک (ہندی، اردو، پنجابی، سنہالی)
(viii) البانین (البانی)
(ix) آرمینین (آرمینیائی)

2۔ فینیوگریک(فنش،اسٹونیائی،ہنگیرین،لاپش)

3۔ الطائی:

(i) ٹرکیک (ترکی،آزربیجانی،ازبکی)

(ii) منگول (منگولی)

(iii) مانچو (مانچو)

4۔ باسک(Basque):

5۔ افروایشیائی:

(i) سامی (عبرانی،عربی،حمیری،حبشی)

(ii) مصری (قبطی)

(iii) بربر (قبائل،زناگا)

(iv) کشیت(Cushitie)(صومالی،گلا)

(v) چاڈ (ہوسا)

6۔ نائجیر۔کانگو:

(i) مغربی اٹلانٹک (بوروم،تلاری)

(ii) مانڈے (کیپل،بمبارا)

(iii) کوا(kava) (آکان،یوروبو،ایبو)

(iv) گور (مُسی)

(v) مرکزی (ایفیک،تیواور بانٹوزبانیں مثلاً سواحلی اورزولو)

7۔ جاپانی(جاپانی،کوریائی):

8۔ تبت۔چینی:

(i) تبّتی۔برمن (تبّتی،برمی،گارو)

(ii) چینی

9۔ کدائی (تھائی،لاؤسی،شان)

10۔ ملائی۔پولینیسی:

(i) انڈونیشیائی (مالے،جاونیز،جاپانی،ٹگالوگ،مالاگاسی)

(ii) مشرقی (ہوائین،سموون،فیجی)

11۔ آسٹریلیائی(والبری):

12۔ دراوڑی (تمل، تلگو، کنڑ، ملیالم، گونڈ)۔

13۔ آسٹروایشیائی (کھاسی، سنتھالی، کھمیر، ویتنامی)۔

14۔ امریکی۔ہندی:

(i) الکونکوئن

(ii) ناشنز مسکوجین

(iii) سیوون(Sivuan)

(iv) کڈوون(Cuddovan)

(v) ایروکوئن(Iroquian)

(vi) کیونیکن

(vii) اسکیمو۔ الیوٹ(Aleut)

(viii) موسان

(ix) پینوشین(Penutian)

(x) ہوکان

(xi) مایان

(xii) یوٹوازٹیکان(Uto-Aztican)

(xiii) اتھابسکان(Athabaskan)

2.2.7 ہندوستانی زبانوں کی خاندانی تقسیم

ہندوستان میں کئی نسل کے لوگ بستے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں کی زبانوں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تعلق چار خاندانوں سے ہے۔ جو اس طرح ہیں (1) ہندآریائی (جو ہند۔یوروپی کی ایک ارتقائی شکل ہے اور اردو کا تعلق اسی سے ہے)، (2) دراوڑی، (3) تبت چینی اور (4) آسٹروایشیائی یا آسٹرک۔

ہندآریائی کے تین مراحل ہیں

(i) قدیم ہندآریائی (1500ق۔م سے 600ق۔م تک)

(ii) درمیانی ہندآریائی (600ق۔م سے 1000عیسوی تک)

(iii) جدید ہندآریائی (1000عیسوی تا حال)

دراوڑی خاندان کی اہم زبانیں تمل، تلگو، کنڑ، ملیالم ہیں۔ دراوڑ خاندان کی ایک بولی براہوی بلوچستان میں بولی جاتی ہے جو فارسی کی مختلف بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ اس لیے اس میں فارسی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔

تبت چینی خاندان کی جو شاخیں ہندوستان میں رائج ہیں وہ تبت برمی اور تھائی چینی یا سیامی چینی ہیں۔

آسٹرک خاندان کی جو زبانیں ہندوستان میں بولی جاتی ہیں ان میں کھاسی، سنتھالی اور کھمیر شامل ہیں۔

2.3 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے لسانیات کی اصطلاح اور اس کے دائرہ کار کا تعارف کرایا ہے اور اس سے متعلق بعض اہم

تصورات کی وضاحت کی ہے۔اس اکائی کے اہم نکات اس طرح ہیں:

1۔ لسانیات کا مطلب زبان کا سائنسی مطالعہ ہے۔اس کا موضوع زبان بحیثیت آوازوں اور علامتوں کا مکمل نظام ہے۔
2۔ لسانیات کی اہم شاخیں توضیحی لسانیات، اطلاقی لسانیات اور عام لسانیات ہیں۔
3۔ لسانیات کی رو سے زبان انسان کے منہ سے ارادتاً ادا کی گئی آوازوں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جس کا کوئی مفہوم ہو۔
4۔ آوازوں کے مجموعوں سے مفہوم اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب انھیں مقررہ ترتیب سے ادا کیا جائے۔
5۔ آوازوں کے مجموعے یا الفاظ معنی کے تابع ہوتے ہیں اور یہ معنی کسی زبان کو بولنے والوں کی طرف سے فرض کیا گیا ہوتا ہے۔
6۔ انسانی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اظہار و ترسیل کی تین صورتیں پیدا ہوئیں: اشاری، تکلمی اور تحریری۔
7۔ لسانیات کے ماہرین نے آغاز زبان سے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ان قیاس آرائیوں کو ایک جرمن اسکالر میکس مولر نے چار نظریوں میں تقسیم کیا ہے۔
8۔ چیزوں، جانوروں، رشتے ناتوں اور گنتیوں میں پائی جانے والی صوتی اور تشکیلی مماثلتوں کی بنیاد پر دنیا کی زبانوں کو مختلف خاندانوں یا گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان خاندانوں کی تعداد 14 ہے۔
9۔ ہندوستان میں بولے جانے والی زبانوں کا تعلق چار خاندانوں سے ہے اور وہ ہیں ہند آریائی، دراوڑی، تبت چینی اور آسٹرک۔

2.4 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔
   1۔ لسانیات کیا ہے؟ اس کی وضاحت اور باضابطہ تعریف کرتے ہوئے اس کے طریقہ کار پر روشنی ڈالیے۔
   2۔ اظہار کی تین ارتقائی صورتوں پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
   3۔ ہندوستانی زبانوں کی خاندانی تقسیم کی وضاحت کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔
   1۔ زبان کی تعریف بیان کیجیے۔
   2۔ اطلاقی لسانیات کسے کہتے ہیں؟
   3۔ دنیا کی زبانوں کی خاندانی تقسیم کے بارے میں اپنی معلومات فراہم کیجیے۔

2.5 سفارش کردہ کتابیں

1۔ زبان اور علم زبان : عبدالقادر سروری
2۔ لسانی مطالعے : گیان چند
3۔ اردو ساخت کے بنیادی عناصر : نصیر احمد خاں

بلاک۔II

توضیحی لسانیات

کسی زبان کا ایک مخصوص نقطۂ زماں میں مطالعہ کرنا ہو تو اس کی ساخت ہی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اس طرح کے مطالعہ کو انگریزی میں (Descriptive Linguistics) کہتے ہیں۔اردو میں اس کے لیے توضیحی لسانیات کی اصطلاح رائج ہے۔بعض علما نے اسے تجزیاتی لسانیات بھی کہا ہے۔توضیحی لسانیات کے پانچ بڑے احاطہ کار ہیں (1) صوتیات، (2) فونیمیات، (3) مارفیمیات، (4) نحو، (5) معنیات۔اس بلاک میں مذکورہ بالا پانچ شاخوں کی تعریف اور ہر شاخ کے دائرہ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں فونیمیات، صرف اور نحو کو مرکزی شاخیں قرار دیا جاتا ہے اور صوتیات اور معنیات کو ضمنی۔توضیحی لسانیات کے ماہرین ان دونوں کو غیر اہم قرار دیتے ہیں۔اس بلاک میں پانچ اکائیاں ہیں۔ذیل میں ان اکائیوں کے نام درج ہیں:

اکائی 3 : صوتیات

اکائی 4 : فونیمیات

اکائی 5 : صرف

اکائی 6 : نحو

اکائی 7 : معنیات

اکائی 3 صوتیات

ساخت

3.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کولسانیات کی ایک اہم شاخ ''صوتیات'' (Phonetics) سے واقف کرانا ہے۔اس اکائی کومکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- صوتیات اور صوتیات کی اصطلاحوں کی تعریف کرسکیں اور اصطلاحوں کے فرق کو سمجھ سکیں اور
- اعضائے تکلم (Organs of Speech) کی مدد سے آوازوں کی ادائیگی کی تفصیلات بیان کرسکیں۔

3.1 تمہید

ممکن ہے کہ آپ صوتیات اور اس کی اصطلاحوں سے واقف نہ ہوں لیکن دوران گفتگو آپ یقینی طور پر آوازوں کی ادائیگی کرتے ہوں گے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ان آوازوں کی ادائیگی میں آپ کے جسم کے کون سے اعضا معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں یا پھران آوازوں کی درجہ بندی کس طور پر کی جاتی ہے۔ شاید آپ نے اس کی ضرورت نہ سمجھے ہو اور ان کی

تفصیلات پر کبھی غور نہ کیا ہو۔لیکن زبان کے مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ آپ صوتیات اور اس سے جڑی دوسری اصطلاحوں سے بخوبی واقف ہوں۔ کیوں کہ زبان کا آوازوں سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کو بہ خوبی سمجھنے کے لیے اس کے صوتی نظام کو سمجھنا نہایت ضروری ہے اور یہ صوتیات (Phonetics) سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔

3.2 صوتیات کی تعریف اور اس کی شاخیں

صوتیات انسانی آوازوں کا سائنسی مطالعہ ہے۔ صوتیات کی اس تعریف میں ''انسانی آواز'' (Speech Sound) اور ''سائنسی مطالعہ'' کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسانی آواز سے ہماری مراد وہ تمام آوازیں ہیں جو الفاظ کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہ آوازیں کسی زبان خاص کی نہیں ہوتیں بلکہ دنیا کی کسی بھی زبان کی ہوسکتی ہیں۔ منہ سے نکلی تمام آوازیں انسانی آوازوں میں شمار نہیں کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہنسی یا کھانسی کی آواز انسانی آواز نہیں ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لیے کہا جاسکتا کہ ہنسی یا کھانسی یا اس قسم کی کوئی دوسری آواز اس زمرے میں شامل نہیں ہوتیں۔ بہرکیف اس تعریف کا دوسرا کلیدی لفظ ''سائنسی مطالعہ'' ہے۔ یہ اصطلاح صوتیات کے معروضی مطالعے کی نشان دہی کرتی ہے جس میں آوازوں کی ادائیگی اور ان کی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی اس مطالعے میں ماہر صوتیات کی ذاتی دلچسپی شامل نہیں ہوتی اور وہ سائنسی اصولوں کی بنیاد پر آوازوں کی ادائیگی کی تفصیلات، خصوصیات اور درجہ بندی پیش کرتا ہے۔ اس مطالعے میں ماہر صوتیات کی ذاتی دلچسپی کا شامل نہ ہونا مطالعے کو معروضی بناتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ علم صوتیات، علم اصوات (فونیمیات) سے مختلف ہوتا ہے۔ کیوں کہ علم اصوات یا فونیمیات (Phonology) میں کسی مخصوص زبان کے صوتی نظام کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس صوتیات میں آوازوں کا عام مطالعہ پیش کیا جاتا ہے گویا دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوتیات کا تعلق دنیا کی تمام زبانوں سے ہے اور یہ علم آوازوں کے مطالعے کا بنیادی خاکہ پیش کرتا ہے۔

صوتیات کی مدد سے ہم آوازوں کی ادائیگی، آوازوں کے Transmission اور آوازوں کے Perception کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر صوتیات کی تین شاخوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

1۔ تلفظی صوتیات Articulatory Phonetics

2۔ سمعی صوتیات Acoustic Phonetics

3۔ سمعیاتی صوتیات Auditory Phonetics

3.3 تلفظی صوتیات: اعضائے تکلم اور طریقۂ تکلم

صوتیات کی اس شاخ میں انسانی آوازوں (Speech Sound) کی ادائیگی کے عمل کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے انسان کے اعضائے تکلم (Organs of Speech) کو بخوبی سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام انسانی اعضا آوازوں کی ادائیگی میں معاون ثابت نہیں ہوتے۔ یہاں اعضائے تکلم سے مراد وہ اعضا ہیں جن کا تعلق

آوازوں کی ادائیگی سے ہے۔ان اعضائے تکلم کی ایک تصویر اور ایک فہرست آپ کی آسانی کے لیے نیچے دی جارہی ہے۔
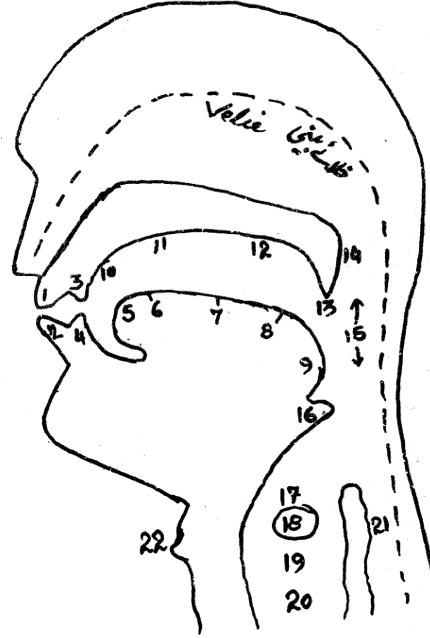
اعضائے تکلم (The Organs of Speech)

1۔ ہونٹ — Lips

2۔ اوپری دانت — Upper Teeth

3۔ نوک زبان — Tip of the Tongue

4۔ زبان کا پھل — Blade of the Tongue

5۔ وسط زبان — Front of the Tongue

6۔ زبان کا پچھلا حصہ — Back of the Tongue

7۔ زبان کی جڑ — Root of the Tongue

8۔ اوپری مسوڑھا — Alveolar Ridge

9۔ سخت تالو — Hard Palate

10۔ نرم تالو یا غشا — Soft Palate (Velum)

11۔ لہات — Uvula

12۔ حلق Pharynx

13۔ حلقی ڈھکن Epiglottis

14۔ سانس کی نلی Trachea

15۔ حنجرہ Larynx

16۔ صوت تانت Vocal Cords

17۔ صوت تانت کا دہانہ Glottis

18۔ خلائے انفی Nasal Cavity

19۔ پھیپھڑے Lungs

آوازوں کی ادائیگی میں ان اعضائے تکلم کے رول کو بخوبی سمجھنے کے لیے انھیں مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (1) تلفظ کار اور (2) نقطۂ تلفظ۔

اعضائے تکلم کی یہ درجہ بندی (Classification)، اعضائے تکلم کی حرکت (Mobility) کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ وہ اعضائے تکلم جو حرکی (Mobile) ہیں انھیں تلفظ کار (Articulator) کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اعضائے تکلم جو اپنی جگہ سے حرکت کر سکتے ہیں انھیں تلفظ کار کہا جاتا ہے۔

دوسری جانب غیر حرکی (Immobile) اعضائے تکلم کو نقطۂ تلفظ (Point of Articulation) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ اعضائے تکلم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر پاتے ہیں اور ان اعضائے تکلم کے قریب آ کر تلفظ کار آوازوں کی ادائیگی کرتا ہے۔

(1) تلفظ کار (Articulators)

اعضائے تکلم جن میں حرکت ہوتی ہے تلفظ کار کہلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (1) زبان اور (2) نچلے ہونٹ کو تلفظ کار کا درجہ دیا جاتا ہے۔

زبان (Tongue)

اعضائے تکلم میں زبان کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ زبان کی حرکت ہے۔ تمام اعضائے تکلم میں زبان سب سے زیادہ متحرک (Mobile) اور لچیلا (Flexible) عضوِ تکلم ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ زبان کی اسی خصوصیت کی بنیاد پر اسے چار خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

i۔ زبان کی نوک Tip of the Tongue

ii۔ زبان کا پھل Blade of the Tongue

iii۔ زبان کا پچھلا حصہ Back of the Tongue

iv۔زبان کی جڑ Root of the Tongue

v۔نچلا ہونٹ

(i)زبان کی نوک

زبان کے یہ تمام حصے آوازوں کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ان تمام حصوں میں زبان کی نوک اپنی ساخت کے اعتبار سے زبان کا سب سے زیادہ لچیلا حصہ ہے۔اپنے لچیلے پن کی وجہ سے زبان کا یہ حصہ اوپری ہونٹ سے سخت تالو تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔اس طرح آوازوں کی ادائیگی میں یہ اوپری دانت، مسوڑھا اور سخت تالو تک پہنچ کر ہوا میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور آوازوں کی ادائیگی کا سبب بنتا ہے۔زبان کی نوک (Tip of the Tongue) اور اوپری دانت کی (Upper Teeth) کی مدد سے ادا کی گئی آوازیں 'دنتی' (Dental) کہلاتی ہیں۔لہذا یہ بات یاد رکھیے کہ ''ت''، ''تھ''، ''د'' اور ''دھ'' دنتی (Dental) آوازیں ہیں۔کیوں کہ ان کی ادائیگی میں زبان کی نوک دانتوں کے قریب جا کر ہوا میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔

ایسی آوازیں جن کی ادائیگی میں زبان کی نوک مسوڑھے کے قریب جا کر ہوا میں رکاوٹ ڈالتی ہے Alveolar یا لثائی کہلاتی ہیں۔اردو میں ''س''، ''ز'' اور ''ن'' Alveolar آوازیں ہیں۔اسی طرح وہ آوازیں جن کی ادائیگی میں زبان کی نوک سخت تالو تک جا کر ہوا میں رکاوٹ ڈالتی ہے ''معکوسی'' آوازیں (Retroflex) کہلاتی ہیں۔ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ اردو کی معکوسی آوازیں ہیں۔

(ii)زبان کا پھل

''زبان کا پھل'' مقابلتاً کم لچیلا تلفظ کار ہے۔یہی وجہ ہے کہ ''زبان کا پھل'' صرف ایک مقام تلفظ پر آوازوں کی ادائیگی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔''زبان کے پھل'' اور تالو کی مدد سے ادا کردہ آواز کو تالوئی (Palatal) آواز کہتے ہیں۔یہ بات آپ یاد رکھیں کہ ''چ''، ''چھ''، ''ج'' اور ''جھ'' تالوئی آوازیں ہیں کیوں کہ ان کی ادائیگی میں ''زبان کا پھل''، ''تالو'' کے قریب جا کر باہر آتی ہوا میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے اور اس طرح ان آوازوں کی ادائیگی ہوتی ہے۔

(iii)زبان کا پچھلا حصہ

''زبان کا پچھلا حصہ'' ایک دوسرا اہم تلفظ کار ہے۔اردو آوازوں کی ادائیگی میں یہ دو مختلف ''مقام تلفظ'' پر جا کر آوازوں کی ادائیگی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔اردو آواز ''ک''، ''کھ''، ''گ'' اور ''گھ'' کی ادائیگی میں زبان کا پچھلا حصہ ''نرم تالو'' (Velum) کے قریب جا کر باہر آتی ہوا میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور ان آوازوں کی ادائیگی کا سبب بنتا ہے۔دوسری جانب اردو آواز ''ق'' کی ادائیگی زبان کا پچھلا حصہ 'کوّا' یا 'لہات' (Uvula) کے قریب جا کر باہر آتی ہوا میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور اس طرح اس آواز کی ادائیگی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس آواز کو لہاتی کہتے ہیں۔اس طرح آپ نے دیکھا کہ ''زبان کا پچھلا حصہ'' بہ طور ''تلفظ کار'' دو مختلف ''مقام تلفظ'' کی مدد سے آوازوں کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

(iv)زبان کی جڑ(Roof of Tongue)

زبان کی جڑ(Root)نوک زبان سے اندر کی طرف تقریباً تین انچ کے فاصلے پر ہوتی ہے۔ یہ زبان کا وہ حصہ ہے جو حلق کی اگلی دیوار کی طرح ہوتا ہے۔ زبان کی نوک، پھل، اگلے، درمیانی اور پچھلے حصے کی طرح زبان کی جڑ بھی تلفظ کار (Articulator)ہوتی ہے۔ یعنی آواز کی ادائیگی کے وقت اپنی جگہ سے حرکت کرتی ہے۔ زبان کی جڑ آگے طرف تھوڑا سا اٹھ کر جب کوّے(uvula)کے ربط میں آتی ہے تو لہاتی (uvular)مصمتے/ق/کا تلفظ ادا ہوتا ہے۔ اسی طرح حلق کے اندر زبان کی جڑ اور کوّے میں رابطہ قائم ہوکر حلقی مصمتے/ہ/کی ادائیگی عمل میں آتی ہے۔

(v)نچلا ہونٹ

جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا ''نچلا ہونٹ'' بھی ایک تلفظ کار ہے کیوں کہ آوازوں کی ادائیگی میں یہ نمایاں رول انجام دیتا ہے اور دیگر اعضائے تکلم کے مقابلے میں یہ ''نچلا ہونٹ'' ''متحرک'' ہے۔ نچلے ہونٹ میں حرکت کی وجہ سے اسے تلفظ کار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اپنی اس خصوصیت کے سبب نچلا ہونٹ دو ''مقام تلفظ'' ''اوپری ہونٹ'' اور ''اوپری دانت'' کے قریب جاکر آوازوں کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ ''پ''، ''پھ''، ''ب'' اور ''بھ'' کی ادائیگی میں نچلا ہونٹ اوپری ہونٹ کے قریب جاکر باہر آتی ہوا میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آوازوں کو ''دولبی'' آوازیں کہتے ہیں۔ ان آوازوں کے علاوہ نچلا ہونٹ اوپری دانت کے قریب جاکر بھی رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اردو میں ''ف'' اور ''و'' کی ادائیگی میں ''نچلا ہونٹ'' اوپری دانت کے قریب جاکر رکاوٹ کا سبب بنتا ہے جس کی وجہ سے ان آوازوں کو ''لب دنتی'' آوازیں کہتے ہیں۔

(2)نقطۂ تلفظ

آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی ہم نے آوازوں کی ادائیگی میں ''تلفظ کار'' کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ''تلفظ کار'' جن مقامات پر جاکر ہوا میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور آوازوں کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں ان ''مقامات'' کو ''مقام تلفظ'' کہا جاتا ہے۔ اردو آوازوں کی ادائیگی جن مقامات سے ہوتی ہے اس کا ایک تفصیلی جائزہ نیچے پیش کیا جارہا ہے۔

	تلفظ کار	+	مقام تلفظ	=	آواز
(i)	نچلا ہونٹ	+	اوپری ہونٹ	=	دولبی(پ۔ب)
(ii)	نچلا ہونٹ	+	اوپری دانت	=	لب دنتی(ف۔و)
(iii)	زبان کی نوک	+	اوپری دانت	=	دنتی(ت۔د)
(iv)	زبان کی نوک	+	اوپری مسوڑھا	=	لثائی(ن۔س۔ر)
(v)	زبان کی نوک	+	سخت تالو	=	معکوسی(ٹ۔ڈ)
(vi)	زبان کا پھل	+	سخت تالو	=	تالوئی(چ۔ج)
(vii)	زبان کا پچھلا حصہ	+	نرم تالو	=	غشائی(ک۔گ)
(viii)	زبان کا پچھلا حصہ	+	کوا یا لہات	=	لہاتی(ق)
(ix)	صوت تانت	+	صوت تانت	=	حلقی(ہ۔ح)

ان تفصیلات سے اردو آوازوں کی ادائیگی میں مستعمل ''تلفظ کار'' اور ''مقام تلفظ'' کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ آپ نے اردو آوازوں کی ادائیگی میں مستعمل ''تلفظ کار'' اور ''مقام تلفظ'' کی اہمیت کو بخوبی سمجھ لیا ہوگا۔

3.3.1 آوازوں کی قسمیں: مصوتے اور مصمتے

انسانی آوازیں عام طور سے دو خانوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ (1) مصوتے اور (2) مصمتے۔

3.3.2 مصوتے

وہ آوازیں جن کی ادائیگی میں منہ (Oral Cavity) کے اندر کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی مصوتے کہلاتی ہیں۔ ان آوازوں کی ادائیگی کے وقت باہر آتی ہوا میں صوت تانت (Vocal Folds) کے قریب کچھ اس طرح رکاوٹ ڈالی جاتی ہے کہ صوت تانت (Vocal Folds) مرتعش ہو جاتے ہیں۔ صوت تانت میں اس ارتعاش کی وجہ سے ایک گونج کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور مصوتے مسموع (Voiced) ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ یہ بات یاد رکھیں کہ مصوتے عام طور سے مسموع (Voiced) ہوتے ہیں اور ان کی ادائیگی میں صوت تانت کا مرتعش ہونا نمایاں رول انجام دیتا ہے۔ اردو میں ''آ''، ''اے''، ''ای''، ''اؤ'' اور ''او'' مصوتے ہیں۔ یوں تو مصوتوں کا تلفظ صوت تانت ہوتا ہے لیکن منہ (Oral Cavity) انھیں ایک مخصوص شکل دینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یعنی منہ کے اندر ان مصوتوں کو ایک خاص شکل دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصوتوں کی درجہ بندی کے وقت مندرجہ ذیل باتوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

(الف) زبان کا حصہ

(ب) زبان کی اونچائی

(ج) ہونٹوں کی گولائی

(د) طول یا مدت

(الف) زبان کا حصہ

مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کے تین مختلف حصوں (i) زبان کا اگلا حصہ، (ii) زبان کا درمیانی حصہ اور (iii) زبان کا پچھلا حصہ میں سے کوئی ایک حصہ مصوتوں کو مخصوص شکل دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کچھ مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کا اگلا حصہ انھیں ایک مخصوص شکل دیتا ہے اسی وجہ سے ان مصوتوں کو ''اگلا مصوتہ'' کہتے ہیں۔ اردو میں ''ای''، ''اِی''، ''اے''، ''اَے'' اگلا مصوتہ ہیں۔ اس طرح ''ا'' درمیانی مصوتہ کہلاتا ہے کیوں کہ اسی کی ادائیگی میں زبان کا درمیانی حصہ اسے ایک مخصوص شکل دینے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اُو، او، اَو اور آ کو عام طور سے ''پچھلا مصوتہ'' کہا جاتا ہے کیوں کہ ان مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کا پچھلا حصہ انھیں ایک مخصوص شکل دیتا ہے۔

(ب) زبان کی اونچائی

مصوتوں کی درجہ بندی میں اگر ایک جانب ''زبان کے حصے'' کی مدد لی جاتی ہے تو دوسری جانب ''زبان کی اونچائی'' کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ مصوتوں کی ادائیگی کے وقت مصوتوں کو ایک مخصوص شکل دینے کی خاطر زبان کا کوئی مخصوص حصہ اوپر یا نیچے کی جانب حرکت کرتا ہے اور مصوتوں کو ایک مخصوص شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ زبان کی حرکت کو ذہن میں رکھ کر مصوتوں کو (i) بالائی، (ii) وسطی اور (iii) نچلے مصوتوں کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بالائی مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کا کوئی ایک مخصوص حصہ اوپر کی جانب اٹھتا ہے۔ مثلاً ای اور اوٗ مصوتوں کو دیکھیے۔ ان مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کا کوئی ایک حصہ اوپر کی جانب اٹھتا ہے جس کی وجہ سے ان مصوتوں کو 'بالائی مصوتہ' کہا جاتا ہے لہٰذا ''ای'' کو اگلا بالائی مصوتہ کہتے ہیں کیوں کہ اس کی ادائیگی میں زبان کا اگلا حصہ اوپر کی جانب اٹھتا ہے جب کہ ''اوٗ' کے تلفظ میں زبان کا پچھلا حصہ اوپر کی جانب اٹھتا ہے اس لیے اس مصوتے کو پچھلا بالائی مصوتہ کہتے ہیں۔

اسی طرح بعض مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کا کوئی حصہ ایک مخصوص درمیانی سطح پر رہتا ہے جس کی وجہ سے ان مصوتوں کو وسطی مصوتے کہتے ہیں۔ اردو میں 'اے' اور ''او' وسطی مصوتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی ادائیگی میں زبان درمیانی سطح پر رہتی ہے۔

وہ مصوتے جن کی ادائیگی میں زبان کا کوئی مخصوص حصہ نیچے کی جانب جھک جاتا ہے تو اسے نچلا مصوتہ کہتے ہیں۔ اردو زبان میں ''آ'' نچلا مصوتہ ہے کیوں کہ اس کے تلفظ میں زبان کا پچھلا حصہ نیچے کی جانب جھک جاتا ہے لہٰذا اسے ''پچھلا نچلا مصوتہ'' کہتے ہیں۔

(ج) ہونٹوں کی گولائی

بعض مصوتوں کی ادائیگی میں ہونٹ گول ہو جاتے ہیں ان مصوتوں کو 'مدور'' مصوتہ کہتے ہیں۔ آپ یہ یاد رکھیے کہ عام طور سے ''پچھلے مصوتے'' (جن کی ادائیگی میں زبان کا پچھلا حصہ متحرک ہوتا ہے) مدور ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پچھلے مصوتے ''اوٗ''، ''او''، ''اوَ'' اور ''اُ'' کو دیکھیے۔ ان مصوتوں کے تلفظ میں ہونٹ گول ہو جاتا ہے لہٰذا انھیں مدور مصوتہ کہا جاتا ہے۔ پچھلے مصوتوں میں صرف ''آ'' ایک غیر مدور مصوتہ ہے کیوں کہ اس کی ادائیگی میں ہونٹ ''گول'' نہیں ہوتے۔

(د) طول یا مدت

مصوتوں کی درجہ بندی میں ''طول'' کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے اور اس کی بنیاد پر مصوتوں کو 'طویل' اور ''خفیف'' کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اردو میں مصوتوں کی کل تعداد دس (10) ہے جن میں سات طویل مصوتے جب کہ تین ''خفیف'' مصوتے ہیں۔ اردو میں ''زیر''، ''زبر'' اور ''پیش'' سے ظاہر ہونے والے مصوتے ''اَ''، ''اِ'' اور ''اُ'' خفیف مصوتے ہیں جب کہ حروف ''ی''، ''ے''، ''و'' اور ''الف'' سے ظاہر ہونے والے مصوتے ''آ''، ''ای''، ''اے''، ''ائے''، ''اوٗ''، ''او'' اور ''اوَ'' طویل مصوتے ہیں۔ اردو میں طویل مصوتوں کی کل تعداد سات ہے۔ ان بنیادوں پر مصوتوں کو مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
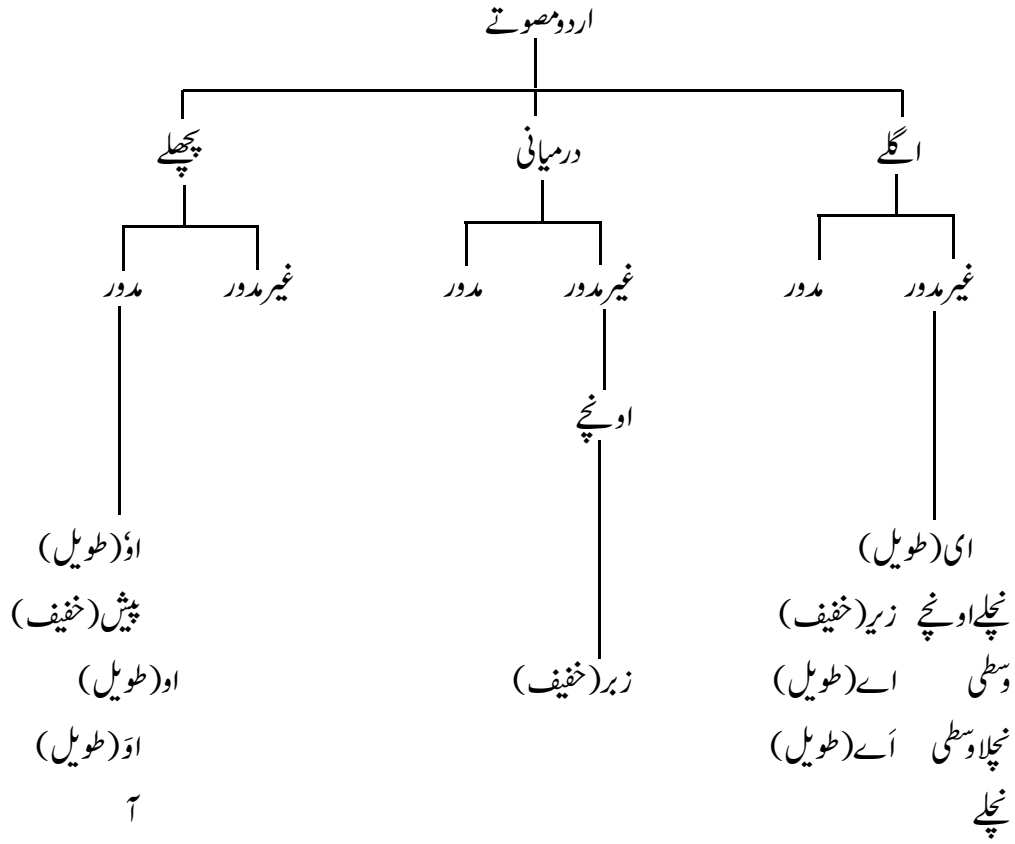
3.3.3 مصمتے

وہ آوازیں جن کی ادائیگی میں باہر آتی ہوا میں منہ (Oral Cavity) کے اندر رکاوٹ ڈالی جاتی ہو ''مصمتے'' کہلاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''پ'' کو دیکھیے۔ اس آواز کی ادائیگی میں باہر آتی ہوا کو دونوں ہونٹوں کے درمیان روکا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اسے مصمتہ کہا جاتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ''آ'' کی ادیئگی میں منہ کھلا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ''آ'' ایک مصوتہ ہے۔

مصمتوں کی درجہ بندی میں چار بنیادی باتوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

(i) مقام تلفظ

(ii) طریقۂ تلفظ

(iii) مسموع/غیر مسموع

(iv) ہکاریت

(i) مقام تلفظ

جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہ مقامات جہاں ''تلفظ کار'' باہر آتی ہوا میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے ''مقام تلفظ'' کہلاتے ہیں۔ مقام تلفظ پر ''مصمتوں کی ادائیگی میں باہر آتی ہوا میں منہ کے اندر رکاوٹ ڈالی جاتی ہے لہذا مقام تلفظ اس جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں یہ رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ اردو مصمتوں کی ادائیگی میں نو (9) مختلف مقامات پر یہ رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ اس کا ایک تفصیلی جائزہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

(ii) طریقۂ تلفظ

طریقۂ تلفظ کی اصطلاح ''رکاوٹ'' کے اس انداز کی نشان دہی کرتی ہے جس کی بنا پر آوازوں کی ادائیگی ہوتی ہے۔ آوازوں کے طریقہ ادائیگی کو عام طور سے مندرجہ ذیل سات قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(i) بندشی طریقۂ تلفظ (Stop)

(i) بندشی (Stop): بندشی طریقۂ تلفظ وہ طریقۂ تلفظ ہے جس میں باہر آتی ہوئی ہوا کو کسی ''مقام تلفظ'' پر لمحے بھر کے لیے روکا جاتا ہے۔ باہر آتی ہوئی ہوا کو روکنے کا عمل تلفظ کردہ آواز کو ''بندشی آواز'' بناتا ہے۔ اردو زبان میں بندشی آوازوں کی کل تعداد اکیس ہے۔ یہ ''بندشیے'' متعدد مقامات سے ادا ہو سکتے ہیں۔ اردو میں ''پ''، ''پھ''، ''ب''، ''بھ''، ''ت''، ''تھ''، ''د''، ''دھ''، ''ٹ''، ''ٹھ''، ''ڈ''، ''ڈھ''، ''چ''، ''چھ''، ''ج''، ''جھ''، ''ک''، ''کھ''، ''گ''، ''گھ'' اور ''ق'' کا شمار بندشی آوازوں میں ہوتا ہے کیوں کہ ان تمام آوازوں کی ادائیگی میں باہر آتی ہوئی ہوا کو متعدد مقامات پر روکا جاتا ہے۔

(ii) انفی طریقۂ تلفظ (Nasal)

اب دیکھیے ''انفی'' طریقۂ تلفظ کو انفی مصمتوں کی ادائیگی میں نرم تالو کے نیچے آجانے کی وجہ سے منہ کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور ہوا ناک کے راستے باہر گزرتی ہے۔ انفی مصمتوں کے تلفظ میں ''تلفظ کار'' منہ میں مقام تلفظ کے پاس جا کر رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ''م'' میں آواز کی ادائیگی میں دونوں ہونٹ آپس میں ملتے ہیں لہذا اسے ''دولبی انفی مصمتہ'' کہتے ہیں۔ جب کہ دوسری جانب ''ن'' کی ادائیگی میں ''زبان کی نوک'' مسوڑھے کے قریب جاتی ہے اور رکاوٹ کا سبب بنتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو کے اس ''انفی مصمتے'' کو ''لثائی انفی مصمتہ'' کہتے ہیں۔ اردو میں انفی مصمتوں کی کل تعداد دو ہے لیکن بعض اوقات ''نگ'' کو بھی انفی مصمتہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

(iii) صفیری طریقۂ تلفظ (Fricative)

اس طریقۂ تلفظ میں ''تلفظ کار'' ''مقام تلفظ'' کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ دہانہ تنگ ہو جاتا ہے اور سانس کی ہوا اس تنگ راستے سے رگڑ کھاتی ہوئی گزرتی ہے۔ اس طرح تلفظ کردہ آواز کو صفیری آواز کہتے ہیں۔ اردو میں صفیری آوازوں کی کل تعداد نو ہے۔

''ف''، ''و''، ''س''، ''ز''، ''ش''، ''ژ''، ''خ''، ''غ'' اور ''ہ'' کو صفیری مصمتے کہتے ہیں کیوں کہ ان مصمتوں کی ادائیگی میں سانس کی ہوا مقام تلفظ سے رگڑ کھاتی ہوئی گزرتی ہے۔

(iv) پہلوئی طریقۂ تلفظ (Lateral)

اگر کسی مصمتے کی ادائیگی میں زبان کی نوک کو اوپری مسوڑھے سے لگا کر ہوا نکالی جائے تو اسے پہلوئی مصمتہ کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصمتہ ''ل'' کی ادائیگی پر آپ محسوس کریں گے کہ ''ل'' کی ادائیگی میں سانس کی ہوا زبان کے دونوں جانب سے خارج ہوتی ہے۔ پہلوئی مصمتہ عام طور سے مسموع ہوتا ہے۔

(v) ارتعاشی طریقۂ تلفظ (Trill)

ارتعاشی طریقۂ تلفظ میں زبان کی نوک مسوڑھے کے قریب آ کر کپکپاتی ہے۔ اسی ارتعاش یا کپکپاہٹ کی وجہ سے ان مصمتوں کو ارتعاشی مصمتہ کہتے ہیں۔ اردو میں ''ر'' ارتعاشی مصمتہ ہے۔ ارتعاشی مصمتہ عام طور سے مسموع ہوتا ہے۔

(vi) تھپک دار (Flap)

اگر کسی مصمتے کی ادائیگی میں ''تلفظ کار'' مقام تلفظ پر ''دستک'' سی دے کر ہٹ جائے تو اس مصمتے کو تھپک دار مصمتہ کہتے ہیں۔ یہ مصمتے عام طور سے مسموع (Voiced) ہوتے ہیں۔

(vii) نیم مصمتہ (Semi Vowel)

اگر کسی مصمتے کی ادائیگی میں تلفظ کار مقام تلفظ تک اس طرح جائے کہ باہر آتی ہوئی ہوا میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پڑے تو اس میں ''مصوتے'' جیسی کچھ خصوصیات شامل ہو جاتی ہیں۔ یعنی اس مصمتے میں کچھ ایسی خوبیاں شامل ہو جاتی ہیں جن میں سے کچھ مصوتوں میں اور کچھ مصمتوں میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان آوازوں کو نیم مصوتہ کہتے ہیں۔ یہ مصمتے عام طور سے مسموع ہوتے ہیں۔ اردو میں ''ی'' اور ''و'' نیم مصمتہ ہیں۔

(iii) مسموع/غیر مسموع

اگر کسی آواز کی ادائیگی میں صوت تانت میں اگر ارتعاشی کیفیت پائی جاتی ہے تو وہ مصمتہ مسموع کہلاتا ہے۔ دوسری جانب وہ مصمتے جن کی ادائیگی میں صوت تانت میں کسی قسم کی کوئی حرکت یا ارتعاش کی کیفیت نہیں پائی جاتی غیر مسموع (Voiceless) کہلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصمتوں کی درجہ بندی میں صوت تانت کے ارتعاش کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اردو مصمتوں میں ایک بڑی تعداد ان مصمتوں کی ہے جو مسموع (Voiced) ہیں۔ اس طرح اردو کے بعض مصمتے غیر مسموع بھی ہوتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے چارٹ ملاحظہ کریں۔

(iv) ہکاریت

اگر کسی مصمتے کی ادائیگی میں منہ سے خارج ہوا کے جھونکے میں اضافہ کر دیا جائے تو اس مصمتے کو ''ہکاری'' مصمتہ کہتے

ہیں۔گویا''ہکاریت'' وہ طریقہ کار ہے جس میں منہ سے باہر آتی ہوا میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔اسی کی وجہ سے مصمتے کی شکل میں واضح تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔اس کی مزید وضاحت کے لیے''ب''اور''بھ'' کے فرق پر غور کیجیے۔''ب'' کے تلفظ میں ہوا کے جھونکے میں اضافہ نہیں کیا جاتا جب کہ''بھ'' کے تلفظ میں ہوا کے جھونکے میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ ہکاری آوازیں''مسموع''اور ''غیر مسموع'' دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔اردو میں ہکاریت کے اظہار کے لیے''ھ'' کا استعمال ہوتا ہے۔یعنی کسی بھی حرف سے جڑ کر''ھ'' اسے ہکار آواز بنا دیتا ہے۔مثال کے طور پر:

پ + ھ = پھ

ب + ھ = بھ

د + ھ = دھ

ٹ + ھ = ٹھ

ڑ + ھ = ڑھ

نیچے دیے گئے ٹیبل میں اردو کے مصمتوں کو پیش کیا گیا ہے۔

اردو مصمتے

	طریقہ تلفظ	مقام تلفظ	دولبی	لب دنتی	دنتی	لثائی	معکوسی	تالوئی	غشائی	لہاتی	حلقی
بندشی	غ م	غ ہ	پ		ت		ٹ	ج	ک	ق	
	غ م	ہ	پھ		تھ		ٹھ	جھ	کھ		
	م	غ ہ	ب		د		ڈ	ج	گ		
	م	ہ	بھ		دھ		ڈھ	جھ	گھ		
انفی	م	غ۔ہ	م			ن			نگ		
صفیری	غ۔م	غ۔ہ		ف		س		ش	خ		
	م	غ ہ		و		ز		ژ	غ		ہ
پہلوئی	م	غ۔ہ				ل					
لہردار	م	غ۔ہ				ر					
تھپکدار	م	غ ہ						ڑ			
		ہ						ڑھ			
نیم مصوتہ	م	غ ہ								ی	

م:مسموع غ م: غیر مسموع ہ:ہکاری غ ہ: غیر ہکاری

3.4 سمعی صوتیات (Acoustic Phonetics)

صوتیات کی دوسری اہم شاخ ''سمعی صوتیات'' ہے۔ Acoustic Phonetics یا سمعی صوتیات میں آوازوں کے Transmission کو موضوع مطالعہ بنایا جاتا ہے۔ گویا سمعی صوتیات Acoustic Phonetics میں یہ غور کیا جاتا ہے کہ ''آواز'' ہوا کے دوش پر کس طرح سفر کرتی ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت کے لیے یہ سمجھیے کہ آوازیں ''خلا'' (Vacuum) میں سفر نہیں کرتیں۔ انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جانے کے لیے ایک Medium کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام گفتگو کے دوران آوازیں ''ہوا'' کی مدد سے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچتی ہیں۔ ایسی صورت میں ہوا کو Medium کہا جاتا ہے۔ لیکن ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران ''تار'' اور ''برقی لہروں'' کی مدد سے آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ آوازیں لہروں کی شکل میں آگے بڑھتی ہیں۔ ان لہروں کی رفتار 1100 سے 1200 فی سکنڈ ہوتی ہے۔ اس رفتار کی ایک اکائی کو ''سائیکل'' کہتے ہیں۔ گویا ایک سائیکل میں آواز ایک نقطے سے ایک طرف حرکت کرتی ہے اور پھر مرکز کی طرف واپس آتی ہے۔ ایک سکنڈ میں آواز جتنی گردش کرتی ہے اسے سائیکل فی سکنڈ کہا جاتا ہے۔

3.5 سمعیاتی صوتیات (Auditory Phonetics)

سمعیاتی صوتیات، صوتیات کی وہ شاخ ہے جو آوازوں کے سمعی طریقہ کار کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں سمعیاتی صوتیات میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سننے کا عمل کیسے شروع ہوتا ہے اور آوازیں ہمارے ذہنوں پر کیا تاثر قائم کرتی ہیں۔ اگر تلفظی صوتیات بولنے کے عمل کا جائزہ پیش کرتی ہے تو سمعیاتی صوتیات سننے کے عمل کو موضوع بحث بناتی ہے۔

سننے کے عمل میں ''کان'' کا نمایاں رول ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمعیاتی صوتیات میں کان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (i) کان کا باہری حصہ، (ii) کان کا درمیانی حصہ، (iii) کان کا اندرونی حصہ۔

(i) کان کا باہری حصہ

کھلی آنکھوں سے نظر آنے والے کان کے باہری حصے سے لے کر کان کے پردے (Ear Drum) تک کے حصے کو کان کا باہری حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس حصے کا بنیادی کام آواز کی لہروں کو یکجا کر کے کان کے درمیانی حصے تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا اہم مقصد کان کے اندر کے حصے کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔

(ii) کان کا درمیانی حصہ

کان کے درمیانی حصے کی بناوٹ کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ کان کے پردوں تک آتی آواز کی خصوصیات کو یہ اور بہتر بنا دیتی ہے۔ اس مقصد کے تحت Tympanic Membrane میں ارتعاش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے آواز کی Quality اور بہتر ہو جاتی ہے۔

(iii) کان کا اندرونی حصہ

کان کا اندرونی حصہ آ وازوں کی لہر کو Hydraulic Pressure میں تبدیل کر دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آ وازوں کا Hydraulic Pressure اس طرح Basilan Membrane تک پہنچتا ہے جس میں سماعی قوت ہوتی ہے اور سننے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ سننے کا یہ عمل ہمارے ذہن کو متاثر کرتا ہے اور اس طرح ترسیل خیال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور ہم آ وازوں کے فرق سے ''پاپ'' اور ''باپ'' جیسے الفاظ کے درمیان فرق کر پاتے ہیں۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سمعیاتی صوتیات آ وازوں کے سننے کے عمل کو موضوع بحث بناتی ہے۔

3.6 خلاصہ

صوتیات انسانی آ وازوں کا سائنسی مطالعہ ہے۔ علم صوتیات، علم اصوات (فونیمیات) سے مختلف ہوتا ہے۔ کیوں کہ علم اصوات یا فونیمیات (Phonology) میں کسی مخصوص زبان کے صوتی نظام کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس صوتیات میں آ وازوں کا عام مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ صوتیات کی مدد سے ہم آ وازوں کی ادائیگی، آ وازوں کے Transmission اور آ وازوں کے Perception کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر صوتیات کی تین شاخوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

(i) تلفظی صوتیات Articulatory Phonetics

(ii) سمعی صوتیات Acoustic Phonetics

(iii) سمعیاتی صوتیات Auditory Phonetics

تلفظی صوتیات میں انسانی آ وازوں کی ادائیگی کے عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے انسان کے اعضائے تکلم کی کارکردگی کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ سمعی صوتیات میں آ وازوں کے Transmission کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ غور کیا جاتا ہے کہ آ واز ہوا کے دوش پر کس طرح سفر کرتی ہے۔ سمعیاتی صوتیات آ وازوں کے سمعی طریقۂ کار کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کی مدد سے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سننے کا عمل کیسے شروع ہوتا ہے اور آ وازیں ہمارے ذہنوں پر کیا تاثر قائم کرتی ہیں۔

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ صوتیات کو انسانی آ وازوں کا سائنسی مطالعہ کیوں کہا جاتا ہے؟

2۔ صوتیات کی کتنی شاخیں ہیں؟

3۔ مصوتے کسے کہتے ہیں؟ مثالوں کے ذریعہ واضح کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ صوتیات اور فونیمیات میں کیا فرق ہے؟

2۔ کیا صوتیات آوازوں کے مطالعے کا بنیادی خاکہ پیش کرتا ہے؟

3۔ مصمتے کسے کہتے ہیں؟ مثالوں کے ذریعہ واضح کیجیے۔

3.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔ عام لسانیات : گیان چند جین

2۔ اردو ساخت کے بنیادی عناصر : نصیر احمد خاں

3۔ لسانیات کے بنیادی اصول : اقتدار احمد خاں

اکائی 4 فونیمیات

ساخت

4.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں فونیمیات اوراس کی تکنیکوں سے واقف کرایا گیا ہے۔اس اکائی کومکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- فونیمیات کی تعریف کرسکیں
- فونیمیات میں استعمال ہونے والی مختلف اصطلاحات کی وضاحت کرسکیں
- فونیمیات کی تکنیکوں کواستعمال کرسکیں
- فونیمیات کے اصولوں وتکنیکوں کا استعمال کرتے ہوئے کسی زبان کے صوتیوں (phonemes) کی نشان دہی کرسکیں اور
- فونیمیات کی افادیت بیان کرسکیں۔

4.1 تمہید

اکائی 2 میں آپ نے ''لسانیات'' کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ نے جانا کہ ''جدید لسانیات'' علم کا وہ شعبہ ہے جو زبان کا سائنسی مطالعہ کرتا ہے۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ جدید لسانیاتی نظریہ نے ایسے اصول اور تکنیکیں مرتب کی ہیں جن کے ذریعے زبان کی جراحی کی جاسکتی ہے اور اس سے متعلق گوناگوں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

لسانیات کی وہ شاخ جو لسانیاتی نظریہ سے بحث کرتی ہے ''نظریاتی لسانیات (Theoretical Linguistics) کہلاتی ہے۔ نظریاتی لسانیات کے مطالعے کی پانچ سطحیں ہیں: صوتیات، فونیمیات، صرفیات، نحویات اور معنیات۔ آپ نے دیکھا کہ فونیمیات نظریاتی لسانیات کی دوسری سطح ہے۔ اس میں ان اصولوں اور تکنیکوں سے بحث ہوتی ہے جن کے اطلاق سے کسی زبان میں استعمال ہونے والی امتیازی اصوات یا ''صوتیوں'' کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ کسی زبان/ بولی کے لیے جس کا کوئی رسم الخط نہیں ہے، رسم الخط وضع کرنا ہو یا حروف تہجی ترتیب دینے ہوں تو اس زبان/ بولی پر فونیمیاتی اصولوں اور تکنیکوں کے ذریعے حاصل شدہ اس زبان/ بولی کے ''صوتیوں'' کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا اس اکائی میں فونیمیات، اس کے اصولوں و تکنیکوں کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

4.2 پس منظر۔صوتیات سے متعلق مختصراً چند باتیں

اکائی 3 میں آپ نے صوتیات کا مطالعہ کیا۔ آپ نے جانا کہ صوتیات میں تکلمی اصوات (Speech Sounds) کا مطالعہ ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ انسان اپنے اعضائے تکلم (Speech Organs) کے ذریعے ان گنت تکلمی اصوات ادا کرسکتا ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ صوتیات میں تکلمی اصوات کا مطالعہ تین نقطہ ہائے نظر سے کیا جاسکتا ہے۔ پہلا نقطہ نظر ''تکلمی صوت کی ادائیگی''، یعنی کوئی خاص تکلمی صوت کے نکالنے کے لیے کون سے اعضائے تکلم استعمال ہوتے ہیں؟ جیسے کہ لب، غشا وغیرہ۔ مذکورہ صوت مسموع ہے یا غیر مسموع؟ نیز یہ کہ یہ صوت ہکاری ہے یا غیر ہکاری وغیرہ۔ دوسرا نقطہ نظر تکلمی اصوات کی ترسیل (Transmission) ہے۔ یعنی کوئی خاص صوت صوتی لہر (Sound Wave) بن کر ہوا کے ذریعے کس طرح متکلم سے مخاطب تک منتقل ہوتی ہے۔ صوتیات کے مطالعے کا تیسرا نقطہ نظر تکلمی اصوات کی وصولیابی (Reception) ہے۔ یعنی انسانی کان کسی تکلمی صوت کو سماع کے ذریعے کیسے حاصل کرتے ہیں۔

آپ نے یہ بھی جانا کہ صوتیات میں تکلمی اصوات کے متعلق جو نتائج نکالے جاتے ہیں وہ تجربوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے مطالعے میں تجربہ گاہ اور اصوات کے مطالعے سے متعلق مختلف آلات کا استعمال کیا جاتا ہے۔

صوتیات میں تکلمی اصوات کا خواہ کسی نقطہ نظر سے مطالعہ ہو انتہا اس بات پر ہوتی ہے کہ ان تکلمی اصوات کا تجزیہ و توضیح (Description) کس طرح کیا جائے۔ یعنی اس میں ایسی تکنیکوں کی تلاش ہوتی ہے جن کے ذریعے ہم انسانی اعضائے تکلم سے ادا ہونے والی تمام اصوات کا صریحاً تجزیہ و توضیح کرسکیں۔

صوتیات میں تکلمی اصوات کا عمومی (General) مطالعہ ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف قطعی توجہ نہیں دی

جاتی کہ انسانی اعضائے تکلم سے ادا ہونے والی اصوات کا تعلق آیا کسی زبان سے ہے یا نہیں۔صوتیات کی بنیادی اکائی ''صوت'' (Phone) کہلاتی ہے۔اصوات صوتیات کا خام مواد (Raw Material) ہے اور انھیں تجربہ گاہ میں آلات کے ذریعے ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔

صوتیات میں اصوات کے تحریری اظہار کے لیے بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط میں جیسا کہ آپ نے پڑھا مصوتوں (Vowels) اور مصمتوں (Consonants) کے لیے الگ الگ حروف وضع کیے گئے ہیں۔مثلاً ''ای'' کے لیے ''i''، ''او'' کے لیے ''o''، ''ب'' کے لیے ''b''، ''ف'' کے لیے ''f'' وغیرہ۔

تکلم ایک پیچیدہ عمل ہے۔اس میں قطعاتی اصوات (Segmental Sounds) مثلاً مصوتوں اور مصمتوں کے علاوہ فوق قطع اصوات (Supra-segmental Sounds) مثلاً سُر (Pitch)، تاکید (Stress)، اتصال (Juncture) یا روایتاً رموز او قاف وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ نیز مصوتوں میں تخفیف وطوالت بھی ہوسکتی ہے۔تکلم کی ان تمام خصوصیات کو بیان کرنے کے لیے صوتیاتی رسم الخط میں مختلف علامات وآثار وضع کیے گئے ہیں۔

جب کسی تکلم یا تکلمی جز کو صوتیاتی رسم الخط میں مقید کیا جاتا ہے تو فوق قطع اصوات کو قطعاتی اصوات کے اوپر درج کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں ان تمام اصوات کو تفصیل سے ریکارڈ کیا جاتا ہے۔یعنی ہر صوت کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی دی جاتی ہے۔لہٰذا صوتیاتی تحریر (Phonetic Transcription) کو باریک تحریر (Narrow Transcription) کہا جاتا ہے۔مثال کے طور پر اردو کا جملہ ''کیا آپ نے سبق پڑھ لیا؟'' کو صوتیاتی تحریر کے ذریعے ذیل میں ظاہر کیا گیا ہے:

3 3 3 2 3 4

[°kya a:p ne sebeq perh liya #]

صوتیاتی تحریر میں اصوات یا اصوات کے گروہ کو ظاہر کرنے کے لیے چوکور بریکیٹ (Brackets Square) کا استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً [b]، [q]، [i] یا [kya a:p ne sebeq perh liya] وغیرہ۔

4.3 فونیمیات سے کیا مراد ہے؟

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ صوتیات میں جب کسی صوت یا اصوات کو تحریر میں ریکارڈ کیا جاتا ہے تو ہر صوت کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل دی جاتی ہے۔مختلف مواقع اور ماحول میں اس صوت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات کو سمونے کی کوشش کی جاتی ہے۔مثال کے طور پر اردو کے ان تین الفاظ پر غور کیجیے:

''مہر'' [mɛhɛr]، ''میل'' [me:l]، ''میلے'' [mele]

یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ''مہر'' [mɛhɛr] میں ''م'' اور ''ہ'' دونوں کے بعد جو مصوتہ ہے وہ صوتی اعتبار سے ''ے'' کی خفیف ترین شکل ہے۔یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تینوں الفاظ میں صوتی اعتبار سے ''ے'' کی خفیف ترین شکل ''مہر'' میں پائی جاتی ہے۔اس کے مقابلے میں ''میلے'' میں ''م'' اور ''ل'' کے بعد آنے والی ''ے'' کی صوتی شکل ''مہر'' کی ''ے'' کے مقابلے میں

قدرے طویل ہے۔مگر اتنی طویل نہیں ہے جتنی کہ ''میل'' والی ''ے'' میں ہے۔یہی بات مصمتوں کے تعلق سے یا تکلم کے دوسرے اجزا/خصوصیات کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔صوتی تحریر میں اس قسم کی ساری تفصیلات ریکارڈ کی جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ صوتی تحریر میں کفایت (Economy) اور وضاحت (Clarity) کا فقدان ہوتا ہے۔

درج بالا سطور میں آپ نے دیکھا کہ تکلم کے صوتیاتی مطالعے میں ہر صوت کی ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیل کو ملحوظ نظر رکھا جاتا ہے۔اس طرح کسی زبان کا صوتیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس زبان کے نہ جانے کتنے مصوتے برآمد ہوں گے اور نہ جانے کتنے مصمتے۔اگر ہم اس زبان کے لیے ایک مناسب ترین اور کفایتی رسم الخط وضع کرنا چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس زبان کے تحریری اظہار کے لیے صوتیاتی مطالعے سے برآمد سینکڑوں مصوتوں، سینکڑوں مصمتوں اور دیگر صوتیاتی اجزا کے لیے حروف وضع کیے جائیں؟ جی نہیں، یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔کوئی بھی زبان اپنے تحریری اظہار کے لیے گنی چنی اصوات، نتیجتاً گنے چنے حروف ہی رکھ سکتی ہے۔لاتعداد اصوات اور لاتعداد حروف برداشت نہیں کرسکتی۔اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے فونیمیات یا فونیمیاتی نظریہ معرض وجود میں آیا۔

فونیمیات کی منزل مقصود یہ ہوتی ہے کہ کوئی ایسی تسلی بخش تکنیک مرتب کی جائے جس سے کسی زبان میں استعمال ہونے والی اصوات کی امتیازی اکائیوں (Pertinent Units of Sounds) کی شناخت کی جائے اور ان اکائیوں کو زبان کے حروف تہجی/رسم الخط مرتب کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

دیگر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فونیمیات میں کسی زبان میں استعمال ہونے والی امتیازی اصوات کا تجزیہ ہوتا ہے۔اس شعبہ میں ہمیں اس بات سے غرض نہیں کہ زبان میں استعمال ہونے والی اصوات کی ادائیگی کس طرح ہوتی ہے؟ کسی صوت کو ادا کرنے کے لیے کیا دانت کی شمولیت ہورہی ہے؟ یا غشا کی حرکت سے کوئی صوت معرض وجود میں آرہی ہے؟ کسی صوت کی ادائیگی میں ہوا دہنی جوف سے خارج ہورہی ہے یا انفی جوف سے؟ وغیرہ وغیرہ۔بلکہ کسی زبان کے اصواتی نظام کی ساخت معلوم کرنا ہی اس شعبہ کا مقصد ہوتا ہے۔یعنی کسی زبان میں استعمال ہونے والی امتیازی اصوات (Phonemes) کی شناخت کرنا جن کی وجہ سے الفاظ کے معنی میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔مثال کے طور پر اردو کے ان دو الفاظ کو لیجیے۔کَمَر [kemer]:قَمَر [qemer] واضح رہے کہ پہلے لفظ کے معنی کمر (انسانی عضو) کے ہیں اور دوسرے کے معنی ''چاند'' کے ہیں۔یہ بھی واضح رہے کہ الفاظ کی اس جوڑی میں پہلی صوت کو چھوڑ کر باقی اصوات ایک جیسی ہیں۔اگر معنی میں تبدیلی واقع ہورہی ہے تو وہ محض اور محض پہلی صوت کے بدلنے سے ہورہی ہے۔یعنی ''k'' (ک) کی جگہ ''q'' (ق) لے لے یا صورت حال اس کے برعکس ہو تو معنی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ان اصوات کا فرق لفظ کے معنی پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس طرح کا فرق فونیمیاتی فرق (Phonemic Difference) کہلاتا ہے۔لہٰذا فونیمیاتی نظریہ کے مطابق ''k'' (ک) اور ''q'' (ق) دو مختلف امتیازی اصوات ہیں۔زبان میں استعمال ہونے والی امتیازی اصوات کو فونیمیاتی اصطلاح میں ''صوتیے'' (Phonemes) کہا جاتا ہے۔

جس طرح صوتیات میں تکلم کو تحریر میں مقید کرنے کے لیے صوتیاتی تحریر کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح فونیمیات میں فونیمیاتی تحریر کا استعمال ہوتا ہے۔درج بالا سطور میں آپ نے پڑھا کہ صوتیاتی تحریر میں تکلم کو ریکارڈ کرتے وقت اصوات کو تفصیل سے ریکارڈ کیا جاتا ہے۔مگر فونیمیاتی تحریر میں صرف امتیازی اصوات (دیگر الفاظ میں ''صوتیوں'') کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔اس میں ہم

یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی صوت اپنی اگلی یا پچھلی صوت سے کس طرح متاثر ہو رہی ہے یا کوئی مصوتہ کتنا طویل ہے یا کتنا خفیف۔ نہ ہر صوت کی خواہ مصوتہ یا مصمتہ یا سُر یا بل جیسی اصوات ہوں، ذیلی اشکال کی نمائندگی ہوتی ہے۔اس کے برعکس فونیمیاتی تحریر میں محض اور محض اصوات کی امتیازیت (Distinctiveness) کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔لہذا فونیمیاتی تحریر کو وسیع تحریر (Broad Transcription) بھی کہا جاتا ہے۔اس میں ہر فونیمیاتی اکائی کو ترچھی لکیروں / / میں لکھا جاتا ہے۔ چوں کہ فونیمیات میں امتیازی اصوات کا قیام اس بات کو ملحوظ رکھ کر کیا جاتا ہے کہ اصوات کا ردوبدل معنی کی تبدیلی پر کس طرح اثر انداز ہو رہا ہے لہذا فونیمیاتی تجزیہ کفایتی و وضاحتی ہوتا ہے۔

درج بالا سطور میں آیا ہے کہ صوتیات کی بنیادی اکائی صوت کہلاتی ہے۔اسی طرح فونیمیات کی بنیادی اکائی ''صوتیہ (Phoneme)'' کہلاتی ہے۔

مختلف زبانوں پر فونیمیاتی نظریہ کے اطلاق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک خاص صوت یا اصوات کا ایک خاص گروہ ان زبانوں میں یکساں کام نہیں کرتا۔ مثلاً انگریزی میں ہکاریت (Aspiration) ایک امتیازی خصوصیت (Relevant Feature) نہیں ہے۔مگر ہندوستانی زبانوں مثلاً اردو میں یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

فونیمیاتی مطالعے سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ صوتی نمونوں میں تخالفات کی تعداد اور قسموں کے لحاظ سے مختلف زبانیں ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔

4.4 فونیمیات کی اصطلاحات

مندرجہ ذیل سطور میں فونیمیات میں استعمال ہونے والی کچھ اہم اصطلاحات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی وضاحت بھی پیش کی گئی ہے۔

1۔ ذیلی اصوات (Allophones or Positional Variants)

زبان کے مختلف الفاظ میں مستعمل کسی بھی صوت کی ادائیگی میں موقع ومحل کے لحاظ سے تغیر وتبدل ہوتا ہے۔نتیجتاً مذکورہ صوت کا تلفظ مختلف الفاظ میں مختلف ہوتا ہے۔یعنی اس صوت کے اگلے اور پچھلے صوتی ماحول کی وجہ سے اس کی کئی اشکال رونما ہوتی ہیں۔صوت کی انھیں ذیلی اشکال کو ذیلی اصوات (Allophones or Positional Variants) کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ان تین اردو الفاظ کو لیجیے ''مور'' [mo:r]، ''گورا'' [gora] اور ''مہرا'' [mohra]۔ان تینوں میں صوت ''او'' موجود ہے۔(واضح رہے کہ یہاں تلفظ اہم ہے نہ کہ تحریر)۔ پہلے لفظ یعنی ''مور'' [mo:r] میں ''او'' قدرے طویل ہے۔صوتیاتی رسم الخط میں اس کو بہ طور [o:] تحریر کیا جاسکتا ہے۔دوسرے لفظ ''گورا'' [gora] میں ''او'' اتنا طویل نہیں ہے جتنا کہ ''مور'' میں ہے۔اس صوت کو بہ طور [o] لکھا جاسکتا ہے۔تیسرے لفظ ''مہرا'' میں ''ہ'' سے پہلے ''او'' کافی خفیف ہو جاتا ہے۔ اسے بہ طور [o] ظاہر کیا جاسکتا ہے۔حاصل کلام یہ ہے کہ متذکرہ تینوں الفاظ میں ''او'' تو موجود ہے مگر صوتی اعتبار سے تینوں میں ''او'' کی نوعیت الگ الگ ہے۔یعنی لفظ ''مور'' میں آنے والا ''او''، ''گورا'' اور ''مہرا'' کے ''او'' سے مختلف ہے۔اسی طرح لفظ

''گورا'' میں آنے والا ''او''، ''مور'' اور ''مہرا'' میں آنے والے ''او'' سے مختلف ہے اور لفظ ''مہرا'' میں آنے والا ''او'' ''مور'' اور ''گورا'' کے ''او'' کے مختلف ہے۔ گویا کہ تینوں الفاظ میں صوتی اعتبار سے تین مختلف قسم کا ''او'' پایا جاتا ہے۔ مگر یہ تینوں قسمیں /o/ کی مختلف اشکال یا روپ ہیں۔ /o/ کی ان تین صوتی اشکال کو /o/ کی ذیلی اصوات کہا جائے گا۔ درج ذیل خاکے میں ''او'' کی ان ذیلی اشکال کو واضح کیا گیا ہے:

ذیلی اصوات

[mo:r]	[o:]	
[gora]	[o]	/o/
[mohra]	[o]	

ذیلی اصوات کی وضاحت کے سلسلے میں ایک اور مثال۔ ان تین اردو الفاظ میں ''شان'' [Sa:n]، ''نشان'' [nlSa:n] اور ''نعش'' [na:S]۔ ان تینوں میں صوت ''ش'' [S] موجود ہے۔ پہلے الفاظ میں صوت ''ش'' شروع میں آئی ہے۔ دوسرے لفظ میں درمیان میں (''ن'' کے بعد) اور تیسرے میں آخر میں۔ درج بالا سطور میں آیا ہے کہ جب اصوات ایک دوسرے کے ساتھ آتی ہیں تو ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں کیا یہ ممکن ہے کہ درج بالا تینوں الفاظ میں آنے والی ''ش'' [S] صوت ادائیگی کے اعتبار سے ایک جیسی ہوگی؟ جی نہیں۔ ادائیگی کے اعتبار سے تینوں میں آنے والی ''ش'' [S] صوت الگ الگ ہے۔ یعنی ''شان'' [Sa:n] میں آنے والی ''ش'' [S] صوت لفظ کی شروعاتی صوت ہے اور مابعد مصوتے کے ساتھ ادا ہو رہی ہے۔ صوتیاتی نقطہ نظر سے یہ اخراجی کیفیت کی حامل ہے۔ لہذا یہ ''نشان'' اور ''نعش'' میں آنے والی ''ش'' [S] سے مختلف ہے۔ اس ''ش'' صوت کو بطور [S1] ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ''نشان'' [nlSa:n] میں آنے والی ''ش'' [S] صوت لفظ کے درمیان مصوتوں کے بین واقع ہو رہی ہے۔ اسے بین مصوتی کہا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ ''شان'' اور ''نعش'' میں آنے والی ''ش'' [S] سے مختلف ہے۔ اس ''ش'' صوت کو بطور [S2] ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ''نعش'' [na:S] میں آنے والی ''ش'' [S] صوت لفظ آخر میں واقع ہو رہی ہے۔ صوتیاتی نقطہ نظر سے یہ غیر اخراجی کیفیت کی حامل ہے۔ لہذا یہ ''شان'' اور ''نشان'' میں آنے والی ''ش'' [S] صوت سے مختلف ہے۔ اس ''ش'' [S] صوت کو بطور [S3] لکھا جا سکتا ہے۔ گویا کہ تینوں الفاظ میں تین مختلف قسم کی ''ش'' [S] صوت پائی جاتی ہے۔ یعنی [S1]، [S2] اور [S3]۔ مگر یہ تینوں قسمیں /S/ کی مختلف اشکال یا روپ ہیں۔ /S/ کی یہ تینوں اشکال /S/ کی ذیلی اصوات (Allophones or Positional Variants) کہلائیں گی۔ مندرجہ ذیل خاکے میں /S/ کی ان ذیلی اصوات کو واضح کیا گیا ہے:

ذیلی اصوات

[S1a:n]	[S1]	
[nlS2a:n]	[S2]	/S/ ''ش''
[na:S3]	[S3]	

2۔ صوتیہ (Phoneme)

صوتی اعتبار سے تقریباً ایک جیسی بہت ساری اصوات میں سے منتخب شدہ کسی ایک صوت کو ''صوتیہ'' (Phoneme) کہا جاتا ہے۔صوتیہ دراصل صوتی اعتبار سے تقریباً ایک جیسی اصوات کے حوالے کے سلسلے میں بطور حوالہ جاتی نقطہ کے کام کرتا ہے۔کسی صوتیے کا تعین فونیمیات کے اصولوں کے تحت خاص تجزیاتی طریقوں سے ہوتا ہے۔

صوتیے کی وضاحت کے لیے ہم انھیں تین الفاظ کو لیں گے جنھیں درج بالا سطور میں ذیلی اصوات (Allophones) کی وضاحت کرتے وقت لیا تھا۔یعنی ''مور'' [mo:r]، ''گورا'' [gora] اور ''مہرا'' [mohra]۔اس ضمن میں ہم نے کہا تھا کہ صوتی اعتبار سے ان تینوں الفاظ میں آنے والے ''او'' کی نوعیت الگ الگ ہے۔''مور'' میں آنے والے ''او'' کو صوتیاتی تحریر میں بہ طور [o:] واضح کیا جا سکتا ہے، ''گورا'' میں آنے والے ''او'' کو بطور [o] اور ''مہرا'' آنے والے ''او'' کو بطور [o] ظاہر کیا جا سکتا ہے۔یہ بھی کہا تھا کہ یہ تینوں ''او'' کی مختلف صوتی اشکال یا روپ ہیں۔''او'' کی ان تینوں اشکال میں سے کسی ایک شکل کو ہم چنیں گے۔فی الحال ہم نے ''o'' کو چن لیا اور کہا کہ ''o'' صوتیہ ہے۔اسے ہم ترچھی لکیروں میں بند کریں گے۔یعنی /o/۔اب /o/ کو ایک صوتیہ (phoneme) کہیں گے۔دیگر الفاظ میں /o/ ایک امتیازی صوت (phoneme) ہے اور درج بالا الفاظ کے فونیمیاتی تجزیے کی روشنی میں اس کی تین ذیلی اصوات (allophones or positional variants) ہیں۔مندرجہ ذیل خاکے میں صوتیہ /o/ اور اس کی ذیلی اصوات کے رشتے کو واضح کیا گیا ہے۔

ذیلی اصوات (allophones or positional variants)	صوتیہ (phoneme)
[o:]	
[o]	/o/
[o]	

صوتیے کے ضمن میں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ جب ہم کسی زبان کے اصوات سے بحث کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس زبان میں استعمال ہونے والے صوتیوں (Phonemes) سے بحث کر رہے ہیں۔یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر زبان میں صوتیے ایک دوسرے کے تخالف (Contrast) میں ہوتے ہیں۔مثلاً اردو میں صوتیے ''پ'' /p/ اور ''ب'' /b/، غیر مسموع اور مسموع کے پیمانے کی بنیاد پر ایک دوسرے کے تخالف میں ہیں۔لہٰذا ان دونوں کے (ایک دوسرے کے ساتھ) ادل بدل سے تخالف معنی خیز ہو جاتا ہے یعنی معنی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔مثلاً لفظ ''پَل'' /pel/ میں /p/ کو /b/ سے بدل دیا جائے تو جو لفظ برآمد ہوگا وہ ''بَل'' /bel/ ہوگا۔ظاہر ہے کہ اس میں معنی کی تبدیلی بھی واقع ہوئی ہے۔صوتیوں ''پ'' /p/، ''ب'' /b/ کا یہ تخالف الفاظ کے درمیان اور آخر میں بھی واقع ہوتا ہے۔مثلاً ''چپاتی'' /Cepati/ اور ''چباتی'' /Cebati/ اور ''آپ'' /a:p/ اور ''آب'' /a:b/ میں۔

زبان میں مستعمل مختلف صوتیوں کے تخالفات اور ان سے رونما ہونے والی معنوی تبدیلیوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے چارلس ایف ہوکٹ (C.F. Hockett) کہتے ہیں کہ ''صوتیہ وہ نہیں جس کے بارے میں بتایا جائے کہ وہ اس طریقے سے ادا

ہوتا ہے بلکہ وہ (زبان میں) تخالفات کے جال کا ایک نقطہ حوالہ ہے۔''

3۔ تکمیلی تقسیم (Complimentary Distribution)

صوتیاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتی جلتی اصوات کی الفاظ میں ایسی تقسیم جس میں کسی ایک مخصوص جگہ (position) پر ملتی جلتی اصوات کا کوئی مخصوص ممبر ہی آ سکتا ہے۔ یعنی یہ جگہ اول الذکر ممبر ہی کے لیے مخصوص و مختص ہے، کوئی دوسرا ممبر نہیں لے سکتا۔

وضاحت کے لیے ''ذیلی اصوات'' کے ضمن میں دی گئی مثالوں یعنی ''مور'' [mo:r]، ''گورا'' [gora] اور ''مہرا'' [mohra] کو لیجیے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں الفاظ میں ''اوٗ'' موجود ہے۔ مگر جیسا کہ آپ نے دیکھا پہلے لفظ میں ''اوٗ'' [o:] قدرے طویل ہے۔ دوسرے لفظ ''گورا'' [gora] میں ''اوٗ'' اتنا طویل نہیں جتنا کہ ''مور'' میں ہے۔ تیسرے لفظ ''مہرا'' [mohra] میں ''اوٗ'' کافی خفیف ہو جاتا ہے۔ کیا ''اوٗ'' کی ان تینوں قسموں کو ایک دوسرے کے ساتھ ادل بدل کیا جا سکتا ہے؟ جی نہیں، یہ ممکن نہیں کہ ''مور'' والے [o:] کو ''مہرا'' والے [o] سے بدل دیا جائے یا ''گورا'' والے [o] کو ''مور'' والے [o:] سے بدل دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ گویا کہ ''اوٗ'' کی تینوں قسموں کی جگہ اٹل ہے۔ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ ادل بدل نہیں ہو سکتا۔ ملتی جلتی اصوات کی اس طرح کی تقسیم کو تکمیلی تقسیم (complementary distribution) کہا جاتا ہے۔

ذیلی اصوات عموماً تکمیلی تقسیم (complementary distribution) میں واقع ہوتی ہیں۔

4۔ تخالفی اصوات (Contrasting Sounds)

ایسی اصوات جو کوئی (کم از کم) دو الفاظ میں ایک ہی پوزیشن (position) میں آ کر ایک دوسرے کے ساتھ تخالف پیش کرتی ہوں۔ مذکورہ الفاظ میں تخالفی اصوات کو چھوڑ کر باقی تمام اصوات یکساں ہوتی ہیں۔ مثلاً اردو کے ان الفاظ کو لیجیے۔ ''پاجی'' [paji] اور ''باجی'' [baji]۔ ان میں شروع کی پوزیشن میں [b:p] (پ:ب) والی اصوات ایک دوسرے کے تخالف میں واقع ہوئی ہیں۔ اس طرح کی اصوات کو جو ایک ہی پوزیشن میں آ کر ایک دوسرے کے ساتھ تخالف پیش کرتی ہوں ''تخالفی اصوات'' کہلاتی ہیں۔

ملاحظہ ہو کہ مندرجہ بالا الفاظ میں [b:p] (پ:ب) کو چھوڑ کر باقی ساری اصوات یکساں ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تخالفی اصوات الفاظ کی کسی بھی پوزیشن یعنی شروعات، درمیان یا آخر میں تخالف پیش کر سکتی ہیں۔ الفاظ کی مندرجہ ذیل جوڑی پر غور کیجیے۔ تاریک : تاریخ [tari:k : tari:x]۔ ان الفاظ میں آپ نے دیکھا کہ ''ک'' اور ''خ'' [k:x] والی اصوات لفظ کی آخری پوزیشن میں تخالف پیش کر رہی ہیں۔

5۔ مشتبہ جوڑا (Suspicious Pair)

فونیمیاتی تجزیے میں کوئی دو ایسی اصوات جو صوتیاتی اعتبار سے (Phonetically) قریب ہوں مگر اس بات کو لے کر شبہ ہو کہ آیا یہ دونوں الگ الگ امتیازی اصوات ہیں یا ایک ہی صوت کی دو مختلف اشکال ہیں، مشتبہ اصوات کہلاتی ہیں۔ مشتبہ

اصوات کا جوڑا مشتبہ جوڑا کہلاتا ہے۔

وضاحت کے لیے معیاری اردو کے ان الفاظ میں آنے والے [n] اور [n] پر غور کیجیے۔ ''اَندھا [endha]''، ''بوند [bu:nd]''، ''نان [na:n]''، ''صَنَم [senem]'' اور دوسری جانب ''اَنڈا [enda]''، ''ڈَنڈا [denda]''، ''مونڈ [mu:nd]''، ''جُھنڈ [jhUnd]''۔ پہلے چار الفاظ میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ [n] شروعاتی، درمیانی یا آخری پوزیشن میں واقع ہوا ہے۔ دیگر چار الفاظ میں ملاحظہ ہو کہ [n] صرف الفاظ کی درمیانی پوزیشن میں واقع ہوا ہے۔ یہ دونوں اصوات اَنفی مصمتے ہیں اور اس ناتے صوتی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مگر اب یہاں سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں دو الگ الگ امتیازی اصوات ہیں یا ایک ہی صوت کی دو اشکال؟ ممکن ہے کہ یہ دونوں ایک ہی صوت کی دو مختلف اشکال ہوں۔ دیگر الفاظ میں جب کسی دو اصوات کی فونیمیاتی (phonemic) حیثیت کے متعلق شبہ ہو تو یہ اصوات مشتبہ اصوات کہلاتی ہیں۔

جب بھی کسی ماہر فونیمیات کے سامنے مشتبہ اصوات آتی ہیں تو وہ ان اصوات والے بہت سارے الفاظ کو لے کر ان پر مخصوص فونیمیاتی اصولوں کا اطلاق کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ آیا متذکرہ اصوات علاحدہ علاحدہ امتیازی اصوات ہیں یا ایک ہی امتیازی صوت کے دو مختلف روپ ہیں۔

6۔ اقلی جوڑا (Minimal Pair)

فونیمیاتی تجزیے میں دو ایسے الفاظ میں کسی بھی پوزیشن (یعنی لفظ کی شروعات، درمیان یا آخر) میں ایک صوت کو چھوڑ کر باقی اصوات ایک جیسی ہوں، اقلی جوڑا کہلاتے ہیں۔

وضاحت کے لیے اردو کے مندرجہ ذیل دو الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ ''پَل /pel/'' اور ''پھل /phel/''۔ ان دو الفاظ میں /p/ اور /ph/ کے فرق کے علاوہ باقی سب اصوات ایک جیسی ہیں۔ لہٰذا ان دونوں الفاظ کے جوڑے کو اقلی جوڑا کہا جائے گا۔ دوسری مثال ''خَم /xem/'' اور ''غَم /xem/'' ملاحظہ ہو کہ ان الفاظ میں صرف /x/ اور /x/ کا فرق ہے۔ لہٰذا یہ بھی الفاظ کا اقلی جوڑا ہے۔

7۔ ذیلی اقلی جوڑا (Sub-minimal Pair)

فونیمیاتی تجزیے میں دو ایسے الفاظ جن میں کسی بھی پوزیشن (یعنی لفظ کی شروعات، درمیان یا آخر) میں دو اصوات کو چھوڑ کر باقی اصوات ایک جیسی ہوں، ذیلی اقلی جوڑا کہلاتے ہیں۔

وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل ان دو اردو الفاظ کو لیجیے۔ ''تمیز /temiz/'' اور ''دبیز /debiz/''۔ ان الفاظ میں شروع میں /t/ اور /d/ والی اصوات کے فرق کے علاوہ درمیانی پوزیشن میں /m/ اور /b/ کا فرق بھی ہے۔ دوسری مثال ''اِصرار /Israr/'' اور اِظہار /Izhar/''۔ ملاحظہ ہو کہ ان میں درمیانی پوزیشن میں /s/ اور /z/ کے فرق کے علاوہ درمیانی پوزیشن ہی میں /h/ اور /r/ کا فرق بھی ہے۔ لہٰذا الفاظ کے ان دونوں جوڑوں کو ''ذیلی اقلی جوڑا'' کہا جاتا ہے۔

8۔ ہو بہو ماحول (Identical Environment)

دو مشتبہ اصوات الفاظ کی کسی جوڑی میں ایک ہی پوزیشن (لفظ کے شروع، درمیان یا آخر) میں ایک دوسرے کے

تخالف میں اس طرح واقع ہوں کہ (ان الفاظ میں) صرف ایک ہی صوت کا فرق ہو، باقی اصوات یکساں ہوں تو اصوات کے وقوع کا ایسا ماحول ہو بہو ماحول (Identical Environment) کہلاتا ہے۔

الفاظ کے ''اقلی جوڑوں'' میں مشتبہ اصوات ہو بہو ماحول میں ہوتی ہیں۔

وضاحت کے لیے اردو کے مندرجہ ذیل دو الفاظ ملاحظہ کیجیے۔ ''جلیل'' (jeli:l)''، ''ذلیل (zeli:l)''۔ ان الفاظ میں شروعاتی پوزیشن میں [j] اور [z] ایک دوسرے کے تخالف میں ہیں اور الفاظ میں صرف ایک ہی صوت یعنی [j] اور [z] کا فرق ہے۔ اصوات کے وقوع کا اس قسم کا ماحول ''ہو بہو ماحول'' کہلاتا ہے۔

9۔ مماثل ماحول (Analoguous Environment)

دو مشتبہ اصوات الفاظ کی کسی جوڑی میں ایک ہی پوزیشن (لفظ کے شروع، درمیان یا آخر) میں ایک دوسرے کے تخالف میں اس طرح واقع ہوں کہ (ان الفاظ میں) صرف دو ہی الفاظ کا فرق ہو باقی اصوات یکساں ہوں تو اصوات کے وقوع کا ایسا ماحول مماثل ماحول کہلاتا ہے۔

الفاظ کے ''ذیلی اقلی جوڑوں'' میں مشتبہ اصوات مماثل ماحول میں ہوتی ہیں۔ وضاحت کے لیے اردو کے مندرجہ ذیل دو الفاظ کو لیجیے۔ ''محصول [mɛhsu:l]: محظوظ [mɛhzu:z]''۔ ان الفاظ میں درمیانی پوزیشن میں [s] اور [z] ایک دوسرے کے تخالف میں ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آخری پوزیشن میں [l] اور [z] بھی ایک دوسرے کے تخالف میں ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان واقع صوتی بعد اس بات کا سراغ ہے کہ یہ اصوات عموماً مشتبہ اصوات نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا مذکورہ بالا الفاظ میں [s] اور [z] تخالفی اصوات ہیں اور (الفاظ کی) جوڑی میں صرف دو اصوات یعنی [s] اور [l] یا [l] اور [z] کا فرق ہے۔ اصوات کے وقوع کا اس قسم کا ماحول ''مماثل ماحول'' کہلاتا ہے۔

10۔ باہمی اخراجی اصوات/ ماحول (Mutually Exclusive Sounds / Environment)

تکمیلی تقسیم (Complementary Distribution) کے ذیل میں یہ کہا گیا کہ الفاظ میں صوتی اعتبار سے ملتی جلتی اصوات کے ہر ممبر کی جگہ مخصوص و مختص ہے۔ دیگر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک ذیلی صوت کی جگہ اٹل ہوتی ہے۔ یعنی ایک ذیلی صوت کی جگہ دوسری ذیلی صوت نہیں لے سکتی۔ ذیلی اصوات کے وقوع کے متعلق جب ایسی صورت حال ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ اصوات باہمی اخراجی اصوات (Mutually Exclusive Sounds) کہلاتی ہیں۔

وضاحت کے لیے اردو کے ان الفاظ کو لیجیے۔ ''دھندا [dhenda]''، ''گندا [genda]'' اور ''انداز [enda:z]'' دوسری طرف ان الفاظ پر غور کیجیے۔ ''ٹھنڈا [thenda]''، ''ٹنڈا [tlnda]''، ''چنڈال [cenda:l]''۔ پہلے سٹ (set) کے تینوں الفاظ کے صوتی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ [d] سے پہلے [n] کا آنا ضروری ہے۔ اسی طرح دوسرے سٹ (set) کے تینوں الفاظ کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ [d] سے پہلے [n] کا آنا لازمی ہے۔ [n] اور [n] کا مذکورہ الفاظ میں ادل بدل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا [n] اور [n] باہمی اخراجی (Mutually Exclusive) اصوات ہیں اور ان اصوات کے وقوع کے ماحول کو باہمی اخراجی ماحول (Mutually Exclusive Environment) کہا جائے گا۔

11۔ باہمی شمولی ماحول (Mutually Inclusive Sounds / Environment)

صوتیاتی اعتبار سے الفاظ میں اصوات کی جگہ مخصوص و متعین ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی مشتبہ اصوات کسی لفظ میں ایک دوسرے کے ساتھ ادل بدل ہوسکتی ہیں۔ دیگر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کبھی کبھی ایک صوت کی جگہ دوسری صوت لے سکتی ہے۔ اصوات کے وقوع سے متعلق جب ایسی صورت حال ہو تو انھیں باہمی شمولی اصوات (Mutually Inclusive Sounds) کہا جائے گا۔ اور اصوات کے وقوع کے اس ماحول کو باہمی شمولی ماحول (Mutually Inclusive Environment) کہا جائے گا۔

وضاحت کے لیے لفظ ''ظاہر'' کو لیجیے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس لفظ کے دو تلفظ رائج ہیں۔ یعنی [zahɛr] اور [zahIr]۔ ظاہر ہے کہ اس لفظ میں دو اصوات [ɛ] اور [I] آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ادل بدل ہوسکتی ہیں۔ لہذا یہ دونوں باہمی شمولی اصوات ہیں اور ان کے وقوع کا ماحول ''باہمی شمولی ماحول'' کہلاتا ہے۔

درج بالا ذیلی عنوان ''باہمی اخراجی اصوات/ ماحول'' میں کہا گیا ہے کہ الفاظ میں ذیلی اصوات کے ہر ممبر کی جگہ مخصوص ومختص ہوتی ہے۔ مگر زبانوں میں کبھی کبھی ذیلی اصوات بھی ایک دوسرے سے ادل بدل ہوسکتی ہیں۔ ایسی صورت حال میں یہ بھی ''باہمی شمولی اصوات'' کہلائیں گی اور ذیلی اصوات کے وقوع کا ماحول ''باہمی شمولی ماحول''۔

4.5 فونیمیاتی نظریے کا مختصر تعارف

ہر زبان کی ایک ساخت ہوتی ہے جو صوتیوں (Phonemes)، صرفیوں (Morphemes)، جملوں اور سرلہری نمونہ جات (Intonational Patterns) وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ لہذا کسی بھی زبان (کی ساخت) کے تجزیے کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ یعنی صوتیاتی، فونیمیاتی، صرفی، نحوی وغیرہ۔ کسی زبان کی فونیمیاتی ساخت کے تجزیہ کو فونیمیاتی تجزیہ کہتے ہیں۔

زبان کا صوتیاتی مواد (Phonetic Data) کھردرا، ناہموار، کچا اور خام (Raw) مواد ہوتا ہے۔ فونیمیاتی تجزیے کے ذریعے ہم خام مواد سے اس زبان کے صوتیے دریافت کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ زبان میں ان صوتیوں کی تقسیم (Distribution) کیسے واقع ہوئی ہے۔ نیز زبان میں ان کا کیا عمل (Function) ہے؟ ان معلومات کی بنیاد پر صوتیوں کی گروہ بندی کر سکتے ہیں۔ مگر صوتیوں کی دریافت کا اہم ترین فائدہ زبان کے رسم الخط کے سلسلے میں ہے۔ یعنی صوتیوں کی بنیاد پر اس زبان کے لیے حروف تہجی تجویز کر سکتے ہیں تاکہ مادری زبان والوں کے لیے زبان پڑھنے اور لکھنے میں آسانی ہو۔ لہذا بہ قول ماہر لسانیات کے۔ ایل۔ پائک (K.L. Pike) کے عملی فونیمیات کا مقصد کسی زبان کو تحریر میں مقید کرنا ہے۔

کسی زبان کا فونیمیاتی تجزیہ کرنے اور اس کے خام صوتی مواد سے صوتیے اخذ کرنے کے سلسلے میں مختلف ماہرین لسانیات نے مختلف تکنیکیں اور مختلف طریقے سجھائے ہیں۔ مگر ان سب میں کے۔ ایل۔ پائک نے جو طریقہ سجھایا ہے اور جو ضوابط متعین کیے ہیں انھیں عالم گیر قبولیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف فونیمکس (Phonemics = فونیمیات) میں فونیمیاتی

تجزیے کے سلسلے میں جو طریقہ سجھایا ہے وہ مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہے۔(1) بنیادی مقدمات،(2) تمہیدی طریقہ اور (3) تجزیاتی طریقے۔ ایسا انھوں نے عالمی زبانوں کی آفاقی خصوصیات کو دھیان میں رکھ کر کیا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم ان کا جائزہ لیں گے۔

4.5.1 بنیادی مقدمات

پائک نے فونیمیاتی نظریے کے مندرجہ ذیل چار بنیادی مقدمات سمجھائے ہیں:

(1) پہلا مقدمہ : اصوات اپنے گرد و پیش کے ماحول سے ترمیم پذیری کا رجحان رکھتی ہیں۔

وضاحت : تکلم میں اصوات جب یکے بعد دیگرے آتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہونے کا میلان رکھتی ہیں۔ اس ادغام کی وجہ سے غیر امتیازی اصوات جنم لیتی ہیں جنھیں فونیمیاتی تحریر میں جگہ دینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

مندرجہ ذیل دو اہم نکات کے اضافے سے درج بالا بیان کی توسیع ہوسکتی ہے۔

(i)۔ اصوات خامشی میں مدغم ہونے کا میلان رکھتی ہیں۔

وضاحت : کوئی صوت جو جملے کی شروعاتی اور درمیانی پوزیشن میں مسموع ہو کچھ مخصوص حالات میں (جملے کی) آخری پوزیشن میں غیر مسموع ہو جاتی ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل جملے میں موجود صوت [b] جملے کی شروعات اور درمیان میں بطور مسموع صوت واقع ہوئی ہے۔ مگر جملے کے آخر میں یہی صوت غیر مسموع ہو جاتی ہے۔ وضاحت کے لیے اردو کا مندرجہ ذیل جملہ ملاحظہ ہو:

اردو تحریر	صوتیاتی تحریر	فونیمیاتی تحریر
بلو ہے بڑا خراب	[beblu hei bera xera:p]	/beblu hei bera xerαb/

(ii)۔ مختلف قسم کی وسیع صوتی (phonological) اور قواعدی (grammatical) اکائیوں کی سرحدیں بھی اصوات میں تبدیلی لا سکتی ہیں۔

وضاحت : کبھی کبھی کوئی صوت جو کسی جملے کے آخر میں بطور غیر مسموع صوت کے واقع ہوئی ہو جملے کے درمیان میں مسموع ہو جاتی ہے۔ مثلاً اردو کے مندرجہ ذیل جملے ''خرید لی قمیص؟ [xeri:d li qemi:s]'' میں جملے کے آخر میں آنے والی صوت [s] غیر مسموع ہے۔ مگر یہی غیر مسموع صوت [s] اگر جملے کے درمیان میں آئے تو مسموع ہوجاتی ہے۔ مثلاً اردو کے اس جملے ''قمیص دھلوالو [qemi:z dhUlvalo]'' میں ملاحظہ ہو کہ خط کشیدہ صوت [z] مسموع ہے۔ فونیمیاتی تحریر میں مندرجہ بالا جملے بالترتیب یوں ہوں گے /qemis dhUlvalo/ /xeridli qemis/

(2) دوسرا مقدمہ : صوتی نظام صوتی تناسب کا میلان رکھتے ہیں۔

وضاحت : صوتی تجزیے میں [p] اور [b]، [t] اور [d]، [k] اور [g] جیسے صوتی جوڑوں کا ملنا اس بات کی دلیل ہے

کہ ان اصوات کے وقوع میں ایک تناسب ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی فونیمیاتی تجزیہ کار کو دوران تجزیہ محض [p] اور [b]، [t] اور [d] اور [k] والی اصوات ملتی ہیں مگر [g] والی صوت نہیں ملتی تو اسے چاہیے کہ وہ دوبارہ اپنے مواد (Data) کا جائزہ لے۔ کیوں کہ صوتی تناسب میں اس قسم کی دراڑ کم واقع ہوتی ہے۔ عموماً متعلقہ سلسلہ (Series) کی تمام اصوات پوری موجود ہوتی ہیں۔

(3) تیسرا مقدمہ : اصوات میں اتار چڑھاؤ (Fluctuation) کا میلان رہتا ہے۔

وضاحت : کسی صوت یا اصوات کو بار بار دہرایا جائے تو ہمارے اعضائے نطق اس قابل نہیں کہ ہر بار ایک جیسی صوت یا اصوات پیدا کر سکیں۔ کسی لفظ کو دوبارہ کہا جائے تو اصوات میں باریک سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ اصوات کو جانچنے والے آلات اس نازک سے فرق یا اصوات کے اتار چڑھاؤ کو ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ کچھ موقعوں پر اصوات کے اس نازک سے فرق کو سنا جا سکتا ہے۔ مگر یہ فرق تفاعلی (Functional) یا اہمیت والا (Significant) نہیں ہوتا۔ اس قسم کے فرق کو فونیمیاتی تحریر میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً انگریزی کے یہ دو الفاظ [pʰIn] اور [pIn] فونیمیاتی تحریر میں /pIn/ ہی ہوں گے۔

(4) چوتھا مقدمہ مشتبہ اصوات یا مشتبہ اصوات کے تسلسل کی فونیمیاتی وضاحت میں اصوات کے فطری تسلسلات ساختیاتی دباؤ بناتے ہیں۔

وضاحت : اگر کوئی صوت (خواہ وہ مصوتہ ہو یا مصمتہ) مشتبہ نظر آئے تو فونیمیاتی تجزیہ کار کو چاہیے کہ وہ صوت یا فونیمی ارکان (Phonetic or Phonemic Syllables) میں، صرفیوں (Morphemes) میں یا مماثل غیر مشتبہ عناصر کی بہ نسبت اس کی تقسیم کو ذہن میں رکھتے ہوئے متذکرہ صوت کی فونیمیاتی حیثیت کے بارے میں فیصلہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصوات کے فطری تسلسلات مشتبہ اصوات کی وضاحت میں ساختیاتی دباؤ بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو کے ان الفاظ میں صوت ارکان (Syllables) کی ساخت کے نمونے (Pattern) پر غور کیجیے۔

اردو تحریر میں	صوتیاتی تحریر میں
خار	[xa:r]
بال	[ba:l]
ناچ	[na:c]
رات	[ra:t]
باغ	[ba:ɣ]
یار	[ia:r]

ملاحظہ ہو کہ آخری لفظ کو چھوڑ کر باقی سب الفاظ میں صوت رکن (Syllable) کی ساخت (مصمتہ۔ مصوتہ۔ مصمتہ) (Consonant - Vowel - Consonant) یعنی CVC والا ہے۔ دیگر الفاظ میں ہر لفظ مصمتے سے شروع

ہوتا ہے، اس کے بعد ایک مصوتہ آتا ہے اور مصمتے پر ختم ہوتا ہے۔ لہذا آخری لفظ [ia:r] کی شروعات مصوتے [i] سے نہیں ہوسکتی بلکہ اس مصوتے کی وضاحت بہ طور ایک مصمتے کے یعنی [y] کے ہونی چاہیے۔ نتیجتاً آخری لفظ [ya:r] ہوگا۔

4.5.2 تمہیدی طریقے

''تمہیدی طریقے'' کسی زبان کے فونیمیاتی تجزیہ کا دوسرا جز ہیں۔ تمہیدی طریقوں سے مراد فونیمیاتی تجزیے میں وہ طریقے ہیں جن پر عمل درآمد ہونے سے تیسرے جز یعنی ''تجزیاتی طریقوں'' کے اطلاق کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے۔ پائک کے مطابق کم از کم پانچ تمہیدی طریقے ہیں جن پر یکے بعد دیگرے عمل کرنا ہوتا ہے۔ ذیل میں ان پر بحث کی گئی ہے۔

(i) تمہیدی طریقہ۔A : صوتیاتی مواد کی ریکارڈنگ

صوتیاتی مواد کی ریکارڈنگ سے مراد اس زبان کے صوتیاتی مواد کو جس کے صوتیے دریافت کرنے ہیں، صوتیاتی تحریر میں رقم کرنا ہے۔ صوتیاتی مواد سے مراد مذکورہ زبان کا تکلمی مواد جو الفاظ، تراکیب، فقروں، جملوں اور مختصر یا طویل بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔

صوتیاتی مواد ریکارڈ کرتے وقت اس بات کا قوی امکان ہے کہ تجزیہ کار بہت سی غلطیاں کرے۔ مگر غلطیاں درکنار، اسے صوتیاتی مواد اسی طرح ریکارڈ کرنا چاہیے جس طرح اس کے کان محسوس کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی مواد سے اسے زبان کی امتیازی اصوات اخذ کرنی ہیں۔

صوتیاتی مواد ریکارڈ کرتے وقت تجزیہ کار کو یہ بھی چاہیے کہ وہ صوت ارکان (Syllables) کے درمیان واقع تقسیم کو بھی نقطے یا کسی اور علامت کے ذریعے ظاہر کرتا جائے۔ اسی طرح ایک تکلم کہاں شروع ہورہا ہے اور کہاں ختم اس بات کی نشان دہی بھی کسی علامت کے ذریعے کرنا چاہیے۔ زبان کی قواعدی تقسیم مثلاً صرفیوں کی شناخت، الفاظ و تراکیب کی سرحدیں وغیرہ پر اس کا دھیان ہونا چاہیے۔ دیگر الفاظ میں صوتیاتی، فونیمیاتی اور قواعدی تجزیہ ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔

(ii) تمہیدی طریقہ۔B : مسئلہ کی صحت و سالمیت پر غور و خوض

اس ذیلی طریقے سے پائک کی مراد یہ ہے کہ فونیمیاتی تجزیہ کار کو یہ سمجھنا ہوگا کہ اس کے پاس جو صوتیاتی مواد ہے وہ باصحت و سالم ہے۔ یہ بھی فرض کرنا ہوگا کہ ماہر لسانیات جس نے مواد ریکارڈ کیا ہے، کسی صوت کو سننے اور تحریر کرنے میں بے توجہی نہیں برتی ہے۔ نیز یہ کہ جو مواد سر دست اس کے پاس موجود ہے وہ فونیمیاتی تجزیہ کے لیے بہ طور مکمل مواد کے کام کرے گا۔

(iii) تمہیدی طریقہ۔C: صوتی چارٹ کی تعمیر

اس سے مراد تجزیہ کار اپنے پورے صوتیاتی مواد کا جائزہ لے گا اور اس زبان کی جس کا تجزیہ کیا جارہا ہے، تمام اصوات/ صوتی اجزا کا صوتی چارٹ بنائے گا۔ اس چارٹ میں اصوات/صوتی اجزا کے لیے حروف اسی ترتیب میں ہوں گے جس ترتیب میں بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط والے چارٹ میں حروف موجود ہیں۔ مذکورہ چارٹ میں کالموں (Columns) کے نام لکھنے

کی قطعی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ایسے کالم رکھے جائیں جن کے لیے صوتیاتی مواد میں اصوات موجود نہ ہوں۔ یہ بات تجزیہ کار کے ذہن نشین ہونا چاہیے کہ چارٹ میں درج ہر ایک صوت/صوتی جزو بہ طور ایک امتیازی صوت کے قائم ہوگا بہ شرطے کہ اگلے تجزیاتی طریقوں کے اطلاق سے وہ رد نہ ہو۔

(iv) تمہیدی طریقہ۔D : اصوات کے مشتبہ جوڑوں کی فہرست بنانا

فونیمیاتی تجزیہ میں صوتی چارٹ کی تعمیر کے بعد چارٹ میں موجود اصوات میں مشتبہ جوڑوں کی شناخت ضروری ہے۔

بنیادی مقدمات کے پہلے مقدمے میں آپ نے پڑھا کہ اصوات اپنے گرد و پیش کے ماحول سے ترمیم پذیری کا رجحان رکھتی ہیں۔ مثلاً اردو لفظ ''بدتمیز'' کے تلفظ پر غور کریں۔ صوتی اعتبار سے سابقہ ''بد'' [bed] کی ''د''، ''ت'' کی طرح ادا ہوتی ہے۔ صوتیاتی تحریر میں یہ لفظ اس طرح لکھا جائے گا [bet temi:z]۔ اب سوال یہ ہے کہ صوتیاتی اعتبار سے ''بدتمیز'' کے ''بد'' میں [t] ''ت'' ہے یا [d] ''د''؟ اردو کے حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں [t] نہیں [d] ہے جو گرد و پیش کے ماحول کی وجہ سے [t] میں تبدیل ہو رہا ہے۔ مگر ایک نامعلوم زبان میں قطعیت کے ساتھ ایسا کہنا ممکن نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ [d] اور [t] دونوں ایک ہی صوت یعنی [d] کی دو اشکال ہوں یا [t] کی دو اشکال ہوں۔ لہذا [d] اور [t] مشتبہ اصوات ہوئیں۔

اصوات کو مشتبہ قرار دینے کے بھی کچھ معیار ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ ہر کوئی دو اصوات مشتبہ ہوتی ہیں، درست نہ ہوگا۔ اصوات جو صوتیاتی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہوں عموماً مشتبہ ہوسکتی ہیں۔ صوتیاتی قربت سے مراد اصوات جو ایک ہی مخرج سے ادا ہوتی ہوں یا جن کا طرزِ تلفظ ایک سا ہو۔ ''مسموع: غیر مسموع'' کے معیار پر یا ''ہکاری: غیر ہکاری'' کے معیار پر بھی اصوات مشتبہ ہوسکتی ہیں۔

یعنی اردو اصوات کے مندرجہ ذیل جوڑے مشتبہ جوڑے ہوں گے:

[p]	اور	[b]
[t]	اور	[d]
[t]	اور	[d]
[t]	اور	[t]
[d]	اور	[d]
[l]	اور	[r]
[h]	اور	[i:]
[h]	اور	[a:]

(v) تمہیدی طریقہ۔E : غیر مشتبہ اصوات کی فہرست بنانا

اس طریقے میں ان تمام اصوات کی فہرست بنائی جاتی ہے جو واضح طور پر غیر مشتبہ ہیں۔

اس ضمن میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصوات جو صوتی طور پر ایک دوسرے سے بعید ہیں وہ کسی ایک صوت کی اشکال نہیں

ہوسکتیں۔ دیگر الفاظ میں وہ ایک صوتیے کی ذیلی اصوات نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا جب دو ایسی اصوات دریافت ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے صوتی طور پر شدید مختلف ہیں تو تجزیہ کار انھیں تجرباتی طور پر دو مختلف صوتیے قرار دے سکتا ہے۔ مثلاً درج بالا اردو اصوات کے چارٹ میں [p] اور [k] یا [t] اور [z]۔

مگر یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اصوات کے اختلاف کی شدت کا پیمانہ کیا ہوگا؟ کیوں کہ کبھی کبھی صوتیاتی طور پر شدید مختلف اصوات بھی کسی ایک صوت کی اشکال ہوسکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اصوات کے اختلاف کی شدت کا کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے۔ مگر ایسی صورت حال میں تجزیہ کار کو کھلے ذہن سے کام لینا چاہیے اور مزید مواد اور ثبوت کی فراہمی سے اپنے نتائج پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تجزیاتی طریقوں (جن کی تفصیل آئندہ سطور میں آئی ہے) کے اطلاق سے مشتبہ اصوات کی حیثیت کے بارے میں مزید ثبوت جٹایا جاسکتا ہے۔

فی الحال مذکورہ بالا صوتی چارٹ کے مطابق غیر مشتبہ اصوات کی فہرست یوں ہوگی (m)، (k)، (c) اور (z)۔

سوال 1۔ اردو صوتیاتی مواد

تابش	[tabIS]	قطار	[qeta:r]
پرواز	[p rva:z]	گلاب	[gula:b]
خیال	[x ya:l]	خلقت	[xelqet]
چوری	[cori]	ہلا	[hella]
سکوت	[sUku:t]	ضرور	[zeru:r]
کریلا	[k rela]	ظل	[zIl]
مالک	[malIk]	غلط	[elet]

درج بالا صوتیاتی مواد پر تمہیدی طریقہ ''سی'' اور ''ڈی'' کا اطلاق کیجیے۔

سوال 2۔ اردو صوتیاتی مواد

کمان	[kema:n]	زمانہ	[zemana]	دختر	[doxter]
معلوم	[malu:m]	سخن	[sUxen]	تلاش	[tela:S]
یاس	[ya:s]	سفال	[sIfa:l]	حیات	[heya:t]
مہذب	[mohezzeb]	فریق	[feri:q]	خارج	[xarIj]
ہڈی	[heddi]	کبوتر	[kebuter]	لہر	[lehr]
مہربان	[mehrba:n]	شبنم	[Sebnem]	تیر	[ti:r]
لذیذ	[lezi:z]	عروض	[Uru:z]	مزاج	[mIza:j]
		مقدر	[moxedder]	زور	[zo:r]

درج بالا صوتیاتی مواد پر تمہیدی طریقہ ''سی'' اور ''ڈی'' کا اطلاق کیجیے۔

4.5.3 تجزیاتی طریقے

درج بالا سطور میں فونیمیاتی تجزیہ کے سلسلے میں جو بنیادی مقدمات اور تمہیدی طریقے رائج ہیں ان پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان تجزیاتی طریقوں پر بحث کی جائے گی جنھیں پائک نے اپنی تصنیف ''فونیمکس (Phonemics)'' میں بیان کیا ہے۔

1۔ تجزیاتی طریقہ اول

مندرجہ ذیل سوال کے حل سے تجزیاتی طریقہ اول۔A کی وضاحت ہوتی ہے۔

''مشابہ اصوات مماثل صوتی ماحول میں ایک دوسرے کے تخالف میں ہوں تو انھیں فونیمیاتی طور پر کیوں کر الگ کیا جاسکتا ہے؟''

یہاں یہ بات قابل وضاحت ہے کہ کوئی دو مشتبہ اصوات کے لیے جو صوتی ماحول ''مماثل ماحول'' کا درجہ رکھتا ہو ضروری نہیں کہ اصوات کے دوسرے مشتبہ جوڑے کے لیے بھی وہ مماثل ماحول کا درجہ رکھے۔ یہ بھی کہ اصوات کے وقوع کا ہر ''ہو بہو ماحول'' مماثل ماحول ہوسکتا ہے مگر اس کے برعکس نہیں۔

اردو تحریر	صوتیاتی تحریر
بیگم	[begem]
دن	[dIn]
مختوم	[mextu:m]
بے غم	[berem]
دین	[di:n]
مخدوم	[merdu:m]
نثر	[nesr]
تین	[ti:n]

فونیمیاتی تجزیے کا پہلا مرحلہ یعنی ڈاٹا ریکارڈنگ ہو چکا۔

درج بالا سوال میں وقوع شدہ تمام اصوات کو ذیل کے صوتی چارٹ (phonetic chart) میں دکھایا گیا ہے:

	t		
b	d		g
m	n		
		r	
		s	x

i: u:

I

e

e

دوسرا مرحلہ یعنی اصوات کے مشتبہ جوڑوں کی فہرست یوں ہے:

[t] اور [d]

[x] اور [g]

[i] اور [i:]

تیسرا مرحلہ یعنی غیر مشتبہ اصوات یہ ہیں:

[b]،[m]،[n]،[r]،[s]،[u:]،[e]اور[e]

چوتھا مرحلہ یعنی اصوات کو الگ الگ کرنا:

(i) [g] اور [r] ہو بہو ماحول میں ایک دوسرے سے ان الفاظ یعنی (begem) اور (berem) میں تخالف پیش کرتے ہیں۔ لہذا [g] اور [r] دو مختلف امتیازی اصوات یا صوتیے (phonemes) ہیں۔

(ii) [I] اور [i:] بھی ہو بہو ماحول میں ایک دوسرے سے ان الفاظ یعنی [dIn] اور [di:n] میں تخالف پیش کرتے ہیں۔ لہذا [I] اور [i:] دو مختلف امتیازی اصوات یا صوتیے (phonemes) ہیں۔

(iii) [t] اور [d] بھی ہو بہو ماحول میں ایک دوسرے سے ان الفاظ یعنی [ti:n] اور [di:n] میں تخالف پیش کرتے ہیں۔ لہذا [t] اور [d] دو مختلف امتیازی اصوات یا صوتیے (phonemes) ہیں۔

(iv) [x] اور [r] مماثل ماحول میں ان الفاظ (mextu:m) اور (merdu:m) میں واقع ہوئے ہیں۔

[r] غیر مسموع صوت ہے اور غیر مسموع صوت سے پہلے واقع ہوئی ہے۔

[x] مسموع صوت ہے اور مسموع صوت سے پہلے واقع ہوئی ہے۔

[x] اور [r] ہو بہو ماحول میں واقع نہیں ہوئے ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ تخالف میں ہیں۔ لہذا انھیں بہ طور علاحدہ علاحدہ صوتیوں (phonemes) کے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

4.6 خلاصہ

فونیمیات نظریاتی لسانیات کے مطالعے کی دوسری سطح ہے۔ اس میں ان اصولوں اور تکنیکوں سے بحث ہوتی ہے جن کے اطلاق سے کسی زبان میں استعمال ہونے والے صوتیوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ کسی زبان/ بولی کے لیے جس کا کوئی رسم الخط

نہیں ہے، رسم الخط وضع کرنا ہو یا حروف تہجی ترتیب دینے ہوں تو صوتیوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

فونیمیات میں تکلمی مواد کو ریکارڈ کرنے کے لیے فونیمیاتی تحریر کا استعمال ہوتا ہے۔ اس تحریر میں اصوات کی امتیازیت (Distinctiveness) کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لہذا اس تحریر کو وسیع تحریر (Broad Transcription) کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر فونیمیاتی اکائی کو ترچھی لکیروں / / میں مقید کیا جاتا ہے۔

فونیمیات کی بہت ساری اصطلاحات ہیں۔ مثلاً صوتیہ، ذیلی صوت، تکمیلی تقسیم، تخالفی اصوات، مشتبہ جوڑا، اقلی جوڑا، ہو بہو ماحول، مماثل ماحول وغیرہ۔

کے۔ ایل۔ پائک کو فونیمیاتی نظریہ کا مجوز و موجد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اپنی تصنیف ''فونیمکس (Phonemics)'' میں موصوف نے اپنے اس فونیمیاتی نظریے کو پیش کیا ہے۔ بہ قول پائک فونیمیاتی نظریہ مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہے۔ (i) بنیادی مقدمات، (ii) تمہیدی طریقے، (iii) تجزیاتی طریقے۔ ان میں سے ہر ایک کے کئی ذیلی حصے ہیں۔ درج بالا سطور میں ان تمام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف سوالات کی مدد سے وضاحت کے ساتھ ان پر بحث کی ہے۔

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ صوتیات اور فونیمیات کے فرق کو مناسب دلیلوں کے ذریعے واضح کیجیے۔

2۔ فونیمیات کی تعریف کیجیے اور اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالیے۔

3۔ فونیمیاتی نظریہ کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ ان فونیمیاتی اصطلاحات پر تفصیلی نوٹ لکھیے:

(i) صوتیہ، (ii) ذیلی اصوات، (iii) تکمیلی تقسیم، (iv) اقلی جورا، (v) ہو بہو ماحول

2۔ درج ذیل مقدمے پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے اس کی وضاحت پیش کیجیے۔

''مشتبہ اصوات یا مشتبہ جوڑوں کے تسلسل کی فونیمیاتی وضاحت میں اصوات کے فطری تسلسلات ساختیاتی دباؤ بناتے ہیں۔''

3۔ فونیمیات کی اصطلاحات پر مختصراً بحث کیجیے۔

4.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔ فونیمکس (انگریزی میں) : کے۔ایل۔ پائک — این اربور، دی یونی ورسٹی آف مشگین

2۔ صوتیات اور فونیمیات : پروفیسر اقتدار حسین خاں — قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی

3۔ لسانیات کے بنیادی اصول : ایضاً — ایجوکیشنل بک ہاؤز، علی گڑھ

4۔ لسانیات کیا ہے؟ : ڈیوڈ کرسٹل — (اردو ترجمہ: ڈاکٹر نصیر احمد خاں) قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی

اکائی 5 صرف

ساخت

5.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں علم لسانیات کی ایک اہم شاخ صرف کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- صرف کی تعریف کر سکیں اور صرفی اعمال پر روشنی ڈال سکیں
- صارف، ایلو مارف اور مارفیم کی وضاحت کر سکیں
- اشتقاق اور تصریف کے عمل کی صراحت کر سکیں
- گردان کے تصور کو واضح کر سکیں
- لفظ اور مارفیم و نیز لفظیہ اور لفظی کے مسائل بیان کر سکیں
- تحلیلی اور ترکیبی زبانوں و نیز امتزاجی اور ادغامی زبانوں کے فرق کی وضاحت کر سکیں
- Decleusion اور Conjugation کے مفہوم کی وضاحت کر سکیں اور
- مادہ اور ساق و نیز غیر متصرف الفاظ کے تصور کی وضاحت کر سکیں۔

5.1 تمہید

لفظ اپنے استعمال کے لحاظ سے دو نوعیتیں رکھتے ہیں۔ایک تو سادہ لفظ ہیں، جو کسی تصور کو ظاہر کرتے ہیں اور اس تصور کے ساتھ ٹنکے ہوتے ہیں۔لغت میں ہم لفظوں کو عموماً اسی روپ میں پاتے ہیں۔اس کے مقابلے میں لفظوں کے وہ روپ ہیں جو جملوں میں استعمال ہوتے ہیں۔اس صورت میں جملے میں لفظ کی حیثیت کے لحاظ سے ان میں قواعدی سابقے، لاحقے یا وسطیے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔اس اعتبار سے قواعدی لفظ یا کلمے میں دو جزو ہوتے ہیں۔ایک اصل لفظ دوسرے قواعدی سابقے یا لاحقے۔

مارفیمیات یا صرف میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔مثلاً ایک مادے میں سابقے اور لاحقے لگا کر نئے لفظوں کا اشتقاق کیوں کر ہو سکتا ہے؟

جس طرح عام طور پر رائج اسکولی قواعد کے دو اہم شعبے صرف اور نحو ہیں اسی طرح لسانیات میں بھی قواعد نام ہے صرف اور نحو کا۔لیکن لسانیات کی مارفالوجی قواعد کی صرف سے مختلف ہوتی ہے۔روایتی قواعد میں مارفیم کے مقابلے کا تصور نہیں۔مارفالوجی میں ''ایران کا بادشاہ'' ایک لفظ تصور کیا جاتا ہے جب کہ قواعد میں یہ تین لفظوں کا مجموعہ ہے۔اس اکائی میں صرف کے ان مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

5.2 صرف کی تعریف

لسانیاتی نقطۂ نظر سے زبان کی قواعد کے دو حصے ہوتے ہیں یعنی (1) صرف اور (2) نحو۔اس اکائی میں صرف کے

بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔صرف کے معنی لسانیات کا وہ شعبہ ہے جو ساخت سے بحث کرتا ہے۔اس بات کا مطالعہ کرنا کہ کسی زبان میں الفاظ کی بناوٹ کس طرح ہوتی ہے اور الفاظ آپس میں ایک دوسرے سے کس طرح کا رشتہ رکھتے ہیں۔کسی بھی زبان میں الفاظ ایک اہم قواعدی رول ادا کرتے ہیں لسانیات کی زبان میں صرف سے مراد کسی زبان میں موجود صرفیوں کا مطالعہ اور اس بات کا مطالعہ بھی کہ صرفیے آپس میں جڑ کر کس طرح الفاظ بناتے ہیں۔ بناوٹ کی کم ترین اکائی یعنی صرفیوں کا مطالعہ علم صرف ہے۔لہذا صرف کی بنیادی اکائی ''صرفیہ'' ہے۔''صرفیہ'' یعنی وہ کم ترین معنی خیز اکائی جو لفظ پر مشتمل ہو یا لفظ کے ترکیبی اجزا پر مشتمل ہو۔مثلاً بے، غیر، وار، دار یا میز، دیوار، آدمی وغیرہ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ صرفیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں (1) آزاد صرفیے (Free Morpheme)، (2) پابند صرفیے (Bound Morpheme)۔آزاد صرفیے (Free Morpheme) وہ صرفیے ہیں جو آزادانہ طور پر بطور الفاظ زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔مثلاً کرسی، پیڑ، گھر وغیرہ۔منسلک صرفیے وہ ہیں جو دوسرے صرفیوں کے ساتھ منسلک ہو کر زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔مثلاً نا، بد، افزا وغیرہ۔علم صرف یا مارفولوجی لسانیات کا وہ ذیلی شعبہ ہے جو لفظی ساخت سے بحث کرتا ہے۔الفاظ علم صرف کی کم ترین اکائیاں ہیں بہت سی زبانوں میں الفاظ ایک دوسرے سے اصولوں کے تحت جڑے ہیں۔مثلاً اردو بولنے والے حضرات یہ جان جاتے ہیں کہ الفاظ کتاب: کتابیں: کتابوں: کتاب چہ: کتابی: کتب: کتب فروش: کتب خانہ آپس میں ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔اردو بولنے والے اردو الفاظ سازی رشتے کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ''میز'' اور ''میزیں'' کے درمیان بھی وہی رشتہ ہے جو ''کتاب'' اور ''کتابیں'' کے درمیان ہے۔نیز یہ کہ جو رشتہ ''کتاب'' اور ''کتابوں'' کے درمیان ہے ''میز'' اور ''میزوں'' کے درمیان بھی وہی رشتہ ہے۔کسی زبان کے بولنے والوں نے زبان میں الفاظ سازی کے سلسلے میں جو اصول وضع کیے ہیں وہ اس بات کے غماز ہیں کہ متذکرہ زبان میں واضح قاعدوں کے تحت کس طرح چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے الفاظ کس طرح بنائے جاتے ہیں نیز کہ تکلم متذکرہ اکائیاں کس طرح زبان یا مختلف زبانوں کے حوالے سے اس بات کا مطالعہ کرتی ہے کہ الفاظ سازی کے کیا قاعدے ہیں نیز یہ کہ یہ شاخ قاعدوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

الفاظ کے صرفی تجزیے کی تاریخ کافی پرانی ہے اور قدیم ہندستانی ماہر لسانیات پانی نی سے منسوب کی جاتی ہے۔ موصوف نے اپنی تصنیف اشٹ اَدھیایا میں سنسکرت کی صرف کے 3959 قاعدوں کی نشان دہی کی ہے۔

5.3 صرفی اعمال (Morphological Processes)

یونانیوں اور رومیوں کے یہاں بھی قواعد کے مطالعے صرفی تجزیے کی روایت ملتی ہے۔لفظ مارفولوجی 1859ء میں اگست شلیشر (August Schleicher) نے روایت coin کیا تھا۔

صرفی اعمال وہ اعمال ہیں جن کی مدد سے ہم کسی گردان کو بنانے والے مختلف الفاظ کے درمیان موجود ترکیبی اختلافات کو معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ اعمال کسی فارم کے کسی طور بدلی ہوئی اشکال پر مشتمل ہوتے ہیں تا کہ مختلف مگر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے فارمز حاصل ہو سکیں۔

صرفی اعمال کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں:

1۔ تعلیقیت(Affixatin)

وہ جز جو کسی ہیئت (form) کے شروع، درمیان یا آخر میں جڑتا ہے تعلیقیہ (affix) کہلاتا ہے اور اس عمل کو تعلیقیت کہتے ہیں۔ تعلیقیے وہ پابند صرفیے ہیں جو دیگر آزاد یا پابند صرفیوں میں جڑتے ہیں اور ہم رشتہ الفاظ کے سیٹ یوں بناتے ہیں کہ مختلف سیٹوں میں موجود الفاظ کے معنی میں اختلافات متوازی ہوں۔ اس بات کے مدنظر کہ تعلیقیہ آیا لفظ کے شروع میں، درمیان یا آخر میں جڑ رہا ہے تعلیقیوں کی مندرجہ ذیل تین قسمیں ہوتی ہیں۔

(i) سابقہ(prefix) : سابقہ وہ تعلیقیہ ہے جو کسی ہیئت کے شروع میں جڑتا ہے۔ مثلاً ان، کم وغیرہ۔ کسی ہیئت میں سابقہ جوڑ کے نیا فارم بنانے کے عمل کو سابقہ سازی (Prefixation) کہا جاتا ہے۔

(ii)وسطیہ(infix) : وسطیہ وہ تعلیقیہ ہے جو کسی ہیئت کے درمیان جڑتا ہے مثلاً معیاری عربی لفظ کتب[keteba] بہ معنی ''اس نے لکھا'' مگر جب اس ہیئت کے درمیان میں /k/اور /t/ کے بعد آنے والے /e/ کو ہٹا کر بالترتیب /U/اور /I/ سے بدل دیا جائے یعنی[/KUtIba/] تو معنی میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اب اس کے معنی میں ''وہ لکھا گیا'' یعنی/I---U/وسطیہ ہے۔

(iii)لاحقہ(suffix) : لاحقہ وہ تعلیقیہ ہے جو کسی ہیئت کی آخر میں جڑتا ہے۔ مثلاً کچھ اردو اسما کی جمع ات /at-/ جڑ کر بنتی ہے مثلاً حالات، مقامات، جوابات، لہذا /at-/ لاحقہ ہوا۔

کسی ہیئت میں لاحقہ جوڑ کر ایک نئی ہیئت بنانے کے عمل کو لاحقہ سازی (suffixation) کہا جاتا ہے۔

2۔ داخلی تبدیلی(Internal Change)

دو یا دو سے زائد الفاظ جو ہیئت اور معنی کے اعتبار سے قریبی تعلق رکھتے ہوں، ہوسکتا ہے کہ اپنی بنیادی ہیئت میں کوئی امتیازی صوت یا امتیازی اصوات کی وجہ سے مختلف ہوں۔ ایسی صورت حال میں یہ مانا جائے کہ الفاظ کی اس گردان میں ایک لفظ دوسرے لفظ سے داخلی تبدیلی کی وجہ سے آیا ہے۔ مثلاً اردو الفاظ دب /deb/ اور داب /dab/ ایک ہی گردان کے ممبر ہیں اور ہیئت اور معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ یہ مانا جاسکتا ہے /dab/ ''داب''، /dab/ ''دب'' سے /e/ کے /a/ میں بدلنے سے مشتق ہوا ہے۔ لہذا /dab/ ''دب'' سے داخلی تبدیلی کی وجہ سے رونما ہوا ہے۔

3۔ تکرار(Reduplication)

اگر کسی لفظ کی بنیادی ہیئت مکمل یا جزوی طور پر داخلی تبدیلی کے ساتھ یا بغیر داخلی تبدیلی کے ساتھ بنیادی ہیئت سے قبل یا بعد میں دہرائی جائے تو ایسے صرفی عمل کو تکرار (Reduplication) کہا جاتا ہے۔ مثلاً اردو الفاظ /jatejate/ ''جاتے جاتے'' (مثلاً جملہ: جاتے جاتے بارش نے اپنا کمال دکھایا)، /karte karte/ ''کرتے کراتے'' (مثلاً جملہ: آپ کرتے کراتے کچھ نہیں ہیں)، /cae vae/ چائے وائے (مثلاً جملہ: چائے وائے ہوگئی؟)

4۔ غصب(Suppletion)

یہ وہ انتہائی قسم کی داخلی تبدیلی ہے جس میں کسی لفظ کی بنیادی ہیئت کسی دوسری ہیئت سے بدل دی جاتی ہے۔مثلاً اردو لفظ/ja/''جا'' کی گردان ملاحظہ کیجیے:

ja

jata

jati

jate

jati

gaya

gayi

gaye

gayi

jan

jae

jae

jana

لفظ''جا'' کی یہ گردان بے قاعدہ گردان اس معنی میں ہے کہ ماضی والی ہیئتوں کی طرف نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ہیئتیں لفظ''جا'' سے مکمل طور پر تبدیل ہوچکی ہیں۔لہٰذا/ge/ غصبی ہیئت مانی جائے گی اوراس قسم کے صرفی عمل کوغصب (Suppletion) کہاجائے گا۔

اسی طرح اردو میں ایک دوسری بے قاعدہ گرادن لفظ/ho/ کی ہے۔/ho/ کی مختلف ہیئتوں پرغور کیجیے۔

ho

hai

hei

hei

tha

thi

the

thi

ho

درج بالا گردان میں دیکھا جاسکتا ہے کہ /ho/ کی ماضی والی ہیئتیں مکمل طور پر بدلی ہوئی ہیں۔لہذا /th/ کو غصبی ہیئت مانا جائے گا اور یہ صرفی عمل ''غصب'' کہلاتا ہے۔

5۔ صفر ترمیم (Zero-modification)

کوئی دو الفاظ کی ہیئتوں میں اسی قسم کے الفاظ کی کسی اور جوڑی کے مقابلے میں اگر کوئی سابقہ وسطیہ یا لاحقہ نہ جڑے تو یہ مانا جائے گا کہ ان الفاظ کی ہیئت میں صفر ترمیم ہوئی ہے اور اس طرح کے صرفی عمل کو صفر ترمیم کہا جائے گا۔

مثال کے طور پر الفاظ کی ان جوڑیوں پر غور کیجیے۔

[dexext: derext] (درخت: درخت) (جملے مثلاً: صحن میں ایک درخت ہے: صحن میں چار درخت ہیں) Vs [prude : pruda] (پودا: پودے) (جملے مثلاً صحن میں ایک پودا ہے: صحن میں چار پودے ہیں) لہذا یہ مانا جائے گا کہ لفظ ''پودے'' کے مقابلے میں ''درخت'' میں صفر ترمیم ہوئی ہے۔

مارف	:	ایلومارف	:	مارفیم
صرفی شکل	:	ذیلی صرفیہ	:	صرفیہ

5.4 صارف (صرفی شکل)

زبان کی کوئی بھی ایسی کم ترین اکائی جو قواعدی ہو اور پر معنی ہو صارف کہلائے گی۔مثلاً لفظ /baedeb/ ''باادب'' میں -ba ''با'' ایک صارف ہے تو /edeb/ ''ادب'' دوسرا صارف ہے، لفظ /dIlnosi/ ''دل نشین'' میں /dIl/ ''دل'' ایک صارف ہے تو /nesi/ ''نشیں'' دوسرا صارف ہے لفظ /kItabe/ ''کتابیں'' میں /kItab/ ''کتاب'' ایک صارف ہے تو /-e/ دوسرا صارف ہے۔اسی طرح لفظ /jata/ ''جاتا'' میں /ja/ ''جا'' ایک صارف ہے تو /-t-/ ایک صارف اور /-a/ ''ا'' بھی ایک صارف ہے۔دوسری جانب آزادانہ الفاظ مثلاً /dIl/ ''چھت'' وغیرہ بھی صارف ہیں۔گویا کہ زبان کے الفاظ میں ہر وہ کم ترین اکائی جس کا زبان کا قواعد میں رول ہے اور پر معنی ہے صارف کہلائے گی۔

5.5 ایلومارف (ذیلی صرفیہ)

ممکن ہے کہ زبان میں کوئی دو یا دو سے زائد مارفز معنی کے اعتبار سے یکساں ہوں اور اکثر و بیشتر شکل صورت کے اعتبار سے بھی ہم رشتہ ہوں۔مندرجہ ذیل اردو الفاظ ملاحظہ ہوں۔/larka:larke/ (لڑکا: لڑکے)، [lerki-lerkIya]: (لڑکی: لڑکیاں) [kItab:kItab] (کتاب: کتابیں)، [qelem:qelem] (قلم: قلم) مثلاً ان جملوں میں میرے پاس ایک قلم ہے: میرے پاس دو قلم ہیں، [cIrIya: CIrIya] (چڑیا: چڑیاں) وغیرہ۔درج بالا الفاظ میں سے larkiya: lerke،

Cirlya، kltabe میں دیکھا جاسکتا ہے کہ بالترتیب لاحقوں e-، ya-، e- کے جڑنے سے یہ جمع بن جاتے ہیں۔ ان کے برعکس qelem میں کسی چیز کا اضافہ ہوا۔ مگر یہ لفظ بھی جمع کے معنی دے رہا ہے۔ یعنی یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس میں صفر کا اضافہ ہوا ہے۔ لہذا اردو میں جمع بنانے کے لیے خصوصاً ہندی الفاظ میں یہ تمام مارفز یعنی e-، ya، e-، ~ استعمال ہوتے ہیں۔ مگر یہ مارفز معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے قریبی ہیں یعنی سبھی جمع کے معنی پیدا کرتے ہیں۔ لہذا یہ سب (کسی مارفیم کے) ایلو مارفز یا ذیلی صرفیے ہیں۔

5.6 مارفیم (صرفیہ)

درج بالا ایلو مارف کے ذیل میں آپ نے دیکھا کہ خصوصاً ہندی الفاظ کی جمع بنانے کے لیے اردو میں کم از کم پانچ مارفز ہیں یعنی -، e-، ya، e، ~، -، یہ سبھی ایک ہی معنی کی ترجمانی کرتے ہیں لہذا انھیں ایک دوسرے کے قریبی کہا جاسکتا ہے۔ ذیل میں فہرست بتائی گئی ہے:

-e

-ya

-e

~

-

ان میں کسی ایک کا انتخاب کر کے اسے بطور مارفیم مانا جاسکتا ہے۔ یعنی ہم نے e- کا انتخاب کیا اور اسے مارفیم مان لیا۔ اب اسے فلاور بریکٹس میں بند کر دیا۔ یعنی {e-} اب اس مارفیم اور اس کے مختلف ایلو مارفز کے رشتے ذیلی خاکے میں دکھایا گیا ہے:

-e	
-ya	-e
-e	
~	

یعنی مارفیم {e-} کے کم از کم پانچ ایلو مارفز ہیں۔ e-، ya-، e-، ~ اور -

5.7 اشتقاق (Derivation) اور تصریف (Inflection)

زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ الفاظ طرح طرح کے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً ''میز''

بھی لفظ ہے''میز میں'' بھی لفظ ہے۔''لکھ'' بھی لفظ ہے اور''لکھا'' بھی لفظ ہے۔''خبر'' بھی لفظ ہے''باخبر'' بھی لفظ ہے۔''پتھر'' بھی لفظ ہے اور''پتھریلا'' بھی لفظ ہے۔ درج بالا الفاظ کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم وہ ہے جنھیں توڑا نہیں جا سکتا مثلاً میز، لکھ، دل اور پتھر۔ دوسری قسم وہ ہے جنھیں توڑا جا سکتا ہے مثلاً میزیں، لکھا، دل نشیں، پتھریلا۔ یہ سب الفاظ دو صرفیوں کے بنے ہوئے ہیں جن میں ایک صرفیہ آزاد ہے اور دوسرا پابند۔ مثلاً میزیں = میز + یں، لکھا= لکھ + ا، باخبر = با+ خبر، پتھریلا = پتھر + یلا۔ اس قسم کے الفاظ پیچیدہ الفاظ کہلاتے ہیں۔ مگر ان میں سے آخری دو الفاظ صفت کے زمرے میں آتے ہیں اور تراکیب میں اسی طرح آ سکتے ہیں جس طرح ایک آزاد صرفیہ والی صفت آتی ہے مثلاً انسان یا باخبر انسان، چٹیل علاقہ، پتھریلا علاقہ، مگر پہلے والے دو الفاظ اس طرح نہیں آ سکتے مثلاً''میز پر'' میزیں پر، (تو) مضمون لکھو، (تو) مضمون لکھا۔

درج بالا صورت حال کا اس طرح خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی پیچیدہ لفظ کسی ترکیب میں اسی طرح آ سکتا ہے جس طرح اسی زمرے کا سادہ لفظ آتا ہو تو پیچیدہ لفظ میں استعمال ہونے والے تعلیقیہ کو''اشتقاقی تعلیقیہ'' (Derivational Affix) کہا جاتا ہے اور صرفی عمل جس کے ذریعے پیچیدہ لفظ وجود میں آیا ہے اسے اشتقاق (Derivation) کہا جاتا ہے۔ مثلاً درج بالا دو الفاظ''باخبر'' اور''پتھریلا'' میں''با'' اور''یلا'' اشتقاقی تعلیقیے ہیں اور اشتقاق کے ذریعے یہ الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ وہ اساسی الفاظ جہاں سے یہ مشتق کے گئے ہیں بالترتیب یہ ہیں''خبر'' اور''پتھر''۔ دیگر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشتقاق کے ذریعے نئے الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ جب کہ تصریف میں ایک ہی لفظ کی مختلف اشکال وجود میں آتی ہیں۔

وہ عمل جس میں کسی لفظ میں تصریفی صرفیے (جوہری معنیاتی اکائیاں) تعلیقیے جوڑے جاتے ہیں یہ تعلیقیوں میں قواعدی معلومات ظاہر کرتے ہیں (مثلاً حالت، تعداد، شخص، جنس یا زمانہ، صورت اور کیفیت) اس کے برعکس اشتقاق وہ عمل ہے جس میں اشتقاقی تعلیقیے کسی لفظ میں جڑتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک نیا لفظ وجود میں آتا ہے۔ اشتقاقی عمل میں کئی بار یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک جزو کلام دوسرے جزو کلام میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً''چاہ'' سے''چاہت'' وجود میں آیا۔

لغت میں الفاظ عموماً تصریفی تعلیقیوں کے ساتھ واقع نہیں ہوتے۔ مگر اکثر و بیشتر وہ اشتقاقی تعلیقیوں کے ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ مثلاً اردو لغت میں چبھ'' اور اس سے بننے والا''چبھن'' دونوں جگہ پا سکتے ہیں۔ مگر چبھتا، چبھا وغیرہ نہیں جگہ پا سکتے ہیں۔ اسی طرح''خرید'' بہ طور اسم بھی لغت میں ملے گا اور اس سے بنا فعل''خریدنا'' بھی ملے گا۔ مگر ایسے الفاظ''خریدتا''، ''خریدتے'' لغت میں نہیں جگہ پائیں گے۔

پیچیدہ لفظ میں استعمال ہونے والے تعلیقیہ کو''تصریفی تعلیقیہ'' (Inflection Affix) کہا جاتا ہے اور وہ صرفی عمل جس کے ذریعے پیچیدہ لفظ وجود میں آیا ہے اسے تصریف (Inflection) کہا جاتا ہے۔ مثلاً درج بالا دو الفاظ''میزیں'' اور ''لکھا'' میں''یں'' اور''ا'' تصریفی تعلیقیے ہیں اور تصریف کے ذریعے یہ الفاظ وجود میں آئے ہیں۔

5.8 گردان (Paradigm)

الفاظ کا ایک ایسا سیٹ (Set) جس میں سبھی الفاظ ایک مشترکہ اساس (Base) پر بنائے گئے ہیں اور جن میں سبھی ممکنہ تعلیقیے جوڑے گئے ہوں''گردان (Paradigm) کہلاتا ہے۔ ذیل میں اردو کے دو الفاظ''گھڑی'' اور''کھا'' کی گردان

بنائی گئی ہے۔

1۔ گھڑی : گھڑی
گھڑیاں
گھڑیوں

2۔ کھا : کھایا
کھائی
کھاؤ
کھائے
کھایئے
کھائیں
کھاؤں
کھاتا
کھاتے
کھاتی
کھاتیں
کھانا
کھاجا

زبانوں میں اشتقاق اور تصریف کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ بھی ممکن ہے کہ الفاظ کی اشتقاقی اور تصریفی گردان الگ الگ بنائی جائے۔

مثلاً اردو لفظ ''وفا'' کی اشتقاقی گردان یوں ہوگی:

وفا : وفادار
وفاشعار
بےوفا
باوفا
وفاداری
وفاپرست
وفاکش
وفاپیشہ

پرُ وفا

بےوفائی

''وفا'' کی تصریفی گردان یوں ہوگی:

وفا

وفائیں

وفاؤں

اسی طرح لفظ'' کر'' کی اشتقاقی گردان یوں ہوگی:

کر

کرا

کروا

کام

کار

کرم

کاج

''کر'' کی تصریفی گردان یوں ہے:

کر

کیا

کی

کیے

کیں

کروں

کرے

کریں

کرو

کیجیے

کرتا

کرتی

کرتے

کرتیں

کرنا

5.9 لفظ اور مارفیم

زبان میں کئی طرح کے الفاظ ہوتے ہیں اور ''زبان دان'' بھی لفظ ہے نیز یہ کہ ''زبان دراز'' بھی لفظ ہے۔ ''دم'' بھی لفظ ہے، ''دم دار'' بھی ہے اور دم چھلا بھی لفظ، ''جادو'' لفظ ہے، ''جادوگر'' بھی لفظ ہے اور ''جادومیاں'' بھی لفظ ہے۔ شاہ لفظ ہے، ''شاہانہ'' بھی لفظ ہے اور شاہ رگ بھی لفظ ہے۔ کچا، کچا پن، کچا چٹھا، مکان، مکان دار، مالک مکان، نازک، نازک، نازک تر، نازک اندام مثلاً اردو کے ان الفاظ پر غور کیجیے:

زبان	زبان داں/زبان دانی	زبان دراز
دم	دم دار	دم چھلا
جادو	جادوگر/ جادوگری	جادوبیاں
شاہ	شاہانہ	شاہ رخ
کچا	کچا پن	کچا چٹھا
نازک	نازک تر	نازک اندام

اوپر پہلے کالم میں دیے گئے الفاظ کو کسی بھی طرح توڑا نہیں جاسکتا۔ اگر ان میں سے کسی کو توڑنے کی کوشش کی جائے تو ان میں سے کسی بھی لفظ کے معنی برقرار نہیں رہ سکتے۔ مگر درمیانی کالم میں آنے والے ہر لفظ کو دو حصوں میں توڑا جاسکتا ہے۔ مثلاً زبان داں کو ''زبان'' اور ''دان'' میں توڑا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ''شاہانہ'' کو ''شاہ'' اور ''آنہ'' میں، ''نازک تر'' کو ''نازک'' اور ''تر'' میں توڑا جاسکتا ہے۔ دیگر الفاظ بھی اسی طرح دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں ایک حصہ آزاد مارفیم پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ پابند مارفیم پر۔ مثلاً ''زبان داں'' میں ''زبان'' آزاد مارفیم ہے اور ''داں'' پابند مارفیم۔ اسی طرح ''نازک'' آزاد مارفیم ہے تو ''تر'' پابند مارفیم۔ اس قسم کے الفاظ جو ایک یا ایک سے زیادہ ''پابند فاریم'' کے ملنے سے بنے ہوں پیچیدہ لفظ کہلاتے ہیں۔

اب تیسرے کالم میں دیے گئے الفاظ کی ساخت پر غور کیجیے۔ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بھی ہر ایک لفظ کو دو حصوں میں توڑا جاسکتا ہے۔ مثلاً ''زبان دراز'' کو دو حصوں ''زبان'' اور ''دراز'' میں توڑا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ''جادوبیاں'' کو بھی دو حصوں میں توڑا جاسکتا ہے۔ ''جادو'' اور بیاں'' مگر یہاں دوسرے کالم والے الفاظ کے برعکس ان الفاظ کا ہر حصہ بطور ایک آزاد ہیئت کے طور پر انفرادی لفظ کے زبان میں آسکتا ہے۔ مثلاً ''زبان'' بھی ایک لفظ ہے ''دراز'' بھی ایک لفظ ہے۔ اسی طرح ''جادو'' ایک آزاد لفظ ہے تو ''بیاں'' بھی ایک آزاد لفظ ہے۔ اسی طرح کے الفاظ جو دو یا دو سے زیادہ آزاد ہیئتی الفاظ پر مشتمل ہوں مرکب الفاظ کہلاتے ہیں۔

مرکب لفظ اگر چہ دو آزاد لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر اپنے آپ میں ایک آزاد لفظ ہے۔

5.10 لفظیہ اور لفظی ہیئت (Lexeme and Word-form)

جدید لسانیات کے نقطہ نظر سے ''لفظ'' والی اصطلاح مبہم اور واضح ہے۔ وضاحت کے لیے یہ الفاظ ''کتاب'' اور ''کتابیں'' ملاحظہ ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مفہوم میں یہ دونوں الفاظ ایک ہی ہیں۔ (دونوں الفاظ ''اسم'' ہیں جو اوراق والی ایک مادی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور تعداد کے لحاظ سے مختلف ہیں) مگر دوسرے مفہوم میں یہ دونوں الفاظ مختلف ہیں۔ مثلاً بغیر دیگر الفاظ کو بدلے ایک ہی قسم کے جملے میں یہ دونوں الفاظ آ نہیں سکتے۔ مثالیں۔ کتاب اچھی ہے، کتابیں اچھی ہے، یا کتابیں اچھی ہیں، کتابیں اچھی ہے۔

صرفی اعتبار سے الفاظ کے مفاہیم میں جو فرق ہے وہ بہت اہم ہے۔ پہلا مفہوم جس کے لحاظ سے ''کتاب'' اور ''کتابیں'' دونوں ایک ہی معنی دیتے ہیں لہٰذا ایک ہی لفظ ہیں لفظیہ (Lexeme) کہلاتا ہے۔

دیگر الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ الفاظ ''کتاب'' اور ''کتابیں'' لفظیے ''کتاب'' کی مختلف اشکال ہیں۔ دوسرا مفہوم جس میں ''کتاب'' اور ''کتابیں'' والے الفاظ دو مختلف معانی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لفظی ہیئت (Word-Form) کہلاتا ہے۔

5.11 تحلیلی، ترکیبی زبانیں (Analytic and Synthetic Languages)

اس بنیاد پر کہ دنیا کی مختلف زبانیں صرفیوں کو جوڑ کر الفاظ کس طرح بناتی ہیں، زبانوں کو اسکیل (Scale) کے مخالف سروں پر رکھا جاتا ہے۔ ایک سرے پر تحلیلی زبانیں ہیں تو دوسرے سرے پر ترکیبی زبان۔ تحلیلی زبانیں وہ زبانیں ہیں جن میں تصرفی عمل بہت کم واقع ہوتا ہے اور معنی کی ادائیگی نحوی تراکیب کے ذریعے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے ان الفاظ پر غور کیجیے۔ ''اسے'' اور ''اس کو'' دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ مگر لفظ ''اسے''، ''اس'' اور ''ے'' سے بنا ہوا ہے اور یہ صرفی ترکیب ہے۔ جب کہ ''اس کو'' میں ''اس'' اور ''کو'' دونوں آزاد صرفیے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کا تعلق اتنا گہرا نہیں جتنا کہ ''اسے''، ''اس'' اور ''ے'' کے درمیان ہے۔ لہٰذا ''اس کو'' ایک نحوی ترکیب ہے۔ تحلیلی زبانوں میں الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ تر نحوی تراکیب میں ہی آتے ہیں نہ کہ صرفی ساختوں میں۔ معاصر ہند آریائی زبانیں تحلیلی زبانوں کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح معاصر انگریزی بھی ایک تحلیلی زبان ہے۔ درج بالا صورت حال کے برعکس ترکیبی زبانیں وہ زبانیں ہیں جن میں بہت زیادہ تصریفی عمل ہوتا ہے۔ ان زبانوں میں الفاظ کئی کئی پابند صرفیوں کے بنے ہوتے ہیں اور صرفیے ایک دوسرے کے ساتھ یوں جڑے ہوتے ہیں گویا وہ ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ انھیں الگ کرنا مشکل ہے۔

سنسکرت زبان ترکیبی زبان کی بہترین مثال ہے۔

زبانوں کے اسکیل (Scale) کے تحلیلی اور ترکیبی سروں کے درمیان دو اور قسم کی زبانیں پائی جاتی ہیں۔ وہ غیر ترکیبی

زبانیں(Isolating)اورامتزاجی زبانیں(Agglutinative)۔

5.11.1 تحلیلی زبانیں(Analytical Languages)

تحلیلی زبانوں میں انفرادی آزادصرفیوں پرمشتمل ہوتے ہیں۔قواعدی رشتے علاحدہ علاحدہ الفاظ کے ذریعے ظاہر کیے جاتے ہیں جب کہ مختلف تعلیقیوں کے ذریعے بھی قواعدی رشتے واضح کیے جاتے ہیں اور تعلیقیوں کی تعدادان زبانوں میں بہت کم ہے۔اگرالفاظ میں صرفی تبدیلی ہے وہ یا تو بہت کم ہے یا سرے سے ہے ہی نہیں۔الفاظ غیرمتصرف ہوتے ہیں۔قواعدی زمرے(مثلاً تعداد کا تصور، جنس کا تصور، حالت اسم کے حوالے سے)زمانہ،صورت، کیفیت،طوروغیرہ فعل کے حوالے سے)یا تو ترتیب الفاظ کے ذریعے واضح کیے جاتے ہیں یاالفاظ کے اضافے کے ذریعے۔مثلاً سوال بنانے کے لیےانگریزی میں فعل اوراسم کی ترتیب کوبدل دیاجاتا ہے۔یا جمع کے تصور کوواضح کرنے کے لیےالفاظ جیسے بہت،کئی لائے جاتے ہیں۔

تحلیلی زبانوں میں صرف کے مقابلے میں سیاق وسباق اورنحوزیادہ اہم ہے۔مشرقی ایشیائی زبانیں مثلاً چینی، ویتنامی تحلیلی زبانوں کی بہترین مثالیں ہیں۔انگریزی عامیانہ طورپرتحلیلی زبان ہے۔

5.11.2 ترکیبی زبانیں(Synthetic Languages)

ترکیبی زبانیں عموماً مادوں میں پابندصرفیے جوڑکرالفاظ بناتی ہیں۔پابندصرفیے الفاظ میں جڑنے کے بعداپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں اوراس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔یہ مادے کے ساتھ مدغم ہوجاتے یا آپس میں بھی مدغم ہوتے ہیں۔ترکیبی زبانوں میں تربیت الفاظ کی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ تحلیلی زبانوں میں ہے۔ایسااس لیے ہوتا ہے کیوں کہ یہاں قواعدی معلومات انفرادی الفاظ سے ظاہرہوتی ہیں جب کہ تحلیلی زبانوں میں یہ معلومات الفاظ کے نحو سے ظاہرہوتے ہیں۔اس کے علاوہ جملے کے مختلف اجزا میں تطابق(Concordance)یاداخلی حوالہ(Cross Reference)حددرجہ ہوتا ہے۔لہذا ترکیبی زبانوں میں نحو کے مقابلے میں صرف زیادہ اہم ہے۔جیسا کہ درج بالاسطور میں کہا گیا ہے کہ تحلیلی اورترکیبی زبانیں(Scale)کے دوسرے ہیں ان دونوں سروں کے درمیان زبانوں میں ترکیب کی نوعیت کوسامنے رکھتے ہوئے یعنی ترکیب میں مختلف صرفیوں کی واضح شناخت ہوسکتی ہے یانہیں؟ زبانوں کو مزید دوقسموں میں بانٹ سکتے ہیں۔ امتزاجی زبانیں (Agglutinative) اور ادغامی (Fusinal)ذیلی سطور میں ان کی وضاحت کی جاتی ہے۔

5.11.3 امتزاجی زبانیں

امتزاجی زبانوں میں الفاظ میں پابندصرفیے کی شکل میں تعلیقیے ایک دوسرے میں جڑے تو ہیں مگران صرفیوں کی شناخت بہ خوبی ہوسکتی ہے۔ایسااس لیے ہوتا ہے کہ کیوں کہ ہرصرفیہ ایک قواعدی معنی ظاہرکرتا ہےاوران صرفیوں کی سرحدیں آسانی سے پہچانی جاسکتی ہیں۔دیگرالفاظ میں لفظ میں جوتعلیقیے جڑتے ہیں انھیں انفرادی طور پر پہچانا جاسکتا ہے۔امتزاجی زبانوں میں لفظ میں بہت سے صرفیے ہوتے ہیں اوران کے اندرصرف کی باقاعدگی بہت ہوتی ہے۔

کورین (Korean)، ترکی (Turkish) اور جاپانی (Japanese) امتزاجی زبانوں کی بہترین مثالیں ہیں۔

5.11.4 ادغامی زبانیں

ان زبانوں میں لفظ میں جڑنے والے صرفیوں کی شناخت ممکن نہیں ہے۔ لفظ میں موجود نہ مادہ کی شناخت ہو سکتی ہے نہ ہی مدغم ہونے والے دوسرے صرفیے ایک دوسرے سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ صرفیے فوق قطع عناصر مثلاً تاکید، سر یا تان کے ساتھ بھی ظاہر کیے جاتے ہیں۔ یا مادے میں داخلی صوتی تبدیلی سے بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

بہت سی یوروپی۔ ہندی زبانیں مختلف درجات میں ادغامی زبانیں ہیں۔

5.12 Declension

اجزائے کلام یعنی مذکورہ اجزائے کلام کی بدلی ہوئی ہیئت کی گردان کو Declension کہا جاتا ہے۔ اسم، ضمیر اور صفت جب ہمہ قسم کے جملوں میں استعمال ہوتے ہیں تو اپنی شکل/ ہیئت بدل لیتے ہیں۔ مثلاً ان جملوں پر غور کیجیے۔ لڑکا آیا Vs لڑکے آئے۔ جمع والی تعداد میں ''لڑکا''، ''لڑکے'' میں بدل گیا۔ اسی طرح ''پیلا پھول'' Vs ''پیلے پھول'' ان جملوں میں صفت جمع والی تعداد میں ''پیلا'' سے ''پیلے'' میں تبدیل ہو رہی ہے۔ لہذا زبانوں میں خصوصی طور پر اجزائے کلام مثلاً اسم، ضمیر، صفت Determiners وغیرہ میں جب بھی تعداد، حالت اور جنس کے تعلیقیے جڑتے ہیں تو ان اجزائے کلام کی ہیئت میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اسے Declension کہا گیا ہے۔ ذیل میں اسم ''گھوڑا'' کا Declension دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

	واحد	جمع
حالت فاعلی	گھوڑا	گھوڑے
گھوڑے (نے)	گھوڑوں (نے)	
حالت مفعولی	گھوڑے (کو)	گھوڑوں (کو)
حالت اضافی	گھوڑے (کا)	گھوڑوں (کا)
حالت ندائی	گھوڑے!	گھوڑو!
حالت مکانی	گھوڑے (میں) تک	گھوڑوں (میں) تک

5.13 Conjugation

افعال مثلاً جانا، سونا، کھانا، پینا، دوڑنا وغیرہ جب ہمہ قسم کے جملوں میں استعمال ہوتے ہیں تو اپنی شکل/ ہیئت بدل لیتے ہیں۔ فعل کی اسی بدلی ہیئت کی گردان کو Conjugation کہا جاتا ہے۔

افعال مختلف قواعدی نظری (Grammatical Notions) مثلاً زمانہ، صورت، کیفیت، طور وغیرہ کے لیے تصریف کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ مختلف Arguments مثلاً فاعل، مفعول وغیرہ کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔

مثلاً احمد بازار جاتا ہے، مگر احمد اور سلیم بازار جاتے ہیں۔ نور جہاں بازار جاتی ہے وغیرہ۔ لہٰذا زبانوں میں فعل کی شکل میں قواعد کے نقطہ نظر سے جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اسے Conjugation کہا جاتا ہے۔ ذیل میں فعل ''جانا'' کا Conjugation دیا گیا ہے:

واحد	جمع
میں جاتا/ جاتی ہوں	ہم جاتے/ جاتی ہیں
تو جاتا/ جاتی ہے	تم (سب) جاتے ہو/تم (سب) جاتی ہو
تم جاتے/ جاتی ہو	آپ جاتے ہیں/ آپ جاتی ہیں
وہ جاتا ہے/ جاتی ہے	وہ جاتے ہیں/ جاتی ہیں
یہ جاتا ہے/ یہ جاتی ہے	یہ جاتے ہیں/ یہ جاتی ہیں

غیر ترکیبی زبانیں (Isolating) وہ زبانیں جن کے یہاں صرف یا تو برائے نام ہوتا ہے یا ہوتا ہی نہیں ہے۔ چینی زبان غیر ترکیبی زبان کی بہترین مثال ہے۔

اس کے برعکس امتزاجی زبانیں وہ زبانیں ہیں جن کے الفاظ ایسے صرفیوں سے بند ہوتے ہیں جنھیں آسانی سے علاحدہ کیا جاسکتا ہے۔ ترکیبی زبان امتزاجی زبانوں کی بہترین مثال ہے۔

جملے میں استعمال کے بعد کسی بھی جزو کلام کی شکل میں زبان کی قواعد کے مطابق جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اسے ''تصریف'' کہا جاتا ہے۔

درج بالا صورت حال اپنی جگہ مستند اور صحیح ہے۔ مگر بہت سے ماہرین نے ''اسم'' اور ''صفت'' میں جملوں میں استعمال کے بعد جو تبدیلی واقع ہوتی ہے اسے Declension سے بھی موسوم کیا ہے۔

مندرجہ ذیل اردو لفظ ''گھوڑا'' کے Declension کی گردان دی گئی ہے:

واحد	جمع
گھوڑا دوڑا	گھوڑے دوڑے
گھوڑے نے لات ماری	گھوڑوں نے لات ماری

5.14 مادہ (Root) اور ساق (Stem)

کسی لفظ کی بنیادی لفظی اکائی کو ''مادہ'' کہا جاتا ہے۔ مادہ اپنے اندر اہم ترین معنیاتی سیاقات (Semantic Context) رکھتا ہے۔ مادہ کو دیگر اجزا میں مزید توڑا نہیں جاسکتا۔ مثلاً لفظ ''غیر قانونی'' کو لیجیے۔ اس لفظ کا مادہ ''قانون'' ہے۔

سابقہ ''غیر'' اور لاحقہ ''ی'' اس میں اضافے ہیں۔ اسی طرح لفظ ''کلبلاہٹ'' کا مادہ ''کلبلا'' ہے۔ لفظ ''جھلملانا'' کا مادہ ''جھلمل'' ہے لفظ ''بے نمازی'' کا مادہ ''نماز'' ہے۔ لفظ ''مقتول'' کا مادہ ''قتل'' ہے۔ اسی طرح ''پڑھا'' اور ''پڑھوا'' کا مادہ ''پڑھ'' ہے۔

مادہ آزاد یا پابند صرفیے پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ Affixation اور Compounds بنانے میں مادے ضروری ہوتے ہیں۔

کسی لفظ کا ''مادہ'' معنی کی اکائی بھی ہے۔ تحریر میں معنی کی اکائی کو لفظ کی طرح ہی ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''رواداری'' میں مادہ ''روا'' ہے ''دار'' اور ''ی'' دونوں Affixes ہیں۔ اسی طرح ''بے فکری'' میں مادہ ''فکر'' ہے ''بے'' سابقہ اور ''ی'' لاحقہ ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے الفاظ ''رواداری'' اور ''بے فکری'' دونوں بالترتیب ''روا'' اور ''فکر'' نامی مادوں سے سابقوں اور لاحقوں کے ذریعے مشتق کیے گئے ہیں۔ ان تعلیقیوں کی وجہ سے مادے کی شکل وصورت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عموماً اردو ''مادوں'' میں تعلیقیوں کے جڑنے سے ان کی شکل وصورت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لہٰذا مادوں اور ان سے بننے والے الفاظ کے درمیان مماثلت ہوتی ہے۔

درج بالا سطور میں آیا ہے کہ لفظ ''کلام کی اکائی'' ہے تو مادہ ''معنی کی اکائی'' ہے۔ سامی زبان میں ان دونوں کا فرق کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ان زبانوں میں مادہ سے جب الفاظ بنائے جاتے ہیں تو مادہ کئی شکلیں اختیار کرتا ہے۔ نیز یہ کہ یہاں مادے محض مصمتوں کا بنا ہوتا ہے۔ ان مصمتوں کے درمیان مصوتوں کے اضافے سے کئی الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی مادہ عظم (یعنی ع، ظ، م) پر غور کیجیے۔ اس مادے سے عربی میں بہت سے الفاظ مشتق کیے جاتے ہیں۔ مثلاً عظیم، اعظم، عظمت، معظم وغیرہ۔

کئی باریوں بھی ہوتا ہے کہ بنیادی لفظ کی ہیئت سے مشتق شدہ لفظ بھی بہ طور ساق استعمال ہوتا ہے مثال کے طور پر ان الفاظ کو دیکھیے۔ پی۔ پلا، پلوا، ان تینوں میں تصریفی تعلیقیے جڑ سکتے ہیں۔ مثلاً پیتا، پلاتا، پلواتا، تینوں میں تصریفی لاحقہ تا جڑا ہے۔ لہٰذا پی، پلا، پلوا تینوں ساقیں ہیں جب کہ پلا اور پلوا کی بنیادی لفظی ہیئت پی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ عموماً اردو ''ساقوں'' میں تصریفی تعلیقیوں کے جڑ جانے سے ان کی شکل وصورت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لہٰذا ساقوں اور ان سے بننے والے الفاظ کے درمیان مطابقت ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ''ساق'' اور اس سے بننے والے الفاظ کے درمیان مطابقت ہی نہ ہو۔ مثلاً یہ الفاظ ملاحظہ ہوں ''جا''، ''گیا''، ''گئی''، ''گئے''، ''گئیں'' یہاں ''ساق''، ''جا'' اور اس سے بننے والے الفاظ میں مطابقت نہیں ہے۔

5.15 غیر متصرف لفظ (Uninflected Word)

زبان کے صرف کے حوالے سے غیر متصرف لفظ وہ ہے جو تصریفی علامات مثلاً تعلیقیے، مصمتی تدریج (Condomant Gradation) وغیرہ سے بری ہو۔ عموماً لفظ کی ''ساق'' غیر متصرف ہوتی ہے۔

اردو زبان کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ حروف عطف، حروف فجائیہ اور حروف تخصیص غیر متغیر الفاظ ہیں اور غیر متصرف الفاظ ہیں۔ عموماً ان میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ ہمیشہ اپنی غیر متصرف شکل میں آتے ہیں۔

مختلف زبانوں، مختلف اجزائے کلام، مختلف تصورات کے لیے تصریف کا عمل کرتے ہیں (مثلاً اسما تعداد، جنس اور حالت کے لیے اور افعال زمانہ صورت اور کیفیت کے لیے) مگر مندارن چینی زبان (Mandarin Chinese) ایک ایسی زبان ہے جس میں اسما اور افعال قطعی تصریف نہیں کرتے۔ اس زبان میں تعداد اور زمانہ جیسے نظری تصور Notions سرے سے غائب ہیں۔

5.16 خلاصہ

مارفیمیات زبان کے مطالعے کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اس کے تحت لفظوں کی ساخت کے طریقوں یا تشکیل سے بحث کی جاتی ہے۔ زبان کی مارفیمیات سے مراد وہ ساختیں ہیں جن میں زبان کے اجزا بندھے ہوئے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مارفیمیات میں لفظوں اور ان کے اجزا کی ساخت شامل ہوتی ہے۔ جب کہ نحو میں فقروں کی ساختیں شامل ہوتی ہیں۔ عام طور پر مارفیمیاتی ساختیں نحوی ساختوں کے مقابلے میں بہت پے چیدہ ہوتی ہیں۔ مارفیمیات میں تغیرات کی صورتیں کثرت سے اور بے قاعدہ بھی ہوتی ہیں۔ خاص خاص تشکیلیں خاص خاص اجزا اور ترکیبوں سے تعلق رکھتی ہیں اور اجزا کی ترتیب ہمیشہ سختی کے ساتھ برقرار رکھی جاتی ہے۔

مارفیمیات میں کسی زبان کے مادوں سے مقررہ قاعدوں یا مستشنیات کے مطابق مارفیموں کو جوڑ کر نئے روپ بنانے کی ساری صورتیں اور تصریف کے طریقے داخل ہیں۔ چناں چہ اس اکائی میں اولاً ہم نے صرف کی تعریف اور صرفی اعمال سے واقفیت حاصل کی۔ صارف ایلو مارف اور مارفیم کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اشتقاق اور تصریف کے مفہوم سے آگاہی حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں اشتقاق اور تصریف نیز گردان کی وضاحت کی گئی۔ لفظ اور مارفیم لفظیہ اور لفظی ہیئت پر گفتگو کی گئی۔ اس کے بعد تحلیلی، ترکیبی، امتزاجی اور ادغامی زبانوں کی تعریف کی گئی اور ان کے فرق کو واضح کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ Decleusion اور Conjugation پر روشنی ڈالی گئی۔ پھر مادہ اور ساق و نیز غیر متصرف الفاظ کی وضاحت کی گئی۔ اس طرح اس اکائی سے ہم نے صرف کے اہم مسائل سے متعلق معلومات حاصل کیں۔

5.17 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ مارفیمیات کے اہم مسائل پر روشنی ڈالیے۔

2۔ ترکیبی، تحلیلی، امتزاجی اور ادغامی زبانوں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

3۔ صرف کی تعریف معہ مثالوں کے ذریعہ واضح کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ صرفی اعمال کی وضاحت کیجیے۔

2۔ مادہ اور ساق اور غیر متصرف الفاظ کے بارے میں اپنی معلومات کی اظہار کیجیے۔

3۔ اشتقاق اور تصریف کی وضاحت کیجیے۔

5.18 سفارش کردہ کتابیں

1۔ عام لسانیات : پروفیسر گیان چند جین

2۔ اردو صرف و نحو : اقتدار حسین

اکائی 6 نحو

ساخت

6.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں نحو کی تعریف اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ونیز نحو کی تعریف کرتے ہوئے مختلف ماہرین زبان کے چند اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور آخر میں نحوی اصطلاحات اور نحوی طریقوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نحو کی تعریف اور اس کی اہمیت بیان کر سکیں
- نحو کے بنیادی اصطلاحات کو واضح کر سکیں اور
- نحوی طریقوں سے متعلق اہم معلومات فراہم کر سکیں۔

6.1 تمہید

کسی بھی زبان میں الفاظ کی ادائیگی کا طریقہ یکسر مختلف اور بہت ہی خاص ہوتا ہے۔ یہ طریقہ بعض دفعہ مشترک ہوتے ہیں اور دوسری زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جب کہ بعض غیر مشترک جو صرف ایک ہی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ انھیں طریقوں کے جزئیات کا نام ''نحو'' ہے۔

لہذا اس اکائی میں نحو کی تعریف اور اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے ونیز علم زبان میں نحو کی اہمیت پر تفصیلی نگاہ ڈالی گئی ہے۔

6.2 نحو کی تعریف

''نحو وہ علم ہے جس سے کلموں کی ترکیب اور جدا کرنے کا قاعدہ معلوم ہو۔''

ڈاکٹر اقتدار حسین خان کے مطابق:

''ایسی تراکیب کا تجزیہ اور مطالعہ جن میں صرف آزاد روپ شامل ہوں اس کو نحو کہتے ہیں۔ نحو کی تعریف ہم یوں بھی کر سکتے ہیں کہ یہ اصولوں کا مطالعہ ہے جن کے مطابق ہم مختلف تراکیب کو زیادہ بڑی تراکیب میں ترتیب دیتے ہیں۔ یہ بڑی تراکیب دو الفاظ

سے لے کر پورے جملے تک کی ہو سکتی ہے۔''

یعنی کہ نحو صرف آزادرویوں یا الفاظ کے جوڑنے کے اصولوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ چاہے یہ ایک مارفیم کے ہوں یا ایک سے زیادہ مارفیم کے بنے ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو جوڑ الفاظ کے بنائے جاتے ہیں وہ دو الفاظ سے لے کر ایک بڑے جملہ تک کے ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر ''اچھا لڑکا'' دو الفاظ کا جوڑ ہے جو ایک نحوی ترکیب کہلاتی ہے۔ اس طرح ''وہ اچھا لڑکا ہے'' یہ ایک جملہ ہے۔ یہ بھی ایک نحوی ترکیب ہی ہے کیوں کہ اس میں الفاظ کا یا آزادرویوں کا جوڑ ہے۔ اس مناسبت سے بڑے اور پیچیدہ جملے بھی ترکیب کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ''وہ لڑکا جو کل آپ سے ملا تھا اچھا لڑکا ہے'' یہ بھی ایک نحوی ترکیب ہے۔

لہٰذا یہ تمام تراکیب یا جوڑ نحوی ترکیب ہی ہیں اور ان کا مطالعہ ہم نحو میں کریں گے۔ نحو میں ان اصولوں کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے کہ جن کے مطابق زبان میں الفاظ یا آزادرویوں کو بڑی تراکیب میں تریب دے کر استعمال کیا جاتا ہے۔

نحو کی تعریف کرتے ہوئے گلیسن یوں رقم طراز ہیں:

> **''جو ترکیبیں تصریف اور اشتقاق کے عمل سے بنتی ہیں انھیں اور بڑی بندشوں میں ترتیب دینے کے اصولوں کو نحو کہتے ہیں۔''**

ہاکیٹ نحو کی تعریف اس طرح سے کرتے ہیں:

> **''نحو میں وہ طریقے شامل ہیں جن سے کلام میں الفاظ اور فوق قطعاتی مارفیموں کو ایک دوسرے کے رشتہ میں ترتیب دیا جاتا ہے۔''**

ہال کے مطابق نحو:

> **''نحو ان طریقوں کا مطالعہ ہے جن میں الفاظ استعمال ہوتے ہیں جب کہ مارفیمیات ان طریقوں کا مطالعہ ہے جن سے لفظ بنتے ہیں۔''**

یعنی عام فہم انداز میں مارفیمیات لفظ کی ساخت کا مطالعہ کرتی ہے اور نحو لفظ سے بڑی ترکیبوں میں لفظوں کی ترتیب کا۔ لیکن ان دونوں کے حدود بعض مقامات پر مبہم ہوتی ہے اور بعض مقامات پر ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو جاتی ہیں۔ ایسے مقامات دو طرح کے ہوتے ہیں مرکب لفظ اور فقروی لفظ وغیرہ۔

6.3 نحو اور مارفولوجی میں فرق

ان دونوں میں تعریف کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ مارفولوجی میں ہم لفظ کی سطح تک زبان کا مطالعہ کر سکتے ہیں جب کہ نحو میں دو یا دو سے زائد الفاظ (جملے تک) کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

مارفولوجی میں کسی زبان میں الفاظ کی ساخت، ان میں مارفیم کی ترتیب اور مارفیم کی قسموں وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

جب کہ مختلف الفاظ کن اصولوں کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترکیب میں اور پورے جملہ میں استعمال ہوتے ہیں اس کا مطالعہ نحو میں ہوتا ہے۔

اگر ہم کسی لفظ کا تجزیہ کریں تو ہمیں ایک مارفیم یا ایک سے زیادہ مارفیم مل سکتے ہیں۔مثال کے طور پر کرسی ایک لفظ ہے اور ایک مارفیم بھی۔لیکن کرسیاں ایک لفظ تو ہے لیکن یہ ایک مارفیم نہیں کیوں کہ اس میں دو مارفیم ''کرسی'' اور ''اں'' ہیں۔

''کرسیاں'' ایک مارفولوجیکل ترکیب ہے کیوں کہ اس کے تجزیہ پر ہمیں جو مارفیم ملتے ہیں ان میں سے ایک پابند مارفیم ہے۔ایک نحوی ترکیب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کے جز و متصل میں سے بھی پابند اکائی نہیں ہوگی۔اس لیے مثال کے طور پر ''اچھی کرسیاں'' ایک نحوی ترکیب ہے کیوں کہ اس کے دو متصل ''اچھی'' اور ''کرسیاں'' میں سے کوئی بھی پابند مارفیم نہیں ہے۔

6.4 نحو کی بنیادی اصطلاحات

نحو میں چند ایسی اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں جن کا استعمال نحو میں ناگزیر ہے۔یہ اصطلاحیں نحو کے لیے بنیادی اوزار کے حامل ہیں۔ان میں ترکیب، جزو، جز و متصل وغیرہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

6.4.1 ترکیب اور اس کی قسمیں

الفاظ کے کسی بھی اہم گروپ یا گروہ کو ترکیب کہتے ہیں۔اس طرح ایک پورا جملہ بھی ایک ترکیب ہے اور صرف دو مارفیم کا بھی گروہ ایک ترکیب کہلاتا ہے۔مثال کے طور پر یہ دیکھیے ''وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا میرا دوست ہے۔''

اس میں موٹا آدمی، وہ موٹا آدمی، جو کل آپ سے ملا تھا، میرا دوست وغیرہ سب ترکیبیں ہی ہیں اس طرح پورا ایک جملہ بھی ایک ترکیب ہے لیکن ''تھا''، ''میرا'' ایک ترکیب نہیں ہے۔حالاں کہ جملہ میں یہ دونوں الفاظ بالکل قریب بولے گئے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا کوئی قریبی قواعدی رشتہ نہیں ہے اور یہ ایک اہم گروہ نہیں بناتے ہیں۔

لہٰذا ترکیب کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس میں کم سے کم دو مارفیم یا الفاظ ہوں اور دوسرے یہ دونوں یا جتنے بھی ہوں آپس میں مل کر ایک اہم گروہ بناتے ہیں۔

اگر ترکیب میں دو ایسے مارفیم ہیں جن میں سے ایک پابند ہے تو یہ ترکیب نحوی نہ ہو کر مارفولوجیکل ترکیب ہوگی۔مثلاً کرسیاں میں دو مارفیم ہیں لیکن دو الفاظ نہیں اور ان میں سے ایک پابند مارفیم ہے اس لیے یہ ایک مارفولوجیکل ترکیب ہے نہ کہ نحوی۔لیکن اس کے باوصف اگر دو الفاظ الگ الگ ہوں جیسے ''کرسیوں پر''، ''موٹا آدمی'' تو یہ نحوی ترکیبیں ہیں۔

کسی ترکیبی تجزیہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون کونسے الفاظ کس جملہ میں ایک دوسرے سے قواعدی اعتبار سے زیادہ قریب ہیں (اگر چہ وہ ایک دوسرے سے نزدیک بولے گئے ہوں) اوپر کے جملہ میں ''تھا میرا'' قریب ہوتے ہوئے بھی ترکیب نہیں ہیں اور آدمی اور دوست دور ہوتے ہوئے بھی قریب ہیں۔چوں کہ مارفیموں یا لفظوں کے بامعنی گروہ کو ترکیب کہتے ہیں۔لیکن محض ایک مارفیم کی ترکیب نہیں ہوسکتی۔

شمول کار(Constitute)

یہ وہ مارفیم یا ترکیب ہے جس میں ایک سے زائد لفظ شامل ہوں یہ خود کسی دوسری بڑی ترکیب کی مشمول ہو سکتی ہے۔

مشمول(Constituent)

یہ وہ ترکیب ہے جو کسی بڑی ترکیب کا جزو ہو۔ یہ مشمول دوسرے شمول کاروں کے تعلق سے شمول کار ہو سکتے ہیں۔

قریبی مشمول(Immediate Constituents)

نحو میں کسی شمول کار کا تجزیہ دو دو مشمولوں میں کیا جاتا ہے۔ایک شمول کار کو اول ان دو قریبی مشمولوں میں بانٹا جاتا ہے جو اس زبان کی قواعد کے تقاضوں سے فطری تقسیم کہلائے گی۔ پھر ہر قریبی مشمول کو اس کے قریبی مشمولوں سے پھاڑا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مفرد مارفیم تک پہنچ جاتے ہیں اسے قریبی مشمولی تجزیہ کہتے ہیں۔

قریبی مشمولی تجزیہ

یہ نحو میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس سے ہر جملہ یا فقرے کی ساخت آئینہ ہو جاتی ہے۔

متعدد قریبی مشمول

قریبی مشمولات میں عموماً دو دو کی تقسیم کی جاتی ہے لیکن بسا اوقات تین بلکہ اس سے بھی زیادہ اجزا میں تقسیم کرنی پڑتی ہے۔

غیر مسلسل قریبی مشمول

کبھی کبھی قریبی مشمول کے ذیلی اجزا مسلسل نہیں ہوتے بلکہ ان کے بیچ کوئی دوسرا مشمول دخل در معقولات کر دیتا ہے۔

ہم رو قریبی مشمول

کلام میں سر درجے اور خط اختتامی یعنی سر لہر بھی ہوتی ہے۔ مکمل تجزیہ میں انھیں بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ سر لہر کا دکھانا قدرے مشکل ہوتا ہے اس لیے عام طور پر اسے تجزیہ میں حذف کر دیا جاتا ہے۔

روپ گروہ

ایک نحوی شمول کار ترکیب میں جو مشمول ہوتے ہیں ان میں سے ہر مشمول کے عوض بدل کر بعض دوسرے الفاظ رکھے جا سکتے ہیں اور بعض نہیں رکھے جا سکتے۔ جو الفاظ مبادلے میں آ سکتے ہیں وہ مشمول کے روپ گروہ یا مشمول گروہ کہلاتی ہیں۔

ترکیبی سانچے

مختلف روپ گروہوں کے ارکان کو جس طرح ملا کر ایک ترکیب تیار کی جاتی ہے اسے ترکیبی سانچہ کہتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف ترکیبی سانچے ہوتے ہیں۔

ترتیب(Order)

لفظ میں مختلف مارفیموں کی ترتیب مقرر ہوتی ہے۔ترکیبوں یعنی فقرہ یا جملہ میں بھی لفظ کے محل یا ترتیب کی اہمیت ہے۔ ترتیب طرح طرح کی ہوتی ہے لیکن وہ کسی اصول کے تحت ہی ہوتی ہیں۔ ہر لفظ کو ایک دوسرے سے نہیں بدلا جاسکتا۔

جملہ(Sentence)

لسانیات میں جملہ کا تصور قواعدی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔کوئی قواعدی روپ جو کسی بڑی قواعدی ترکیب میں مشمول نہیں ہے جملہ کہلاتا ہے۔

لسانیات میں جملہ سے ملتی جلتی دو اور اصطلاحیں موجود ہیں۔(i) کلام،(ii) میکروسگمنٹ۔ یہ دراصل ہاکیٹ کی اصطلاح ہے۔

کلام(Utterance)

کلام اکثر ایک جملہ پر مشتمل ہوتی ہے لیکن دوسری صورتوں میں ایک سے زیادہ جملوں کو بھی محیط کرتی ہے۔

میکروسگمنٹ(Macro Segment)

تقریر کا جتنا جزو ایک سرلہر کے تحت بولا جائے میکروسگمنٹ ہے۔

فقرے(Phrase)

لسانیات میں اصطلاحوں کے استعمال کی کثرت نہایت پریشان کن ہے کیوں کہ ایک اصطلاح کو ایک سے زائد مصنفین اپنے اپنے انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ترکیب اور جملہ کی حدتک تو بیشتر لکھنے والوں میں اتفاق پایا جاتا ہے۔لیکن فقرہ کے لیے بہت مشکل ہوتی ہے۔

ترکیب(Construction)

مارفیموں یا لفظوں کے کسی بامعنی گروہ کو ترکیب کہتے ہیں۔ یہ دو یا دو سے زیادہ مارفیموں پر مشتمل ہوتی ہے۔

ہر ترکیب یا فقرہ میں کم از کم دو آزاد روپ شامل ہوتے ہیں ان کی نوعیت کی بنا پر انھیں دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔(i) دروں مرکزی اور(ii) بروں مرکزی۔

دروں مرکزی(Endocentric)

جس ترکیب کے قریبی مشمولوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ مشمول کارکے روپ گروہ میں ہوں۔

دروں مرکزی ترکیبیں دو طرح کی ہوتی ہیں(i) ترکیب عطفی اور(ii) ترکیب توصیفی۔

بروں مرکزی (Exocentric)

بروں مرکزی ترکیبیں تعداد میں سب ہی زبانوں میں بہت زیادہ قسموں کی ہوتی ہیں اور ان کی درجہ بندی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن جو ترکیبیں عام ہیں ان کا احاطہ تین بڑی قسموں میں کیا جا سکتا ہے۔ (i) امری ترکیب (Direction) (ii) ربطی ترکیب (Connective) اور (iii) خبری۔

6.4.2 جزو

ایک ''جزو'' ایک ایسا لفظ یا ایسی ترکیب ہے جو کسی بڑی ترکیب کا ایک حصہ ہو۔ مثلاً اوپر کے جملہ میں ''وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا میرا دوست ہے'' میں سارے الفاظ جزو میں ہی ہیں کیوں کہ وہ بڑی ترکیب یعنی جملہ میں ایک حصہ ہیں۔ اس طرح ''موٹا آدمی''، ''میرا دوست'' وغیرہ بھی جز ہیں لیکن ''تھا''، ''میرا'' یا ''آدمی جو'' یہ جزو نہیں ہیں کیوں کہ وہ خود کوئی ترکیب نہیں ہیں اسی طرح یہ پورا جملہ بھی ایک جزو نہیں ہے کیوں کہ یہ کسی دوسری بڑی ترکیب کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ترکیب اور جزو دونوں ہی قواعدی طور سے اہم ہیں یعنی وہ نہ صرف بامعنی ہوں بلکہ ان کے اجزا ایک دوسرے سے منسلک ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترکیب میں ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ اجزا (مارفیم یا الفاظ) ہوتے ہیں جب کہ جزو صرف ایک مارفیم یا ایک لفظ بھی ہو سکتا ہے۔

6.4.3 جزو متصل

نحو میں جزو متصل کا تصور نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ نحو میں کسی بھی مطالعہ اور تحقیقات کافی حد تک اس بات پر انحصار کرتی ہے کہ کس ترکیب یا جملہ کے اجزائے متصل کیا ہیں وغیرہ۔

جزو متصل ان دو پابند چیزوں میں سے ایک ہے جن سے کوئی ترکیب بالواسطہ بنی ہو۔ مثلاً اوپر جو مثال دی گئی ہے ''وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا میرا دوست ہے'' اس میں دو جزو متصل ہیں وہ یہ ہیں ''وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا''، ''میرا دوست ہے'' اس کے علاوہ ''موٹا آدمی'' ایک جزو متصل ہے۔ ''وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا'' لیکن ''تھا میرا'' یا ''ملا تھا میرا'' کوئی جزو متصل نہیں ہیں کیوں کہ یہ کوئی بھی ترکیب کو بالواسطہ نہیں بتاتے ہیں۔

اس تعریف سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی ترکیب کے دو جزو متصل ہوتے ہیں یعنی ان دو سے مل کر کوئی ترکیب کو بنایا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی تین جزو متصل ہو سکتے ہیں کیوں کہ بعض وقت دو میں تقسیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

6.5 جزو متصل کی اہمیت

نحو کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے جزو متصل کا معلوم کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ جزو متصل کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل اصولوں کا جاننا نہایت ضروری ہے۔

6.5.1 جز ومتصل کی شناخت

جز ومتصل کی شناخت کے لیے چند بنیادی اصولوں کا خاص طور سے خیال رکھیں۔ جس میں سے ایک اصول یہ ہے کہ بڑی ترکیب (یا جملہ) کے اندر چھوٹی ترکیبوں کو پہچانا جائے۔ الفاظ کے گروہ ساخت کے لحاظ سے ایک لفظ کے برابر ہوتے ہیں مثلاً ''وہ''، ''اس کی''، ''اس کے لڑکے کی''، ''اس کے بھائی کے لڑکے کی'' وغیرہ۔

یہ سب ساخت کے بجائے ایک دوسرے کے بجائے استعمال ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ دوسرا اصول یہ ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ استعمال کی آزادی رکھتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ استعمال کی آزادی اور قائم مقامی دونوں ایک ہی اصول کے دو پہلو ہیں۔

6.5.2 عمودی ساخت

جملہ یا ترکیبیں محض الفاظ کو جوڑنے کا کام نہیں کرتی بلکہ الفاظ کے گروہ درگروہ جملہ میں کام کرتے ہیں۔ زبان کے بولنے والے جب کسی جملہ کو سنتے ہیں تو وہ اس کو صرف خطی ترتیب میں نہیں لیتے بلکہ اس کو گروپ اور گیرائی میں لیتے ہیں۔ جب ہم کسی جملہ یا ترتیب کو جز ومتصل میں تجزیہ کرتے ہیں تو ہم اس جملہ کے اندر مختلف مارفیم اور الفاظ کی ترتیب اور گروہ بندی کا جائزہ لے سکتے ہیں اور یہ تجزیہ اس جملہ کی عمودی ساخت کو ظاہر کرتا ہے اس طرح اس تجزیہ کو ہم عمودی ساخت یا جز ومتصل ساخت کہہ سکتے ہیں۔

6.5.3 مبہم ساخت

بعض ترکیبیں مبہم ہوتی ہیں۔ ان کے ایک سے زائد معنی ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے دو یا دو سے زیادہ مختلف جز ومتصل ہوسکتے ہیں۔ بعض مبہم جملے اور فقرے اپنے سیاق وسباق کی وجہ سے صاف ہوجاتے ہیں اور ان کے جز وآسانی سے پہچانے جاسکتے ہیں۔

6.5.4 آخری جز و

وہ سب ہی چھوٹی سے چھوٹی اکائیاں جن سے مل کر کوئی ترکیب یا جملہ بنتا ہے ان کو آخری جز و کہتے ہیں یعنی کہ جب ہم کسی جملہ کی جز ومتصل کا مکمل تجزیہ کریں تو آخری لائن یا قطار میں چھوٹے سے چھوٹا جز و حاصل ہوگا، ان کو آخری جز و کہتے ہیں۔

6.5.5 ہم وقت جز و

حالات میں دو جملوں کا فرق صرف فوق قطعی خصوصیات ہی سے ظاہر کیا جاسکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں ہوتا۔

6.5.6 نشان گر

کچھ لسانی روپ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی جزو کا حصہ نہیں ہوتے بلکہ دو جزو کو جوڑنے کا کام کرتے ہیں۔اس لیے ایسے الفاظ یا روپوں کو کسی بھی جزو میں شامل نہیں کیا کرتے بلکہ کسی خاص نشانہ کے ذریعہ ہم ان کو الگ رکھتے ہیں جن کو نشان گر کہتے ہیں۔

6.5.7 غیر مسلسل جزو

بعض وقت الفاظ کی ترتیب جملہ میں ایسی ہوتی ہے کہ کوئی جزو غیر مسلسل بھی ہوسکتا ہے یعنی کہ جملوں میں سے جو ایک جزو متصل ہیں وہ غیر مسلسل جزو کہلائیں گے۔

6.6 نحوی طریقے

اردو اور انگریزی میں جس طریقہ کو سب سے آسان، عام اور کمزور قسم کا نحوی طریقہ کہتے ہیں وہ ہے ترتیب الفاظ یا روپ درجہ کی رکنیت۔

6.6.1 رابطہ بہ ذریعہ انتخاب

ایک جزو درجہ یا روپ درجہ کی سب ہی رکن جملہ میں ایک ہی خانہ استعمال کرتے ہیں یعنی ایک طرح استعمال ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر ہم کہیں'' کالا کتا'' تو ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک ایسی ترکیب ہے جس کے دو جزو متصل ہیں اور وہ ہے'' کالا کتا''۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں کیوں کہ زبان میں یہ الفاظ اسی طرح ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ پہلا لفظ توصیفی ہے۔فقرے یا جملے میں ترتیب الفاظ ہوتی ہے۔اس قسم کے رابطہ کو رابطہ بہ ذریعہ انتخاب کہتے ہیں۔اس کو رابطہ بہ ذریعہ ترتیب الفاظ بھی کہتے ہیں۔

6.6.2 رابطہ بہ ذریعہ سیاق وسباق

بعض اوقات انتخابی رابطہ معنی میں ابہام پیدا کر دیتا ہے اور سیاق وسباق کی مدد لینی پڑتی ہے مثال کے طور پر'' کھانا ہے'' یہ ایک ایسا جملہ ہے جس میں کھانا اسم بھی ہوسکتا ہے اور فعل بھی۔اب اگر یہ بڑے جملہ کا حصہ ہے تو اس فقرہ کا ابہام دور ہوسکتا ہے ہمیں وہی کھانا ہے اس طرح اس جملہ میں کھانا ایک فعل ہے لیکن اگر یہ جملہ'' یہ کھانا اچھا ہے'' تو'' کھانا'' یہاں اسم کی صورت اختیار کرے گا۔اس طرح سیاق معنی سمجھنے میں آسانی پیدا کرتا ہے۔اس قسم کے رابطہ کو رابطہ بہ ذریعہ سیاق کہتے ہیں۔

6.6.3 رابطہ بہ ذریعہ نشان گر

مختلف زبانوں میں الفاظ کا ایک چھوٹا اور محدود ذخیرہ ایسا ہوتا ہے جو معنی تو نہیں رکھتا لیکن جن کا کام قواعدی ساخت کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ایسے الفاظ کو تغافلی الفاظ یا ساختی نشان گر کہتے ہیں۔مثال کے طور پر اردو میں ''اور''، ''یا'' وغیرہ نشان گر ہیں۔ ناخالص نشان گر بھی ہوتے ہیں مثال کے طور پر'' بلکہ''، ''لیکن''، ''مگر'' وغیرہ یہ صرف مختلف جزو اور الفاظ کو جوڑنے کا کام انجام دیتے ہیں اور معنی میں ان کا کوئی خاص کردار نہیں ہوتا لہذا اس طرح کے رابطہ کو رابطہ بذریعہ نشان گر کہتے ہیں۔لہذا یہ تمام کے تمام اقسام تقریباً ہر زبان میں موجود ہوتے ہیں ان کے علاوہ بہت سی زبانوں میں تصریفی طریقہ سے بھی رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

6.6.4 تصریفی طریقہ رابطہ

تصریفی طریقہ رابطہ کئی قسم کے ہوتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

6.6.4.1 مطابقت

مطابقت نحوی رابطہ کا وہ تصریفی طریقہ ہے جس میں ایک لفظ اپنی شکل، جملہ میں موجود کسی دوسرے لفظ کی شکل کے مطابق اختیار کرتا ہے۔یعنی ایک لفظ کا روپ تصریفی، دوسرے لفظ کے روپ کے مطابق ہوگا۔انگریزی میں اشاری ضمیریں اور اسم میں مطابقت پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ انگریزی میں فاعلی اسم اور خبری فعل میں بھی مطابقت ہوتی ہے لیکن یہ مطابقت صرف زمانہ حال ہی میں پائی جاتی ہے۔اردو میں بھی یہ مطابقت پائی جاتی ہے اور فعل کا روپ اسم کی واحد یا جمع کے صیغہ پر منحصر ہوتی ہے۔ اردو میں یہ مطابقت صفت اسم کی ترکیب میں بھی پائی جاتی ہے اور یہ مطابقت نہ صرف تعداد بلکہ جنس کی بھی ہوتی ہے۔اس کی مطابقت دوسری زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے جس میں لاطینی اور عبرانی وغیرہ اہم ہیں۔

6.6.4.2 متابعت

بہت ساری زبانوں میں یہ تصریفی، نحوی طریقہ استعمال ہوتا ہے۔یہ طریقہ بیرون مرکزی ترکیبوں کے جزو کے رشتہ کو ظاہر کرتے ہیں۔جب اس میں اسم ہو تو ان کو حالت کہتے ہیں۔حالت کے لحاظ سے اسم جملہ میں اپنی جگہ پاتا ہے۔مختلف زبانوں میں اسم کی حالت کی مختلف تعداد ہوتی ہیں۔کم از کم اس کی تعداد دو بتائی گئی ہے۔اردو میں ایک طرح سے نظام حالت اور تفاعلی الفاظ دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔دو حالتیں قطعی طور سے عیاں ہیں۔(i) فاعلی حالت، (ii) غیر فاعلی حالت۔

6.6.4.3 داخلی حوالہ

نحوی طریقہ کی یہ قسم درون مرکزی ترکیبوں اور چند بیرون مرکزی ترکیبوں میں پائی جاتی ہے۔اردو میں فعل اور فاعل، مفعول میں داخلی حوالہ کی مدد سے رشتہ قائم ہوتا ہے۔مثلاً ''میں نے آم کھایا''، ''میں نے روٹی کھائی''۔یہ دو جملوں میں فعل اور

مفعول میں داخلی حوالہ سے رشتہ ہے۔ چوں کہ آم اور روٹی کی قواعدی جنس مرکز و مونث ہیں اس لیے ''کھایا'' اور ''کھائی'' استعمال ہوا ہے۔

6.7 تشکیل کا نظریہ

روایتی قواعد سے ناآسودگی نے تجزیاتی لسانیات کو جنم دیا۔ اس میں اول اول صوتیات پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ بعد میں فونیم اور مارفیم کے تصور کو لسانیات کا اہم مرکز سمجھا جانے لگا۔ نحو میں قریبی مشمول تجزیہ پر اکتفا کیا گیا اور معنیات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ تجزیاتی لسانیات چوں کہ تاریخی لسانیات کے خلاف ردعمل تھا لہذا اس میں وقت کی رفتار کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ایک منجمد نقطہ وقت میں زبان کا مطالعہ کیا گیا۔

امریکہ کے مشہور ادارے M.I.T کے پروفیسر چامسکی نے غور و خوض کے بعد زبان اور قواعد کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ جو ان کے نزدیک صحیح اور جامع مانا جاتا ہے۔ یہ نظریہ لسانی سطحوں میں نحو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تجزیاتی لسانیات صوت سے شروع ہو کر فونیم اور مارفیم کے راستہ جملہ کی ساخت تک پہنچتی ہے۔ چامسکی کے نظریہ میں جملہ کی ساخت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

چامسکی کے مطابق نحو اصولوں اور لائحہ عمل کا نام ہے جن سے کسی زبان میں جملے بنائے جاتے ہیں۔ قواعد وہ تدبیر ہے جس سے کسی زبان کے تمام قواعدی صحیح جملے بنائے جا سکیں اور کوئی بھی قواعدی غلط جملہ نہ بنایا جا سکے۔

زبان ان جملوں کے مجموعہ کا نام ہے جو طول میں محدود ہوتے ہیں اور محدود عنصروں سے بنائے جاتے ہیں۔ چامسکی کی دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں (i) Syntactic Struetures اور (ii) Aspect of the theory of syntex۔ اس میں اس نظریہ کا ارتقا پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں چامسکی نے اپنی قواعد کا نام تخلیقی قواعد ہی رکھا کیوں کہ اس میں ایک جملے سے دوسرے جملے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ اس قواعد کے تین اجزا ہیں۔

نحوی جزو

اس میں وہ سب اطلاع فراہم ہوگی جو کسی خاص جملہ کی فونیمی یا معنوی تشریح کے لیے درکار ہوگی۔

فونیمی جزو

نحوی قواعد سے بننے والے جملہ کی صوتی ہیئت کی تعین کرے گا۔

معنوی جزو

یہ جملہ کی معنوی تشریح کا تعین کرے گا۔

چامسکی نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ نحوی اور معنوی اجزا ایک دوسرے سے بالکل جدا نہیں ہوں گے۔ فونیمی اور معنوی اجزا محض تشریح ہیں۔ وہ جملوں کی تخلیق میں کوئی کارفرمائی نہیں کرتے۔ نحوی جز کے دو حصے ہوں گے:

بنیاد

اس میں بہت سے بعض تحریری قاعدے ہوں گے جو سیاق وسباق کے پابند نہ ہوں گے۔

تشکیلی جزو

یہ بہت سی تشکیلوں کا سلسلہ ہوگا۔

بہرحال چامسکی کی کوششوں سے یہ فائدہ ہوا کہ لسانیات میں نحواور جملہ کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ چامسکی نے جملہ کو فونیم، مارفیم اور لفظ پر فوقیت دی۔

6.8 خلاصہ

''نحو وہ علم ہے جس سے کلموں کی ترکیب اور جدا کرنے کا قاعدہ معلوم ہو۔''

یعنی کہ نحو صرف آزاد رویوں یا الفاظ کے جوڑنے کے اصولوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ چاہے یہ ایک مارفیم کے ہوں یا ایک سے زیادہ مارفیم کے بنے ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو جوڑ الفاظ کے بنائے جاتے ہیں وہ دو الفاظ سے لے کر ایک بڑے جملہ تک کے ہوسکتے ہیں۔ نحو میں ان اصولوں کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے مطابق زبان میں الفاظ یا آزاد رویوں کو بڑی تراکیب میں ترتیب دے کر استعمال کیا جاتا ہے۔

نحو کی تعریف کرتے ہوئے گلیسن یوں لکھتے ہیں:

''جو ترکیبیں تصریف اور اشتقاق کے عمل سے بنتی ہیں انھیں اور بڑی بندشوں میں ترتیب دینے کے اصولوں کو نحو کہتے ہیں۔''

نحو اور مارفولوجی میں تصریف کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ مارفولوجی میں ہم لفظ کی سطح تک زبان کا مطالعہ کرسکتے ہیں جب کہ نحو میں ہم دو یا دو سے زائد الفاظ (جملہ) کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

نحو میں چند ایسی اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں جن کا استعمال نحو کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً ترکیب، جزو، جزو متصل اور اس کی اہمیت وغیرہ۔

اردو اور انگریزی میں جس طریقہ کو سب سے آسان اور عام قسم کا نحوی طریقہ کہتے ہیں وہ ہے ترتیب الفاظ یا روپ درجہ بندی کی رکنیت۔

اس کے علاوہ رابطہ بہ ذریعہ انتخاب، رابطہ بہ ذریعہ سیاق وسباق، رابطہ بہ ذریعہ نشان گر بھی اس کے اہم طریقے ہیں۔

امریکہ کے پروفیسر چامسکی نے غور وخوص کے بعد زبان اور قواعد کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ یہ نظریہ لسانی سطحوں میں نحو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ چامسکی کی کوششوں سے یہ فائدہ ہوا کہ لسانیات میں نحو اور جملہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نے جملہ کو فونیم، مارفیم اور لفظ پر فوقیت دی۔

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ نحو کی تعریف کرتے ہوئے اس کی بنیادی اصطلاحات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

2۔ نحوی طریقوں پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

3۔ نحو کی بنیادی اصطلاحات پر روشنی ڈالتے ہوئے جزو متصل کی اہمیت واضح کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ نحو کی تعریف بیان کرتے ہوئے نحو اور مارفولوجی کے فرق کو واضح کیجیے۔

2۔ جزو متصل کی تعریف کرتے ہوئے جزو متصل کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ترتیب کی تعریف اور اس کی اہمیت واضح کیجیے۔

6.10 سفارش کردہ کتابیں

1۔ عام لسانیات : پروفیسر گیان چند جین

2۔ اردو صرف و نحو : ڈاکٹر اقتدار حسین

3۔ اردو میں لسانیاتی تحقیق : عبدالستار دلوی

4۔ اردو ساخت کے بنیادی عناصر : نصیر احمد خان

اکائی 7 معنیات

ساخت

7.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ لسانیات کی ایک اہم شاخ معنیات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔علم لسانیات ایک وسیع میدان کا احاطہ کرتا ہے اوراس کی کئی ایک شاخیں ہیں جس میں ''علم معنیات'' کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔کیوں کہ کسی زبان کے کسی بھی قسم کے مواد میں چاہے وتخلیقی ،تنقیدی یا پھر تحقیقی نوعیت کا حامل کیوں نہ ہواس کے مفہوم کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔اسی معنی ومفہوم کے مطالعہ کا نام ''معنیات'' کہلاتا ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- معنیات کی تعریف بیان کرسکیں
- معنیات کی تاریخ کی وضاحت کرسکیں
- معنیات کی اہمیت کو سمجھا سکیں اور
- معنیات کی شاخوں پر سیر حاصل گفتگو کرسکیں۔

7.1 تمہید

کسی زبان کے سائنسی مطالعہ کا نام لسانیات ہے''معنیات''لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے۔لسانیات میں کسی زبان کی اصوات،الفاظ، جملے،تراکیب اور معنی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے۔الفاظ اور معنی کے باہمی تعلق کا مطالعہ معنیات کے علم کے تحت کیا جاتا ہے۔یعنی معنی کسے کہتے ہیں؟ معنی کی کیا اہمیت ہے؟معنی کیسے بدلتے ہیں؟ الفاظ اور معنی کے بیچ ایک تعلق ہے؟ وغیرہ جیسے

سوال اٹھائے جاتے ہیں۔

معنیات کسی زبان کے فلسفیانہ یا لسانی مطالعہ کا نام ہے اس کے علاوہ معنیات اسلوب کے کسی بھی پہلو اور اس کے معنی کو ایک موزوں شکل دینے کا نام ہے۔

7.2 معنیات کی تعریف

علم لسانیات میں معنیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

7.2.1 معنیات کے لغوی معنی

معنیات

علم المعانی۔مفہوم الفاظ کا مطالعہ۔

7.2.2 معنیات کے اصطلاحی معنی

معنیات(Semantics)

> **''لسانیات کی ایک شاخ جس میں الفاظ کے معنی سے بحث ہوتی ہے۔معنویات، لفظیات (Semiotic)، نشات (علامات) کا عام نظریہ۔'' (فرہنگ ادبی اصطلاحات، پروفیسر کلیم الدین احمد،ص:174)**

معنیات کو ایک نواحی شعبہ کہا گیا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس شعبہ کو بہت سے نام دیے گئے Semantics کے علاوہ Semotics، Sematology، Semology، Semasiology اور ان کے ہم معنی اصطلاحوں کو استعمال کیا گیا۔لیکن 1883ء میں مشہور ماہر معنیات بریل (Breal) کی اصطلاح (Semantics) کو مستند مان لیا گیا۔معنیات میں علامات کے باہمی باضابطہ رشتہ کو دیکھا جاتا ہے۔''

7.2.3 معنیات کی تعریف

لسانیات ایک ایسا علم ہے جو کئی ایک شاخوں کا احاطہ کرتا ہے۔لسانیات کی ایک اہم شاخ معنیات ہے۔معنیات میں کسی زبان کے معنی سمجھنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے علم معنی میں معنی کسے کہتے ہیں؟ معنی کی کیا اہمیت ہے؟ معنی کیسے بدلتے ہیں؟ الفاظ اور معنی کے بیچ کیا تعلق ہے؟ وغیرہ کے بارے میں تفصیلی معلومات سائنسی نقطہ نظر سے پیش کی جاتی ہیں۔ لفظ

کے معنی محدود اور وسیع کب اور کیوں کر بنتے ہیں؟ دو مختلف الفاظ کے ہم معنی ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ الفاظ کے دو معنی ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ الفاظ بے معنی کب ہو جاتے ہیں؟ جیسے بے شمار مسائل اور ان کے سائنسی حل کا مطالعہ معنیات کے تحت کیا جاتا ہے۔

7.2.4 answer.com کے مطابق معنیات کی تعریف

انٹرنیٹ پر موجود ویب سائٹ answer.com کے مطابق معنیات کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے:

> **"Semantics, the philosophical or linguistic study of meanings in language. The Semantics aspects of any expression is its meaning as apposed to its forum."**

> **ترجمہ : معنیات کسی زبان کے فلسفیانہ یا لسانی مطالعہ کا نام ہے اس کے علاوہ معنیات اسلوب کے کسی بھی پہلو اور اس کے معنی کو ایک موزوں شکل دینے کا نام ہے)**
> **(بہ حوالہ عام لسانیات، پروفیسر گیان چند جین، ص: 281 تا 328)**

7.2.5 پروفیسر گیان چند جین کے مطابق معنیات کی تعریف وتشریح

معنیات کے مفہوم کے سلسلہ میں پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> **''معنی'' کے کیا معنی ہیں؟ G.K. Ogden اور I.A. Richards نے 1923ء کے قریب Meaning of Meaning نام کی کتاب لکھی جس میں معنی کی متعدد تعریفیں درج تھیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس مسئلہ پر غور کیا گیا تھا۔۔'' آگے انھوں نے چند مصنفین کی آرا درج کی ہیں۔ جو یہ ہیں:**

تاریخی لسانیات کے عالم لیہ مان نے معنی کی یہ تعریف دی ہے:

> **"The meaning of a word is the sum total of contexts in which it appears."**

لفظ کا سیاق لفظ کے معنی سے وسیع تر ہوتا ہے اس لیے معنی سیاقوں کے مجموعہ کے مترادف نہیں۔ یہاں لیہ مان نے

دراصل یہ کہنا چاہا ہے:

"The meaning of a word is the sum total of senses in various contexts in which it appears."

بلوم فیلڈ تجزیاتی ہے۔ وہ مفہوم کے لفظ سے بچ کر معنی کی تعریف کرنا چاہتا ہے اس نے کہا:

"Meaning of a linguistic form as the situation in which the speakes utter . . . it and the response which it calls forth in the leave."

اردو میں اسے یوں کہیں گے:

ایک لسانی روپ کا معنی وہ صورت حال ہے جس میں قائل اسے بولتا ہے اور وہ تاثر ہے جو سامع میں پیدا ہوتا ہے۔"

(بہ حوالہ عام لسانیات، پروفیسر گیان چند جین، ص:286)

7.3 معنیات کی تاریخ

چوں کہ معنیات سے مراد معنی کا مطالعہ ہے۔ معنی کے مطالعہ سے عالموں کو قدیم زمانے سے ہی دلچسپی رہی ہے۔ بے شمار لغات جو اب تک مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اس دلچسپی کا بین ثبوت ہیں۔ J. Lyons نے لکھا ہے کہ Semantics (معنیات) کی اصطلاح انیسویں صدی کے اواخر میں ایک یونانی فعل سے وضع کی گئی ہے۔ جس کے معنی to signify اشارہ کرنا ہے۔

7.4 معنیات کی لغاتی ونحوی تراکیب

معنیات کی دو ایک تراکیب بھی ملتی ہیں جیسے لغاتی معنیات اور نحوی معنیات۔ اس سلسلہ میں ماہر لسانیات پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

"معنیات کے نقطۂ نظر سے مسلسل کلام کو جن اکائیوں میں بانٹا جاتا ہے وہ مارفیم نہیں الفاظ ہیں۔ لفظ کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ اس اصطلاح میں اس قدر ابہام ہے کہ بہتوں نے

لفظ کو اصطلاح کے طور پر قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔لیکن معنیات میں لفظ کو اکائی ماننا ہی سب سے زیادہ عملی اقدام ہے۔ لفظ کے مطالعہ کو علم اللغات یا لغاتیات (Lexicology) کہتے ہیں۔لغاتیات کے دو حصے ہوتے ہیں(i) لفظ کی ساخت کا تجزیہ کرنا یعنی لغاتی مارفیمیات،(ii) لفظ کے معنی بیان کرنا یعنی لغاتی معنیات۔اس طرح معنیات کا لغاتیات سے گہرا تعلق ہے معنیات کہنے سے زیادہ تر لغاتی معنیات (Lexical Semantics) مراد لیا جاتا ہے اس کے علاوہ نحوی معنیات (Syntoctic Semantics) بھی ہوتی ہے جس میں جملہ کے اجزا،لفظوں کی ترتیب، روپ گروہ صورت، حالت، مطابقت (Concord)، متابعت وغیرہ کے معنوی عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ان ترکیبوں سے جو مفہوم ادا ہوتا ہے اسے ارتباطی معنی (Relational Meaning) کہتے ہیں۔'' (بہ حوالہ عام لسانیات، پروفیسر گیان چند جین، ص:283)

7.5 معنیات کے دو پہلو۔طبعی ونفسیاتی

معنیات کی تعریف کے سلسلہ میں دو پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔طبعی اور نفسیاتی۔طبعی پہلو کی نمائندگی صوت، علامت یا نام سے ہوتی ہے۔نفسیاتی پہلو کی معنی،مرموز یا مفہوم ہے۔کچھ بھی کہیے اور کوئی بھی اصطلاح استعمال کریں۔یہی دو رخ لازمی ہیں۔صوت و معنی یا علامت و مرموز یا نطق و تصور وغیرہ۔

7.6 معنیات کی دو اصطلاحیں

واضح طور پر معنیات کی دو اصطلاحیں ملتی ہیں انھیں معنیات کے اصول بھی کہا جاسکتا ہے۔ جو یہ ہیں (i) معنوی تبدیلی،(ii) فلسفیانہ معنیات۔

7.6.1 معنوی تبدیلی

اگر کسی لفظ میں مروجہ مفہوم یا مفاہیم کے علاوہ کوئی مفہوم شامل ہو جائے یا کسی مفہوم کی ادائیگی کے لیے مروجہ صوتی ہیئت (لفظی شکل) کے علاوہ کوئی اور صوتی ہیئت کام میں آنے لگے تو یہ معنوی تبدیلی ہے۔
اس کے علاوہ ایسے الفاظ جو معیاری اردو میں موجود ہیں لیکن ان کے معنی میں کمی یا اضافہ ہوا ہے ان کا شمار معنیات کے

علم کے تحت کیا جاسکتا ہے۔ یہاں الفاظ کے حقیقی معنوں کے علاوہ حیدر آباد میں استعمال ہونے والے مختلف معنوں کو جملوں کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ جیسے لفظ، مکان کا استعمال کسی گھر کے لیے ہوتا ہے جس میں چار دیواریں اور چھت ہوتی ہیں لیکن حیدر آباد میں مکان کا لفظ دیگر معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

1۔ مکان : جہاں محرم کے پنجے رکھے جاتے ہیں اس جگہ کو بھی مکان کہا جاتا ہے۔

2۔ گھر : قبر کے لیے کھودی جانے والی زمین کو بھی گھر کہا جاتا ہے۔

3۔ حاضری : حاضری کا کھانا۔ جو میت کو گھر سے لے جانے کے بعد کھلایا جاتا ہے۔

4۔ خشکی : روٹی بنانے کے لیے استعمال کیے جانے والے سوکھے آٹے کو بھی خشکی کہا جاتا ہے۔''

(عام لسانیات از پروفیسر گیان چند جین، ص: 281)

7.7 معنیات کی اہمیت

علم لسانیات میں معنیات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کیوں کہ کسی زبان میں اس زبان کے جملہ، محاورہ، فقرے، لفظ یا آواز کا کوئی مقصد اس وقت واضح نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے معنی و مفہوم پوری طرح سے عیاں نہ ہو جائے۔ معنیات کے بغیر کسی زبان کی لسانیات کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> **''بلوم فیلڈ کے وقت سے لسانیات نے زیادہ روپ اور شکل سے تعلق رکھا ہے وہ حتی الامکان مفہوم سے کنارہ کشی کرتی ہے۔ بعض ماہرین لسانیات کو تو لفظ ''معنی'' سے چڑ ہوگئی ہے۔ کیمبرج میں 1957ء میں پروفیسر آلین (W.S. Allen) نے افتتاحیہ خطبہ دیا تو اس میں کہا کہ ماہرین ''معنی'' کو کتنا بھی کریہہ لفظ قرار دیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہر ماہر لسانیات معنی کے تصور سے کام لیتا ہے گو وہ اعتراف نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ معنی کے بغیر لسانیات زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔ فونیم کا تصور معنی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔''**
>
> **(عام لسانیات از پروفیسر گیان چند جین، ص: 282)**

7.7.1 معنیات میں معنی بیان کرنے کے تین طریقے

معنی کی خصوصیت ان کا پھیلاؤ ہے۔ سیاق میں آ کر ہی وہ گرفت میں آتا ہے لیکن کسی بچہ یا غیر زبان والے کو لفظ و معنی سکھائے جائیں تو معنی کیوں کر بیان کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی صحت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں۔ صرف کام چلاؤ عملی معنی بیان کیے جاسکتے ہیں ان کے تین طریقے ہیں۔

7.7.1.1 براہ راست طریقہ

واضح ترین صورت یہ ہے کہ کسی شے کی طرف اشارہ کر کے دکھا دیا جائے مثلاً اگر کرسی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہیں ''کرسی'' تو اس کے معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ طریقہ صرف مادی اشیا کے لیے کارگر ہے اور وہ بھی اس محدود صورت میں کہ وہ شے سامنے موجود ہے۔ بچوں کو اسی طرح معنی بتائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی اجنبی زبان بولنے والوں کے علاقہ میں چلا جائے اور مدد کرنے کو کوئی ترجمان نہ ہو تو وہ بھی اجنبی لفظوں کے معنی اسی طرح سیکھے گا۔

7.7.1.2 ترجمہ کا طریقہ

معنی بیان کرنے کا دوسرا مشہور طریقہ ترجمہ کا ہے دو زبانی لغات میں یہی کام میں لایا جاتا ہے مثلاً اَسپ معنی گھوڑا یا مبروص معنی کوڑھی۔

7.7.1.3 تشریح وتوضیح کا طریقہ

تیسرا طریقہ تشریح وتوضیح کا ہے یعنی اسی زبان میں گھما پھرا کر شرح کی جائے مثلاً:

پارلیمنٹ : عوام کے منتخب نمائندوں کا ایوان جو خاص طور پر قانون بناتا ہے۔

پیٹھا : گول کدّو سے مماثل ایک بڑا گول پھل جس کا چھلکا موٹا اور سفیدی مائل سبز رنگ کا ہوتا ہے گودا موٹا سفید رنگ کا ہوتا ہے اس کی مٹھائی بنائی جاتی ہے۔

واضح ہو کہ معنی بیان کرنے میں محض امتیازی خصوصیات بیان کی جاتی ہے غیر امتیازی نہیں تا کہ سامع کو غیر ضروری تفصیلات میں الجھنا نہ پڑے۔

7.7.2 معنیات میں سیاق کے نظریہ کی اہمیت

معنیات میں سیاق کا نظریہ Conterd Theory بہت زیادہ اہم ہے۔ سیاق کی دو قسمیں ہیں جو ''ڈی ساسور'' کی زبان کی دو قسموں یعنی زبان (Langue) اور بات چیت (Parole) سے متعلق ہیں۔

1۔ زبان کا سیاق وہ ہے جس کے تحت بعض الفاظ فطرتاً ایسے ہیں کہ ان کے معنی دوسرے الفاظ کے سیاق کے بغیر بیان ہی نہیں کیے جاسکتے مثلاً فلاں، بہتر، افضل، کے، کہ، بالا، So-and-So، Last وغیرہ۔

2۔ بات چیت کا سیاق اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ انگریزی لفظ Man بالمقابل جانور کہیں زیادہ اہم معنی رکھتا ہے بہ نسبت Man بالمقابل Woman کے۔ ذیل کے جملوں میں نظر کے مختلف معنی دیکھیے:

i۔ رات کو پڑھنے سے نظر کمزور ہو جاتی ہے۔

ii۔ ع میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک۔

iii۔ ع خرد کے پاس نظر کے سوا کچھ اور نہیں۔

iv۔ اہل نظر معاشی انصاف کے معنی سمجھ سکتے ہیں۔

v۔ اف وہ نظریں۔

vi۔ عرشی صاحب غالبیات میں اچھی نظر رکھتے ہیں۔

vii۔ ع نظر لگے نہ کہیں اس کے دست بازو کو۔

ان جملوں اور مصرعوں میں سیاق تقریر کی وجہ سے نظر کے مختلف معنی متعین ہوتے ہیں۔ گویا سیاق معنی کا پورا سلسلہ قائم کر دیتا ہے سیاق ہی لفظ کے معنی کا جذباتی لباس وضع کرتا ہے۔ جذباتی رخ معنی میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم ایک شخص کو پیار اور نرمی سے کہیں کہ ''یہاں سے جاؤ'' دوسرے کو تلخی سے چلا کر کہیں ''یہاں سے جاؤ'' تو دونوں میں معنی میں کمی بیشی ہوگی۔ سیاق کے بغیر مفرد لفظ کے معنی محض نظریاتی ہوتے ہیں۔

7.7.3 ترسیل معنی میں غیر لسانی عوامل کی کارفرمائیاں

غیر لسانی عوامل کے ذریعہ بھی معنیات کے علم میں معنی کی ترسیل کا کام انجام دیا جاسکتا ہے ان غیر لسانی اعمال کو مدارج کے اعتبار سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

1۔ غیر لسانی غیر صوتی افعال یعنی اشارے مثلاً کسی کے ہاتھ میں کوئی چیز دینا، کھانے کی تھالی زمین پر پٹک دینا، ہاتھ دبانا یا مصافحہ کرنا یا نوچ لینا۔ ان سب میں کئی معنی ہوتے ہیں۔

2۔ غیر لسانی غیر نطقی آوازیں مثلاً تالیاں بجانا، سیٹی بجانا، ان کے معنی پہلی شق کے مقابلہ میں واضح تر ہوتے ہیں کسی کی غزل یا تقریر سن کر سامعین کا بار بار تالی بجانا کبھی تحسین کا اظہار کرتا ہے کبھی تضحیک کا۔ اس میں مفہوم کی عدم وضاحت اس سے ظاہر ہے کہ بعض اوقات سامعین تضحیک کے طور پر تالیاں بجاتے ہیں اور شاعر یا مقرر اسے تحسین سمجھ بیٹھتا ہے۔

3۔ غیر لسانی لفظی آوازیں۔ یہ وہ آوازیں ہیں جو اعضائے نطق سے پیدا ہوتی ہیں لیکن لسانی نہیں مثلاً ہنسنا، رونا، کھانسنا۔ ان میں بھی کچھ معنی ہوتے ہیں۔ کھانسنا اکثر بے معنی ہوتا ہے لیکن بعض اوقات معنی خیز بھی ہوسکتا ہے مثلاً سڑک پر چلتی ہوئی کسی نورس لڑکی کو دیکھ کر تماش بین کا کھانسنا، کسی کو گپ ہانکتے دیکھ کر کھانسنا، اگلے وقتوں میں پردہ دار گھرانے کے اندر بزرگ مردوں کا کھانس کر داخل ہونا تا کہ بہوئیں گھونگھٹ نکال لیں۔

4۔ لسانی تکلم کا غیر لسانی وصف جو قائل کی جذباتی حالت کی نمائندگی کرے۔ ایک ہی لفظ یا بات کو پیار، غصہ، التجا، اصرار، تحکم کے لہجہ میں کہا جاسکتا ہے اور اس کے معنی مختلف ہوجاتے ہیں۔

تان (Tone) والی زبانوں میں ایک لفظ کو مختلف لہجوں سے ادا کر کے اس کے مختلف معنی لیے جاتے ہیں لیکن ہماری بغیر تان دار زبان میں بھی کلام کا جذباتی لہجہ اس کے معنی میں ترمیم کر دیتا ہے مثلاً:

1۔ یہاں سے چلے جاؤ (التجا کے لہجہ میں)

2۔ یہاں سے چلے جاؤ (روتے ہوئے کہنا جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر سامع نہیں گیا تو قائل پر شدید جذباتی بار ہوگا)

3۔ یہاں سے چلے جاؤ (تحکم کے لہجہ میں)

4۔ یہاں سے چلے جاؤ (غصہ میں چیخ کر کہنا مثلاً ''یہاں سے چلے جاؤ'' کی سر لہر میں جس کے معنی ہیں یہ کہ اگر سامع نہیں گیا تو قائل اس کا سر توڑ دے گا یا اسے دھکے دے کر نکال دے گا)

7.8 معنیات کی شاخیں

معنیات کی دو شاخیں ملتی ہیں:

1۔ بیانی معنیات

2۔ تاریخی معنیات

7.8.1 بیانی معنیات

بیانی معنیات میں معنی کی تعریف، علامت و مرموز کا تعلق نام اور مفہوم کی خصوصیات، نام اور مفہوم کے تعلق کی مختلف صورتوں (ایک نام کے کئی مفہوم اور ایک مفہوم کے کئی نام) پر غور کیا جاتا ہے۔

7.8.2 تاریخی معنیات

تاریخی معنیات معنوی تغیر کے مطالعہ کو کہتے ہیں۔ معنی کے ارتقاء یعنی معنوی تبدیلی کے مطالعہ کا نام ہے اس کا موضوع تبدیلی کی نوعیت، معنوی تبدیلی کے اسباب، ان اسباب کی گروہ بندی، معنوی تبدیلی کے مظاہر اور معنوی تبدیلی کے قوانین پر بحث کرنا ہے۔

7.9 معنیات کی اقسام

انٹرنیٹ پر موجود معلومات کے مطابق ماہرین معنیات لیک نے علم معنیات میں معنی کو سات اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ان معلومات یا مواد کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے درج کیا گیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

تصوراتی معنی، تعبیراتی معنی، سماجی معنی، موثراتی معنی، عکسی معنی، اجتماعی معنی اور موضوعاتی معنی وغیرہ۔

7.9.1 تعبیراتی معنیات

ٹریگن نے سب سے پہلے زور دیا کہ تعبیری معنی میں دو الفاظ کے بارے میں لوگ کیا سوچتے ہیں اور اس نے یہ تلاش

کیا کہ تعبیری معنوں کے ذریعہ کسی لفظ کے دو مختلف معنی ممکن یا ناممکن ہونے کے کیا اسباب ہوتے ہیں اس کی بنیاد معنی کی ذاتی تشریح پر منحصر ہوسکتی ہے اور یہ لوگوں کے ایک جیسا ہی یا پھر مختلف سوچنے پر انحصار کرتا ہے۔

چیئر کے مطابق جب ایک لفظ دونوں مثبت اور منفی پہلو رکھتا ہے تو اسے تعبیری معنی کا لفظ کہا جاتا ہے۔

7.9.2 تصوراتی معنیات

لیک کے مطابق تصوراتی معنی یا تعبیراتی معنی کسی لسانی مواصلات کے سلسلہ میں دوسری دیگر اقسام کی بہ نسبت سب سے اہم مرکزی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تعبیراتی معنی میں کسی جملہ کے احساس کے توسط سے مخالفت کی جاتی ہے۔ جب کہ تصوراتی معنی میں کسی کلام کے منطقی احساس کو ظاہر کیا جاتا ہے اور قواعد کی اہلیت میں اسے ایک بنیادی جزو کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ''تصوراتی معنی'' معنی کی لغوی سطح پر بنیادی یا عالم گیر معنی ہونے کی نمائندگی کرسکتا ہے۔ تصوراتی معنی لغوی یا لغاتی سطح پر مخصوص خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہے۔

7.9.3 اجتماعی معنیات

اجتماعی معنی عام طور پر کچھ الفاظ کے گرد و پیش اپنا رابطہ رکھتے ہیں۔ اجتماعی معنی اپنے اردگرد کی انجمنوں پر مشتمل ہوتے ہے۔ بہ الفاظ دیگر اجتماعی معنی میں لفظ و معنی کے رشتہ کے بارے میں تجویز پیش کی جاتی ہے اجتماعی معنی میں لفظ کے مخصوص سیاق و سباق میں پیدا ہونے والے معنی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ایک لفظ کے روایتی انداز کے مختلف معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں واضح ہوں:

1. Heavy smoker (a person who smokes a lot).

(ایک بہت زیادہ سگریٹ نوشی کرنے والا شخص)

2. Heavy news (a piece of sad news).

(ایک بری خبر)

3. Heavy schedule (a very tight schedule).

(ایک معروف طریقہ کار)

4. Fast color (the color that does not fade).

(ختم نہ ہونے والا رنگ)

5. Fast friend (a reliable friend).

(ایک قابل اعتماد دوست)

6. Fast woman (a lady of easy virtue).

(ایک تسکین کن عورت)

7.9.4 سماجی معنیات

لابنر (Lobner) کے مطابق سماجی معنی وضاحتی معنی کا ایک حصہ ہے اور اس میں بعض الفاظ جملہ اور قواعد میں لغوی معنی مراد لیے جاتے ہیں سماجی معنی میں زبانی بات چیت کے تمام پہلو کو رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس کے ساتھ زبانی عمل کے ذرائع ابلاغ کی الجھن ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔

بہ الفاظ دیگر سماجی معنی سے مراد کسی زبان کے قائم کرنے کے لیے اور سماجی تعلقات اور سماجی کردار کو برقرار رکھنے کا عمل کیا جاتا ہے۔

7.9.5 موثراتی معنیات

ایک اندازے کے مطابق موثراتی معنی میں سماجی اور موثراتی معنی کا بالواسطہ طور پر موازنہ کیا جاتا ہے۔ موثراتی معنی میں کسی کلام یا بولنے والے کے ذاتی رویہ کا بہ راہ راست عکس نظر آتا ہے۔ عام طور پر اس طرح کے احساس یا رویوں کو منفی قرار دیا جاتا ہے۔ موثراتی معنی میں سب سے زیادہ معنی کے اثر انداز ہونے کی کیفیت پر زور دیا جاتا ہے۔

7.9.6 عکسی معنیات

عکسی معنی سے مراد تصورات کی کثرت سے ہے۔ یعنی ایک لفظ کے معنی کے احساس میں ایک دوسرے کے احساس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ عکسی معنی میں لوگوں کے شناخت اور تخیل کا نتیجہ نکالا جاتا ہے۔

7.9.7 موضوعاتی معنیات

موضوعاتی معنی میں دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح ایک جیسے جملہ میں موضوع کی تبدیلی مفہوم کی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔

1. I have not read this book.

(میں نے نہیں پڑھا اس کتاب کو)

2. This book I have not read.

(اس کتاب کو میں نے نہیں پڑھا)

3. It is this book (that) I have not read.

(یہ وہ کتاب ہے جسے میں نے نہیں پڑھا)

4. This book has not been read by me.

(میری طرف سے یہ کتاب نہیں پڑھی گئی)

7.10 خلاصہ

زبان کے سائنٹفک مطالعہ کا نام لسانیات ہے۔لسانیات ایک ایسا علم ہے جو کئی ایک شاخوں کا احاطہ کرتا ہے۔ لسانیات کی ایک اہم شاخ معنیات ہے۔معنیات کے لغوی معنی علم المعانی،مفہوم الفاظ کا مطالعہ ہے۔معنیات میں کسی زبان کے معنی سمجھنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔معنیات کسی زبان کے فلسفیانہ یا لسانی مطالعہ کا نام ہے اس کے علاوہ معنیات اسلوب کے کسی بھی پہلو اور اس کے معنی کو ایک موزوں شکل دینے کا نام ہے۔ J. Lyons کے مطابق معنیات (Semantics) کی اصطلاح انیسویں صدی کے اواخر میں ایک یونانی فعل سے وضع کی گئی ہے۔جس کے معنی (to signify)اشارہ کرنا ہیں۔

معنیات کی دو تراکیب بھی ملتی ہیں لغاتی اور نحوی۔

علم معنیات میں دو پہلو کو مدنظر رکھنا لازمی ہوتا ہے۔طبعی اور نفسیاتی ان کے بغیر معنیات کا علم ناممکن ہو جاتا ہے۔ معنیات کی دو اصطلاحیں ہیں معنوی تبدیلی اور فلسفیانہ معنیات۔اس کے علاوہ معنیات علم لسانیات میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔معنیات میں معنی بیان کرنے کے تین طریقے ہیں براہ راست طریقہ، ترجمہ کا طریقہ اور تشریح وتوضیح کا طریقہ۔علم معنیات میں سیاق کے نظریہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اس کے علاوہ ترسیل معنی میں غیر لسانی عوامل بھی شامل ہوتے ہیں۔جن کے ذریعہ معنی کی ترسیل ممکن ہوسکتی ہے معنیات کی دو شاخیں، بیانی معنیات اور تاریخی معنیات ہیں۔اس کے علاوہ معنیات میں معنی کی سات اقسام ہیں تعبیراتی معنی،تصوراتی معنی،سماجی معنی، اجتماعی معنی،عکسی معنی،موضوعاتی معنی اور موثراتی معنی وغیرہ۔

7.11 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ معنیات کی تعریف کیجیے۔

2۔ معنیات کی کتنی تراکیب ہیں؟ ان کا تفصیلی ذکر پیش کیجیے۔

3۔ زبان اور لسانیات کا باہمی رشتہ بیان کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ معنیات کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر گیان چند جین کا نظریہ بیان کیجیے۔

2۔ معنیات کی اہمیت وافادیت پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

3۔ معنیات کی قسموں کے بارے میں اپنی معلومات کا مظاہرہ کیجیے۔

7.12 سفارش کردہ کتابیں

1۔	عام لسانیات	:	پروفیسر گیان چند جین
2۔	لسانیات کی الف بے	:	اختر حسین اختر
3۔	لسانی مطالعہ	:	ڈاکٹر گیان چند جین
4۔	صوتیات اور فونیمیات	:	پروفیسر اقتدار حسین
5۔	جدید اردو لسانیات	:	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
6۔	لسانیات کیا ہے؟	:	ڈیوڈ کرسٹل
7۔	عمومی لسانیات: ایک تعارف	:	ڈاکٹر عبدالسلام

بلاک۔III

اطلاقی لسانیات

لسانیات کے مطالعے کو ہم مختلف بنیادوں پر مختلف اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں جیسے عام لسانیات (General Linguistics) اور اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics)، عام لسانیات، لسانیات کے نظریات پیش کرتی ہے، توضیحی لسانیات، زبان کی ساخت اور ماہیت کا مطالعہ کرتی ہے۔ اطلاقی لسانیات، عام لسانیات اور توضیحی لسانیات کا عملی پہلو ہے۔ اس میں بیرونی زبانوں کا سیکھنا، زبان یا بولی کا علاقائی جائزہ، کسی زبان کی کوڈ تیار کرنا وغیرہ جیسے امور شامل ہیں۔ اطلاقی لسانیات کے وسیع تر دائرے میں اسلوبیات (Stylistics) ساختیات پس ساختیات، تدریس زبان و نیز لغت نویسی اور اصطلاح سازی جیسے موضوعات بھی شامل ہیں جن کا تعلق زبان کے مطالعے ہی سے ہے۔ اس بلاک میں مذکورہ موضوعات کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ بلاک درج ذیل چار اکائیوں پر مشتمل ہے:

اکائی 8 : اسلوبیات

اکائی 9 : ساختیات، پس ساختیات

اکائی 10: تدریس زبان

اکائی 11: لغت نویسی اور اصطلاح سازی

اکائی 8 اسلوبیات

ساخت

8.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو ادبی تنقید کے ایک نئے رجحان یا دبستان سے روشناس کرانا ہے جسے ''اسلوبیات'' (Stylistics) کہتے ہیں۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اسلوبیات کی تعریف بیان کر سکیں
- اسلوبیاتی طریقہ کار پر سیر حاصل گفتگو کر سکیں اور
- زبان کے حوالے سے اسلوب کی تعریفیں بیان کر سکیں۔

8.1 تمہید

آپ یہ بات بخوبی جانتے ہوں گے کہ مل جل کر رہنے اور زندگی گزارنے کے لیے زبان کا استعمال نہایت ضروری ہوتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں آپ کو ہر ہر قدم پر زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ زبان کے ہی وسیلے سے آپ اپنی بات دوسروں

تک پہنچاتے ہیں، اپنا دکھ درد بیان کرتے ہیں اور اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عام بول چال اور روزمرہ کی زندگی کے علاوہ زبان کا استعمال ادب میں بھی ہوتا ہے، یعنی جب کوئی شاعر شعر یا نظم کہتا ہے یا کوئی ادیب افسانہ یا ناول لکھتا ہے تو اسے زبان کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ زبان کے استعمال کے بغیر کوئی بھی ادبی تخلیق معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ لیکن ادب میں استعمال ہونے والی زبان، روزمرہ کی یا عام بول چال کی زبان سے کئی لحاظ سے مختلف ہوتی ہے اور اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ادبی زبان کے خصائص کو سمجھ لینے کے بعد آپ ادب سے اچھی طرح لطف اندوز ہوسکیں گے اور ادب کی تحسین شناسی میں بھی آپ کو مدد ملے گی، نیز آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کسی ادیب کی تشکیل کس طرح عمل میں آتی ہے اور اس کے مطالعے اور تجزیے کا طریقہ کار کیا ہے۔

8.2 اسلوبیات

اسلوبیات دراصل ادب کے لسانیاتی مطالعے کا نام ہے جس میں ادبی فن پارے کا مطالعہ وتجزیہ لسانیات کی روشنی میں اس کی مختلف سطحوں پر کیا جاتا ہے اور ہر سطح پر اس کے اسلوب کے خصائص (Style-features) کا پتا لگایا جاتا ہے، لہذا اسلوبیات صحیح معنی میں مطالعہ اسلوب ہے۔ چوں کہ اس مطالعے کی بنیاد لسانیات پر قائم ہے اس لیے اسے لسانیاتی مطالعہ ادب بھی کہتے ہیں۔

8.2.1 اسلوبیات اور لسانیات

اسلوبیات کا براہ راست تعلق لسانیات سے ہے جو زبان کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ کسی ادیب کے اسلوب یا کسی ادبی فن پارے کے اسلوبیاتی مطالعے میں لسانیات سے بہت مدد لی جاتی ہے۔ زبانوں کے مطالعے اور تجزیے کے سلسلے میں لسانیات ہمیں جو علم اور روشنی فراہم کرتی ہے اس کا اطلاق ہم ادبی فن پارے کی زبان کے مطالعے اور تجزیے میں بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کسی زبان کے لسانیاتی مطالعے میں جو طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے وہی طریقہ کار ہم کسی ادبی فن پارے کے تجزیے میں بھی اختیار کرتے ہیں، نیز اسلوبیات میں لسانیاتی اصطلاحات سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوبیات کی بنیاد لسانیات پر قائم ہے اور اسی وجہ سے اسلوبیات کو لسانیات کی ایک شاخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلوبیات کا تعلق ادب سے بھی ہے، کیوں کہ ادب کا ذریعہ اظہار (Medium) زبان ہے اور یہی زبان لسانیات کا مواد وموضوع (Content) ہے۔

کسی ادبی فن پارے کا اسلوبیاتی مطالعہ وتجزیہ لسانیات کی مختلف سطحوں پر کیا جاتا ہے۔ لسانیات کی پہلی سطح صوتیات ہے جس میں زبان میں کام آنے والی آوازوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کی دوسری سطح تشکیلیات ہے جس میں تشکیل الفاظ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کی تیسری سطح نحو ہے جس میں ترتیب الفاظ اور جملوں اور فقروں کی ساخت پر غور کیا جاتا ہے۔ زبان کے مطالعے کی آخری سطح معنیات کہلاتی ہے جس میں معنی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کے اسلوب کا مطالعہ یا کسی ادبی فن پارے کی زبان کا تجزیہ لسانیات کی ان چاروں سطحوں پر بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہر اسلوبیاتی مطالعہ لسانیاتی مطالعہ بھی ہوتا ہے، لیکن ہر لسانیاتی مطالعے کو اسلوبیاتی مطالعہ نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ فن پارے کے لسانیاتی مطالعے اور تجزیے کے بعد اس کے ''اسلوبی خصائص'' (Style-features) کا پتہ لگانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہی چیز لسانیاتی مطالعے کو اسلوبیاتی مطالعہ بنا دیتی ہے۔ لسانیاتی مطالعہ ماضی وحال میں بولی جانے والی کسی بھی زبان کا کیا جا سکتا ہے، لیکن اسلوبیاتی مطالعہ اپنے مخصوص معنی میں صرف ادبی زبان کا ہی احاطہ کرتا ہے۔

8.2.2 زبان اور ادب کا رشتہ

زبان اور ادب کے درمیان گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زبان ادب کا ذریعہ اظہار ہے۔ ادب کی تخلیق کے لیے زبان کا استعمال ناگزیر ہے۔ ہر شعری اور ادبی فکر زبان کے ہی سانچے میں ڈھل کر برآمد ہوتی ہے اور زبان کے ہی میڈیم سے وہ سامع یا قاری تک رسائی حاصل کرتی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب زبان کا استعمال ادبی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے تو اس کی نوعیت جداگانہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ یہ عام بول چال کی زبان سے حد درجہ مختلف ہو جاتی ہے۔ عام بول چال کی زبان سیدھی سادی، سپاٹ اور ترسیلی (Communicative) ہوتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ترسیل معنی یا ادائے مطلب ہوتا ہے۔ یہ مروجہ لسانی قاعدوں، ضابطوں اور اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ادبی زبان علامتی ہوتی ہے۔ اس میں تشبیہ واستعارے سے کام لیا جاتا ہے، نیز اشاروں اور کنایوں میں بات کی جاتی ہے اور الفاظ کے لغوی معنی مراد نہیں لیے جاتے۔ اس میں اظہار بھی براہ راست (Direct) نہیں ہوتا، بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے۔ یہ زبان صنائع لفظی وصنائع معنوی سے بھی بوجھل ہوتی ہے، نیز جذبے سے مملو (Emotive) ہوتی ہے۔ ادبی زبان کا بنیادی مقصد ترسیلی وابلاغی نہیں، بلکہ اظہاری (Expressive) ہوتا ہے۔ ادبی زبان اکثر لسانی ضابطوں (Linguistic Norms) سے انحراف کرتی ہے۔ ادبی زبان میں اکثر تراش خراش، توڑ پھوڑ اور ایجاد واختراع سے بھی کام لیا جاتا ہے جس سے زبان میں تخلیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ادب میں زبان کے تخلیقی استعمال کی بے حد اہمیت ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر شاعر یا ادیب زبان کا استعمال اپنے اپنے طور پر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر یا ادیب کا اسلوب بھی مختلف ہوتا ہے۔ اسلوب کے اسی امتیازی خصائص کی وجہ سے ہم کسی ادیب کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ کسی ادیب کے اسلوبیاتی امتیازات اس ادیب کو انفرادیت بخشتے ہیں اور اسے دوسرے ادیب یا ادیبوں سے ممتاز بنا دیتے ہیں۔

8.2.3 اسلوب کی عام تعریفیں

''اسلوب''، جسے انگریزی میں ''اسٹائل'' (Style) کہتے ہیں، سے عام طور پر کسی کام کو کرنے کا ڈھنگ، طریقہ یا انداز مراد لیا جاتا ہے۔ ہر شخص کے کام کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے، نیز ہر شخص اپنے اپنے طور یا ڈھنگ سے کسی کام کو سرانجام دیتا ہے۔ اسی کو اس شخص کا اسٹائل یا اسلوب کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص سے کسی موضوع پر تقریر کرنے کے لیے کہا جائے تو اس کے تقریر کرنے کا انداز اسی موضوع پر دوسرے شخص کی تقریر کے انداز سے مختلف ہوگا، یعنی لفظوں کا انتخاب، جملوں کی ترتیب

اور ادائیگی، آوازوں کا اتار چڑھاؤ اور زور، نیز چہرے کے نقوش اور اعضا کی حرکت، یہ تمام باتیں اس شخص کی اپنی ہوں گی جن سے اس کے تقریر کرنے کے انداز، ڈھنگ یا اسٹائل کا پتہ چلے گا۔ گفتگو کے علاوہ، چال ڈھال، رہن سہن اور کپڑوں کی وضع قطع سے بھی کسی شخص کے اسٹائل کا پتا چلتا ہے۔ اسلوب بھی اسی کا نام ہے۔ لیکن یہ اسلوب کا عام مفہوم ہے اور اس کی نہایت سادہ و سہل تعریف ہے۔

اسلوب کی بے شمار تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ مختلف عہد کے ادیبوں، نقادوں اور عالموں نے اپنے اپنے طور پر اسلوب کی تعریف بیان کی ہے۔ مثلاً ایک فرانسیسی عالم بفوں (Buffon) نے اسلوب کو شخصیت کا نام دیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ''اسلوب بہ ذات خود انسان ہے'' (Style is the man himself)۔ اس قول سے اس کی مراد یہ ہے کہ انسان کے کام کرنے کے انداز میں اس کی شخصیت کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے، یعنی انسان کے ہر کام میں اس کی شخصیت کی چھاپ موجود ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان کوئی کام سرانجام دیتا ہے تو اس پر اپنی شخصیت کی چھاپ چھوڑ دیتا ہے جس سے ہم اس انسان کو پہچان لیتے ہیں، گویا اسلوب کسی انسان کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ اسلوب کی یہ تعریف لسانیاتی اعتبار سے درست نہیں ہے، کیوں کہ اس میں اسلوب کی تعریف انسان کی شخصیت کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ لسانیاتی اعتبار سے اسلوب کی وہی تعریف درست سمجھی جائے گی جو زبان کے حوالے سے بیان کی گئی ہو۔

8.2.4 زبان کے حوالے سے اسلوب کی تعریفیں

ماہرین لسانیات نے اسلوب کی تمام تعریفیں زبان کے حوالے سے ہی بیان کی ہیں نہ کہ انسان کی شخصیت یا کسی اور چیز کے حوالے سے۔ زبان کے حوالے سے بیان کی گئی اسلوب کی دو اہم تعریفوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

(الف) اسلوب بہ طور متبادل اظہارات کے درمیان فرق

لسانیاتی اعتبار سے اسلوب متبادل اظہارات (Alternative Expressions) کے درمیان لسانی فرق کا نام ہے۔ مشہور امریکی ماہر لسانیات چارلز ایف۔ ہاکٹ (Charles F. Hockett) نے اسلوب کی تعریف اسی اعتبار سے بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> **''ایک ہی زبان کے دو فقرے یا جملے جو تقریباً ایک ہی معنی و مفہوم کو ادا کرتے ہوں، جب اپنی لسانی ساخت کے اعتبار سے مختلف ہوں تو کہا جائے گا کہ ان (فقروں یا جملوں) میں اسلوب کا فرق ہے۔'' (ملاحظہ ہو ہاکٹ کی کتاب A Course in Modern Linguistics، ص: 556)**

اسلوب کی اس تعریف میں دو باتیں نہایت واضح ہیں اول یہ کہ اسلوب کا تعلق زبان کے استعمال سے ہے، دوم جب تک کہ دو متبادل اظہارات میں لسانی ساخت کے اعتبار سے فرق نہ پایا جائے، اسلوب معرض وجود میں نہیں آسکتا۔ اس بات کو ذیل کی مثالوں سے بہ خوبی سمجھا جاسکتا ہے:

1 (الف) پانی برس رہا ہے۔

1 (ب) بارش ہو رہی ہے۔

اردو زبان کے یہ دونوں جملے ایک ہی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔ معنی کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن لسانی ساخت کے اعتبار سے ان میں نمایاں فرق موجود ہے۔ 1 (الف) میں ''پانی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جب کہ 1 (ب) میں ''بارش'' کا۔ قواعد کے اعتبار سے لفظ پانی مذکر ہے اور بارش مونث۔ اسی طرح جب ہم فعل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں 1 (الف) میں ''برسنا'' اور 1 (ب) میں ''ہونا'' کی تصریفی شکلیں ملتی ہیں۔ قواعد کی رو سے ''برس رہا ہے'' فعل مذکر اور ''ہو رہی ہے'' فعل مونث ہے جس سے واضح ہے کہ ان جملوں کی لسانی ساخت مختلف ہے۔ اسی لیے ان کے اسلوب میں بھی فرق ہے۔

اسلوب کے فرق کی دوسری مثال ملاحظہ ہو:

2 (الف) سورج ڈوبتے ہی چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

2 (ب) آفتاب غروب ہوتے ہی ہر سو تاریکی پھیل گئی۔

ان جملوں کا مطلب و مفہوم بھی اگرچہ ایک ہے، لیکن ان کی لسانی ساخت میں نمایاں فرق موجود ہے، کیوں کہ جو الفاظ 2 (الف) میں استعمال ہوئے ہیں وہ بہ استثنائے ''ہی'' 2 (ب) میں استعمال نہیں ہوئے ہیں:

2(الف)	سورج	ڈوبتے	ہی	چاروں	طرف	اندھیرا	چھا گیا
2(ب)	آفتاب	غروب ہوتے	ہی	ہر	سو	تاریکی	پھیل گئی

مذکورہ دونوں جملوں کی لسانی ساخت میں فرق کی وجہ سے ان جملوں کے اسلوب میں نمایاں فرق کا پتا چلتا ہے۔ جملہ 2 (الف) کا اسلوب سادہ، غیر رسمی (Informal)، بے تکلفانہ اور عام بول چال کا اسلوب ہے، جب کہ جملہ 2 (ب) پُر تکلف، ثقیل اور رسمی (Formal) اسلوب سے عبارت ہے۔

اسی نوع کی چھوٹی سی ایک اور مثال دیکھیے:

3 (الف) آؤ بیٹھو۔

3 (ب) آیئے تشریف رکھیے۔

ان دونوں جملوں کا بھی مفہوم اور معنی و مطلب اگرچہ ایک ہی ہے، لیکن ان کی لسانی ساخت مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں بھی فرق ہے۔ ''آؤ بیٹھو'' میں بے تکلفی اور اپنا پن پایا جاتا ہے اور ''آیئے تشریف رکھیے'' پُر تکلف اور رسمی طرزِ اظہار ہے۔

یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اسلوبیات میں ادب یا ادبی تخلیق کے حوالے سے ہی اسلوب کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور کسی شاعر یا ادیب کے اسلوب سے ہی بحث کی جاتی ہے۔ یہ بات بھی نشانِ خاطر رہنی چاہیے کہ ادب میں زبان کے استعمال سے ہی اسلوب معرضِ وجود میں آتا ہے۔ زبان چوں کہ ادب کا ذریعہ اظہار ہے، اس لیے زبان کے استعمال کے بغیر کوئی ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا زبان جیسے ہی ادبی سانچے میں ڈھلتی ہے، اس میں اسلوب کی کارفرمائی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ اسلوب کوئی اضافی (Additional) یا باہر سے لائی ہوئی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ ادبی زبان میں پیوست ہوتا ہے۔ ادبی زبان اور اسلوب کا رشتہ

بہت گہرا ہوتا ہے۔ اسی لیے ادبی زبان کے مطالعہ کو مطالعہ اسلوب کا نام دیا گیا ہے۔ اس مطالعے میں جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، لسانیات سے خاطر خواہ مدد لی جاتی ہے۔ لسانیاتی مطالعہ ادب یا مطالعہ اسلوب کو مغرب میں بیسویں صدی کے نصف دوم میں کافی فروغ حاصل ہوا اور اس نے ایک شعبہ علم کی حیثیت اختیار کر لی جسے ''اسلوبیات'' (Stylistics) کا نام دیا گیا ہے۔

متبادل اظہارات کے درمیان لسانی فرق کی مثالیں شعر و ادب میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ یہاں میر تقی میر اور مرزا غالب کے کلام سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ان شاعروں کے اسلوب میں فرق کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میر و غالب کے یہاں ایسے بے شمار اشعار پائے جاتے ہیں جو معنی و مفہوم اور خیال کے اعتبار سے تو تقریباً یکساں ہیں، لیکن ان میں لسانی اعتبار سے فرق نہایت واضح ہے، مثلاً:

4 (الف) میر تقی میر :

سراہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں ترے تیغ کے لگانے کا

4 (ب) مرزا غالب :

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

5 (الف) میر تقی میر :

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھی یاد کرو

5 (ب) مرزا غالب :

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام میں بھی ایسی بے شمار مثالیں پائی ہیں جن میں معنی، مفہوم اور خیال کے اعتبار سے تو یکسانیت ہے، لیکن ان کی لسانی ساخت مختلف ہے، مثلاً:

6 (الف) میر انیس :

پانی تھا گرم، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

6 (ب) مرزا دبیر :

مثلِ تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب
ہوتی تھیں سیخِ موج پہ مرغابیاں کباب

(ب) اسلوب بہ طور لسانی ضابطوں سے انحراف

متبادل اظہارات کے درمیان فرق کے علاوہ اسلوب کی تعریف مقررہ لسانی ضابطوں سے انحراف (Deviation from the Norm) کے طور پر بھی کی گئی ہے۔ جب کوئی شاعر یا ادیب اپنے تخلیقی اظہار کے لیے زبان کا استعمال کرتا ہے تو وہ اسے اس کی اصلی حالت میں نہیں برتتا، بلکہ اکثر اس میں تنوع، جدت اور ندرت پیدا کرتا ہے جس کے لیے اسے زبان میں تراش خراش، کاٹ چھانٹ اور توڑ پھوڑ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اس عمل سے شعری اظہار میں آسانی اور زبان میں وسعت تو پیدا ہوتی ہے لیکن زبان اپنے ڈھرے سے ہٹ جاتی ہے جسے لسانی ضابطوں اور اصولوں سے انحراف کا نام دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم صبا اکرام کے اس شعر کو دیکھیں:

ہے اب تو خیر اسی میں کہ پانیوں میں رہو
کبھی جو سطح پہ آئے تو ڈوب جاؤ گے

تو ہمیں پتا چلے گا کہ پہلے مصرعے میں شاعر نے ''پانیوں'' کا استعمال کیا ہے جو ''پانی'' کی جمع ہے۔ یہ لسانی انحراف کی ایک مثال ہے۔ اردو بول چال اور تحریر و تقریر میں لفظ ''پانی'' ہمیشہ اسم واحد کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے، مثلاً:

i۔ دو دن سے پانی برس رہا ہے۔
ii۔ جدھر دیکھو پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔
iii۔ وہ بہت پیاسا ہے، اسے پانی پلا دو۔
iv۔ مچھلی پانی میں ہی زندہ رہ سکتی ہے۔
v۔ تالاب کا سارا پانی سوکھ گیا، وغیرہ۔

اردو کے یہ معیاری جملے ہیں، لیکن ان میں کہیں بھی ''پانیوں'' میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ اردو میں لفظ ''پانی'' کا بہ طور اسم واحد استعمال ایک ''نارم'' (Norm) کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی یہ ایک مروج لسانی شکل ہے جس کی خلاف ورزی کرنا نارم سے انحراف کہلاتا ہے۔ صبا اکرام نے اپنے مذکورہ شعر میں ''پانیوں'' (پانی کی جمع) استعمال کر کے لسانی نارم سے انحراف کیا ہے جس سے شعر میں جدت اور ندرت پیدا ہوگئی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہی جدت، ندرت اور انوکھا پن اسلوب کی تشکیل کا باعث قرار پاتا ہے۔

لسانی انحراف کی ایک اور مثال مظفر حنفی کے اس شعر میں دیکھنے کو ملتی ہے:

چاند اگا ہے، پروا سنکی، چلنا ہے تو چل
مہکا نے پھلواری من کی، چلنا ہے تو چل

اس شعر میں ''چاند اگا ہے'' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے جو لسانی قاعدے کی رو سے درست نہیں ہے۔ معنیاتی اعتبار سے ''اگنا'' نباتاتی اشیا کے نمو پذیر ہونے کا عمل ہے اور ''چاند'' ایک غیر نباتاتی شے ہے۔ لہذا چاند کو اگنا کے ساتھ ترکیب دینا معنیاتی بے آہنگی (Semantic Incompatability) تصور کی جائے گی اور ''چاند اگا ہے'' کو معنی کے لحاظ سے بے جوڑ یا بے میل ترکیب کہا جائے گا۔ شاعر نے یہاں لسانی نارم سے انحراف کیا ہے جس سے شعر میں جدت، ندرت اور انوکھا پن پیدا ہو گیا

جو تشکیل اسلوب کا ضامن ہے۔

اس نوع کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں جن میں شعرا نے لسانی نارم سے انحراف کر کے شعری اظہار میں انوکھا پن پیدا کیا ہے جس سے ان شعرا کے اسلوب کی انفرادیت کا پتا چلتا ہے:

مرے کمرے میں یادیں سو رہی ہیں
(کفیل آذر)

پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا
(محمد علوی)

دھوپ پیڑ کے پاس تھکی لیٹی ہے
(باقر مہدی)

برسوں کی جاگتی ہوئی آنکھوں کو خواب دے
(احمد فراز)

وہ چہکتی ہوئی کھڑکی، وہ مہکتے در و بام
(سلطان اختر)

جو پھول باغ میں بے چین ہیں دھڑکنے کو
(ظفر اقبال)

8.2.5 اسلوبیاتی طریقہ کار

کسی ادبی فن پارے کے اسلوبیاتی مطالعے کا بنیادی مقصد اس فن پارے کے اسلوبی خصائص (Style-features) کو نشان زد کرنا ہے، یعنی اس بات کا پتا لگانا ہے کہ ادب میں زبان کے استعمال یا اسلوب کے وہ کون سے خصائص ہیں جن کی وجہ سے یہ فن پارہ دوسرے فن پارے سے منفرد و ممتاز ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے متعلقہ ادبی فن پارے کا لسانیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ لسانیاتی تجزیے کے بعد ہی اس فن پارے کے اسلوبی خصائص کو نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ اسلوبی خصائص، ادب میں زبان کے استعمال کی وہ خصوصیات ہیں جو عام بول چال کی زبان میں بالعموم نہیں پائی جاتیں۔

کوئی ادیب جب مروجہ زبان کا ادبی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ اسے اپنی تخلیقی ضرورتوں کے لحاظ سے اس طرح متشکل (Mould) کرتا ہے کہ اس میں مختلف النوع خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھیں خوبیوں کو ''اسلوبی خصائص'' کہتے ہیں۔ زبان کا ادبی استعمال زبان کا تخلیقی استعمال بھی کہلاتا ہے۔ گویا ایک شاعر یا ادیب اپنی تخلیقی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نئی زبان خلق کرتا ہے جس میں جدت، ندرت، تنوع اور انوکھے پن کے علاوہ نئے لسانی سانچوں، نئی لسانی تشکیلات اور نئے تلازمات و انسلاکات سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں کسی ادبی زبان کو تخلیقی زبان کا درجہ دیتی ہیں۔

کسی ادبی فن پارے کا اسلوبیاتی مطالعہ و تجزیہ لسانیات کی مختلف سطحوں پر معروضی (Objective)، توضیحی اور غیر تاثراتی انداز میں کیا جاسکتا ہے اور ہر سطح پر اس کے (ادبی فن پارے کے) اسلوبی خصائص کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں داخلیت (Subjectively) یا ذاتی پسند و ناپسند کو ہرگز کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لسانیات کی پہلی سطح صوتیات (آوازوں کی تشکیل اور ان کی ترتیب و تنظیم) ہے۔ اس کی دوسری سطح تشکیلیات (تشکیل و تعمیر الفاظ) اور تیسری سطح نحو (فقروں اور جملوں کی ترتیب) ہے۔ لسانیات کی چوتھی سطح معنیات کہلاتی ہے جس میں معنی سے بحث کی جاتی ہے۔

لسانیات کی ان چاروں سطحوں پر کسی بھی ادبی فن پارے کا مطالعہ و تجزیہ بخوبی کیا جاسکتا ہے اور اس کے اسلوبی خصائص کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ہر اسلوبیاتی طریقہ کار کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے، مثلاً کہیں صوتی شماریات یعنی آوازوں کے اعداد و شمار سے کام لیا جاتا ہے تو کہیں لفظی ترکیبی زمروں اور قواعد کے اصولوں سے اور کہیں معنیاتی ہم آہنگی (Semantic Cohesiveness) اور پیش نظر (Foregrounding) سے۔ مختلف ادبی فن پارے مختلف النوع اسلوبی خصائص کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ بات اسلوبیاتی تجزیہ کار کو دیکھنی ہوتی ہے کہ وہ کس فن پارے کے تجزیے کے لیے کون سا اسلوبیاتی طریقہ کار اختیار کرے کہ لسانیات کی کسی بھی سطح پر اس فن پارے کے اسلوبی خصائص کو بہ آسانی نشان زد کیا جاسکے۔

مثال کے طور پر محمد اقبال کی نظم ''ایک شام'' کا صوتیاتی تجزیہ ڈیل ہائمز (Dell Hymes) کے شماریاتی طریقہ کار کو اختیار کرتے ہوئے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے تجزیے کے حسب ذیل مراحل ہیں:

1۔ سب سے پہلے ایک مختصر نظم کا انتخاب کریں جو موضوع اور خیال کے اعتبار سے مربوط ہو۔ (جیسے کہ اقبال کی نظم ''ایک شام'')۔

2۔ پوری نظم کو صوتیاتی رسم خط (Phonetic Alphabet) میں لکھ ڈالیں جس کا اصول یہ ہے کہ ہر صوت کے لیے صرف ایک صوتی علامت (Phonetic Symbol) اختیار کی جائے۔

3۔ نظم میں واقع ہونے والے مصمتوں (Consonants) اور مصوتوں (Vowels) کی دو الگ الگ فہرستیں ترتیب دیں۔ ہر مصمتے اور مصوتے کے سامنے اس کی تعداد وقوع درج کریں یعنی یہ لکھیں کہ زیر تجزیہ نظم میں وہ صوت کتنی بار واقع ہوئی ہے۔

4۔ مذکورہ دونوں فہرستوں میں سے دس بارہ کثیر الوقوع (High-Ranking) مصمتوں اور مصوتوں کو الگ کرلیں اور ان کی ایک علاحدہ مشترکہ فہرست ترتیب دیں۔ ان کثیر الوقوع آوازوں کے سامنے بھی ان کی تعداد وقوع درج کریں۔ سب سے زیادہ وقوع پذیر آواز کو سب سے اوپر درج کریں۔ اس کے بعد بہ لحاظ تعداد دوسری وقوع پذیر آواز کو درج کریں پھر اسی طرح تیسری، چوتھی، پانچویں اور بعد کی آوازوں کا اندراج کریں۔

5۔ کثیر الوقوع آوازوں کی فہرست میں ایسی آوازیں تلاش کریں جنھیں ترتیب دے کر ایک ایسا لفظ یا فقرہ تشکیل دیا جاسکے جو زیر تجزیہ نظم میں پایا جاتا ہو۔ ایسے لفظ کو ''تجمعی لفظ'' (Summative Word) کہیں گے۔ اس لفظ میں دو نمایاں خصوصیات کا پایا جانا لازمی ہے۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ لفظ صوتی سطح پر کثیر الوقوع آوازوں کا مجموعہ ہو اور دوسری

خاص بات اس لفظ میں یہ ہونی چاہیے کہ یہ معنیاتی سطح پر نظم کے مرکزی خیال یا ''تھیم'' (Theme) کی اچھی طرح نمائندگی کرتا ہو۔ اگر زیر تجزیہ نظم کے کسی لفظ میں یہ دونوں خوبیاں مجتمع ہوگئی ہوں تو اسے نظم کا ''تجمعی لفظ'' قرار دیا جائے گا۔

6۔ نظم کے اسلوبی خصائص کو نشان زد کریں۔

اس اسلوبیاتی طریقہ کار کی مدد سے اقبال کی نظم ''ایک شام'' کے تجمعی لفظ کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور نظم کے اسلوبی خصائص کو بھی نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ زیر تجزیہ نظم کا تجمعی لفظ ''خاموش'' ہے، کیوں یہ نظم کے متن میں شامل ہے اور صوتی سطح پر نظم کی کثیر الوقوع، یعنی غالب (Dominant) آوازوں /ش/ اور /خ/ کے امتزاج سے بنا ہے، نیز معنی کی سطح پر یہ نظم کے مرکزی خیال کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت /ش/ ، /س/ اور /خ/ مصمتوں اور /آ / اور /و/ مصوتوں کا بار بار استعمال ہے۔ غالب مصمتوں (ش، س، خ) کی تکرار سے شاعر نے مناظر قدرت میں پائی جانے والی خاموشی، سکوت اور سکون کی کیفیت کو نہایت خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور طویل مصوتوں /آ / اور /و/ کی تکرار سے نظم میں ایک قسم کی حزنیہ کیفیت کی عکاسی کی ہے جس کا اظہار آخری شعر میں نمایاں طور پر ہوا ہے۔ نظم کا پورا تانا بانا انھیں آوازوں سے تیار ہوا ہے، مثلاً:

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے
آغوش میں شب کے سوگئی ہے

یا نظم کا آخری شعر:

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

/س/ ، /ش/ اور /خ/ کو لسانیاتی اصطلاح میں صفیری آوازیں (Fricative Sounds) کہتے ہیں۔ نظم میں ان آوازوں کی تکرار (Frquency) اور تانے بانے (Texture) کو ہم نظم کے اسلوبی خصائص قرار دے سکتے ہیں، کیوں کہ زبان کے عام استعمال میں یا اردو کی کسی اور نظم میں صفیری آوازوں (س، ش، خ) کا اس کثرت سے استعمال دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ یہ امتیاز صرف اسی نظم کو حاصل ہے۔

8.3 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اسلوبیات کی تعریف کی ہے اور اسلوبیات اور لسانیات کے رشتے پر روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں

زبان اورادب کے درمیان گہرے رشتے کو بیان کرتے ہوئے اسلوب کی مختلف تعریفوں سے بھی بحث کی ہے اور اسلوبیاتی طریقہ کار کو بھی واضح کیا ہے۔اس اکائی کے اہم نکات ہیں:

1۔ اسلوبیات ادب کے لسانیاتی مطالعے کا نام ہے، جس میں ادبی فن پارے کا مطالعہ و تجزیہ لسانیات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔

2۔ اسلوبیات کو اسلوبیاتی تنقید بھی کہتے ہیں۔

3۔ اسلوبیات یا اسلوبیاتی تنقید میں ادبی اسلوب کو مطالعے کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔

4۔ اسلوب کا تعلق ادب میں زبان کے استعمال یا ادبی زبان سے ہوتا ہے۔

5۔ اسلوبیات میں اسلوب کی تعریف زبان کے حوالے سے کی جاتی ہے۔

6۔ ہر ادیب کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، کیوں کہ ہر ادیب کا زبان کے استعمال کا اپنا انداز اور طریقہ ہوتا ہے۔

7۔ عام بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں فرق پایا جاتا ہے۔

8۔ ادبی زبان میں زبان کا تخلیقی استعمال کیا جاتا ہے جس میں جدت، ندرت اور انوکھا پن پایا جاتا ہے۔

9۔ ادبی یا تخلیقی زبان اکثر لسانی نارم (Norm)، یعنی زبان کے مروجہ اصولوں اور ضابطوں سے انحراف کرتی ہے جس سے اسلوب میں انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے۔

10۔ ادبی فن پارے کے اسلوبیاتی مطالعے اور تجزیے کا مقصد اس فن پارے کے اسلوبی خصائص کو نشان زد کرنا ہوتا ہے۔

11۔ اسلوبی خصائص لسانیات کی مختلف سطحوں پر پائے جاتے ہیں، مثلاً صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی۔

12۔ ادبی فن پارے کا اسلوبیاتی مطالعہ معروضی ہوتا ہے۔ یہ ادبی تنقید کی طرح داخلی یا تاثراتی نہیں ہوتا۔

8.4 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ زبان اور ادب کے باہمی رشتوں پر روشنی ڈالیے۔

2۔ اسلوبیات کی تعریف بیان کیجیے اور لسانیات کے ساتھ اس کے رشتے کو واضح کیجیے۔

3۔ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟ مختصراً بیان کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ اسلوبی خصائص

2۔ لسانی نارم سے انحراف

3۔ ادبی فن پارے کے صوتیاتی تجزیے کا طریقہ کار بیان کیجیے۔

8.5 سفارش کردہ کتابیں

1۔	شعروزبان	:	مسعود حسین خاں
2۔	ادبی تنقیداوراسلوبیات	:	گوپی چند نارنگ
3۔	آوازاورآدمی	:	مغنی تبسم
4۔	زبان،اسلوب اوراسلوبیات	:	مرزاخلیل احمد بیگ
5۔	تنقیداوراسلوبیاتی تنقید	:	مرزاخلیل احمد بیگ
6۔	اسلوب	:	عابد علی عابد

عملی کام : اردو شعرا کے کلام میں لسانی نارم سے انحراف کی نشان دہی کیجیے، نیز ایسے ہم موضوع اشعار تلاش کیجیے جن میں اسلوب کا فرق نمایاں ہو، علاوہ ازیں اردو کی کسی مختصر نظم کا صوتیاتی تجزیہ کیجیے۔

اکائی 9 ساختیات پس ساختیات

ساخت

9.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ساختیات اور پس ساختیات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ساختیات کا تعارف اور شامل عوامل اور اس کی تاریخ کے علاوہ لسانیات کی نمائندگی کر سکیں
- پس ساختیات کے تعارف اور تاریخ کے ساتھ اس کی ادب میں داخلہ اور اہمیت کی وضاحت کر سکیں
- ساختیات اور پس ساختیات کے باہمی ربط اور ان کے عوامل کے ساتھ دونوں میں تامل کی نشان دہی کر سکیں
- ساختیات کا ربط لسانیات، زبان اور ادب کے ساتھ ساتھ شاعری اور اس کے ادبی اثرات کی وضاحت کر سکیں اور
- پس ساختیات کی لسانی، ادبی اور شعری ہی نہیں بلکہ اس کے سماجی موقف کو نمایاں کر سکیں۔

9.1 تمہید

کسی بھی زبان کے مطالعہ کے دوران لسانی حیثیت سے اس کی مخصوص ساخت ہوتی ہے۔ ہر زبان میں موجود اس کی لفظیات اور جملوں کے علاوہ فقروں کی مخصوص ساخت کو پہچاننے کا عمل ساختیات (Structuralism) کہلاتا ہے۔ اس طریقہ کو انگریزی مفکرین نے لسانیات کے ایک شعبہ کی حیثیت سے شروع کیا، جس میں زبان کی مخصوص ساخت کا جائزہ زبان کے مواد سے علاحدہ رکھ کر پیش کیا جاتا ہے، یہی جائزہ ساختیات کہلاتا ہے۔ ساختیات کے ذریعہ کسی بھی زبان کے افعال کی گردان اور اس کی نحوی خصوصیت کی دریافت ہی نہیں ہوتی بلکہ جملوں، فقروں اور الفاظ کے توسط سے نثر اور شاعری میں جس قسم کا انسلاک پایا جاتا ہے ان لفظی انسلاک اور اس کے متصل اجزا کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر جائزہ لیا جانا ساختیات ہے۔ نثر کے جملوں اور شاعری کے مصرعوں میں پیش کردہ خیالات کے دوران لفظوں کے مرکز اور خیال کی فراوانی کے ساتھ ساتھ زبان کے فشار کی نمائندگی کرنا ہی ساختیات ہے۔ ساختیات کا علم لسانیات سے قریب اور قواعد سے حد درجہ استفادہ کرتا ہے۔ ساختیات کے مترادف کی حیثیت سے وضعیات کی ترکیب کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ ساختیات ایک جدید لسانی طریقہ ہے اور اس طریقہ میں تشکیلی عناصر کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور زبان کی لفظیات میں ساختی تبدیلیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ان لسانی عوامل کی بھی گنجائش پیدا کی جاتی ہے جو کسی جملہ میں لسانی عامل کی حیثیت سے لسانی ساخت میں تشکیل کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اس طرح کسی بھی جملہ یا فقرہ یا شعر میں لسانی عامل کی حیثیت سے پیش ہونے والے وجود کو ساختیہ (Structural Agent) کہا جاتا ہے۔ یہ عامل ایسا ہوتا ہے جو جملہ یا فقرہ یا شعر میں مخصوص تامل کی وضاحت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی مثال کے طور پر ''بے رشتگی'' کی ترکیب کا استعمال کرے تو یہ بتایا جاتا ہے کہ ''بے رشتگی'' جیسا لفظ مکمل لسانی ساخت ہے جس میں تین ساختیں شریک ہوئی ہیں اور ان تینوں ساختوں کے باہمی تامل سے لفظ وجود میں آیا ہے جیسے اس لفظ کی پہلی بنیاد ''بے'' ہے جو منفی خصوصیت کو پیش کرتا ہے جس کے بعد لفظ دوسری ساخت ''رشت'' ہے جو دراصل رشتہ کے ''ہا'' کو حذف کرنے سے پیدا ہوا ہے اور آخر میں تیسرا ساختیہ ''گی'' ہے جسے صرفیہ اور اسمی ساخت کا درجہ حاصل ہے۔ اس طرح ایک لفظ ''بے رشتگی'' کو ساختیاتی انداز سے پیش کرتے ہوئے بتایا جاتا

ہے کہ بے رشتگی میں لسانیات کے تین تعاملات موجود ہیں اور ہر تعامل کی نشان دہی کرنے کا عمل ساختیہ کہلاتا ہے۔ اردو زبان میں ساختیات پر اہم تحقیقی کام انجام دینے والوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وزیر آغا اور سہیل احمد کے علاوہ مرزا خلیل بیگ کو اردو میں ساختیات کی نمائندگی کرنے والے محقق اور ناقدین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مابعد ساختیات کی ترکیب کے ذریعہ کسی ساختیاتی عمل کے دوران ساختیہ کے وجود اور اس میں پائی جانے والی خصوصیت کو نمائندگی دینا پس ساختیات کہلاتا ہے۔ اس اکائی میں لسانیات کے ان خصوصی عوامل سے بحث کرتے ہوئے ساختیات اور پس ساختیات کی نمائندگی اور ان کی خصوصیت سے بحث کی جائے گی۔

9.2 ساختیات کا تعارف

قواعد کے اعتبار سے ہر لفظ کسی نہ کسی دوسرے لفظ سے میل کھا کر معنویت کا علم بردار ہوتا ہے۔ لفظوں کے درمیان باہمی تامل اور ہر لفظ کی مکمل ساخت کے مخصوص انداز کی جان پہچان ہی ساختیات ہے۔ قواعد کے اعتبار سے کسی بھی لفظ کے اندر موجود صوتیوں کو تلاش کیا جاتا تھا اور اس کے ٹکڑے کر کے لفظ کی ساخت بتائی جاتی تھی۔ ساختیات کے جدید علم نے یہ سہولت فراہم کر دی کہ بجائے صوتیہ کے ساختیہ کے ذریعہ کسی لفظ کی درجہ بندی کرنا ہی ساختیات ہے۔ صوتیہ یا Syllable کا استعمال درحقیقت لفظ کے اندر چھپی ہوئی آواز یا صوتی کیفیت کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے جس سے لفظ میں چھپی ہوئی موسیقیت یا ترنم کی خصوصیت کی پہچان ممکن ہے۔ اگر استعمال میں آنے والے کسی لفظ کے آہنگ کو پہچاننا ہو تو صوتیہ کا استعمال کیا جائے گا۔ لسانیات میں آہنگ کے بجائے لفظ کے اندر موجود مختلف ساختیاتی ٹکڑوں کو تلاش کیا جاتا ہے اس لیے اس انداز میں ترنم اور لے کے بجائے صرف لفظوں کے تامل کا داخلہ ہوتا ہے۔ اس لیے ساختیات میں کام کرنے والے رویہ کو ساختیہ (Structural Agent) کہا جاتا ہے۔ ساختیات کے ذریعہ نہ صرف ساختی تبادل (Structural Change) کی طرف توجہ دی جاتی ہے جو کسی لفظی ساخت کے تعاملات میں لسانی ساخت کی نمائندگی کرنے کا وسیلہ ہے۔ اگر مثال کے طور پر ''لڑکیاں'' کے لفظ کی ساختی خصوصیت پر توجہ دی جائے تو پتہ چلے گا کہ اس لفظ میں تین ساختیہ کا عمل داخل ہے۔ پہلا ساختیہ ''لڑ'' کی حیثیت سے شناخت کیا جائے گا جب کہ دوسرا ساختیہ ''ک'' سے وجود میں آئے گا۔ اس لفظ میں حرف جار کا استعمال ہوا ہے یعنی کی کو ''کیاں'' کے طور پر بھی بدلہ گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ''کیوں'' کی حیثیت سے بھی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ جس کی وجہ سے ''لڑکیاں'' جیسے لسانی گروہ کو لڑکیوں میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے جس میں حرف جار ''نے'' اور ''کو'' کی ترکیب بھی استعمال ہوسکتی ہے جیسے لڑکیوں نے، لڑکیوں کو اور لڑکیوں سے کی تراکیب کے ذریعہ ثابت کیا جاتا ہے کہ لڑکیاں کی ساختیاتی حیثیت تین ساختیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن دوسری اور تیسری ساختی کیفیت میں ایک ''ی'' کو حذف کرنا پڑے گا تب کہیں ساختیات کا حق ادا ہوگا۔ جیسے علم ساختیات کے اعتبار سے لڑکیاں کے ساختیے لڑ، کِ اور یاں کی نمائندگی کریں گے جس میں ایک رکن کا ساختیہ بھی موجود ہے۔ غرض آخری ساختیہ کی رکنی کیفیت کو بدل دینے کا عمل ساختی تبادل کہلاتا ہے۔ اس طرح ساختیات کا علم درحقیقت کسی زبان کی لفظیات کی مخصوص ساخت پر توجہ دینا اور اس ساخت کو ساختیوں کے ذریعہ واضح کرنا ہی علم ساختیات کی دلیل ہے۔

9.2.1 ساختیات کے لوازم

ساختیات کی پیشکش کے لیے استعمال ہونے والے تمام عوامل کو ساختیات کے لوازم کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مکمل لفظ اور اس کے اندر موجود مخصوص ساخت کی پہچان بہت ہی آسان ہے جیسے لفظ شوریدہ ادا کیا جائے تو ساختیاتی اعتبار سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ اس میں تین ساختیے استعمال ہوئے ہیں جیسے پہلا ساختیہ ''شو'' اور دوسرا ساختیہ ''ری'' اور تیسرا ساختیہ ''دہ'' قرار پائے گا۔ شوریدہ کی مخصوص ساخت نمایاں کر دی گئی۔ اگر شوریدہ سے شوریدگی کا تعامل پیدا ہو تو اسے ساختی تبدیلی کا درجہ دیا جائے گا اور ثابت کیا جائے گا کہ لفظ میں ساخت کی تبدیلی کیفیت کے ذریعہ اپنی ساخت میں تبدیلی کی خصوصیت پیدا کرتا ہے۔ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو ساختیاتی اعتبار سے تبدیلی کا حق نہیں رکھتے۔ لفظ بندہ سے دو ساختیے نمایاں ہوتے ہیں اور اس کا ساختی تعامل بندگی ہوگا۔ لفظوں کے ساختی تبادل کے بغیر بھی ساختیات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی نے لفظ ''تناظر'' کا استعمال کیا تو اس لفظ میں دو ساختیے جیسے ''تنا'' اور ''ظر'' کا استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی مخصوص ساخت میں ساختی تبدیلی ممکن نہیں۔ اگر مناظر لکھا جائے تو اس کی ساختی تبدیلی مناظرہ بنایا جاسکتا ہے لیکن تناظر سے تناظرہ نہیں بنتا۔ اس طرح تناظر میں ساختی تبدیلی وجود میں نہیں آتی جب کہ مناظر میں ساختی تبدیلی ممکن ہے۔ غرض زبان کی لفظیات کی مخصوص ساخت کو پہچانتے ہوئے اس کی درجہ بندی ساختیے کے ذریعہ کرنا اور ساختیے میں تبدیلی کی گنجائش ہو تو ساختی تبادل کا طریقہ اختیار کر کے لفظ کی ساخت کو اور اس میں موجود ساختیوں کی نمائندگی کرنا ہی ساختیات کہلاتا ہے۔ ساختیات میں شناخت کے درجوں کو متعین کرنا ہی ساختیات کے لوازمات کہلاتے ہیں۔ جن کے ذریعہ نہ صرف ساختیوں کی تعداد کا تعین کیا جاتا ہے بلکہ ساختی تبادل کی بھی نمائندگی کی جاتی ہے اسی عمل کو ساختیات کے نام سے شہرت حاصل ہے جو کئی ساختیوں سے وابستہ ہے۔

9.2.2 ساختیات کی تاریخ

مغربی علوم کے ذریعہ کسی بھی زبان کے آغاز اور اس کے دوسری زبانوں سے رشتہ اور پھر اس کی لفظیات میں وقت بہ وقت پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو پہچاننے کا علم لسانیات کہلاتا ہے جسے انگریزی میں Linguistics کہا جاتا ہے۔ یوروپی زبانوں کے ماہرین نے سب سے پہلے لسانیات کے علم کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے انگریز آفیسر ڈاکٹر گریرسن نے انگریز حکومت کی ایما پر بارہ جلدوں میں ہندوستانی زبانوں کے تعارف کا حق ادا کیا۔ اس کتاب کو ''Linguistic Survey of India'' کا درجہ حاصل ہے۔ لسانیات کی تاریخ جس قدر پرانی ہے اسی قدر ساختیات کی تاریخ بھی پرانی ہے۔ ہندوستان سے سب سے پہلے لسانیات کی تعلیم حاصل کرنے والے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تھے جنھوں نے لندن میں قیام کے دوران علم لسانیات کو انگریزوں سے حاصل کیا اور انھوں نے 1930ء میں انگریزی زبان میں ''Indian Phoentics'' تحریر کی۔ ڈاکٹر زور کا بیشتر کام لسانیات اور صوتیات پر رہا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی لسانیات سے متعلق انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا۔ اگر چہ 1950ء تک حافظ محمود شیرانی نے یوروپ کا دورہ کیا اور اردو لسانیات پر اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' کے علاوہ لسانیات پر کئی لیکچرس دیے لیکن ان کی تحریروں میں بھی ساختیات کا وجود دکھائی نہیں دیتا۔ بلا شبہ انگریزی زبان میں ہی نہیں بلکہ اردو زبان

میں بھی ساختیات کو جدید لسانی اظہار کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں سب سے پہلے تاریخی لسانیات پر توجہ دی گئی۔ چناں چہ شوکت سبزواری، ڈاکٹر مسعود حسین خان اور دوسرے ادیبوں نے ادبی تاریخ کی لسانیات کی نمائندگی کی۔ اردو میں سب سے پہلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ان کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا اور سہیل احمد کے بعد مرزا خلیل بیگ جیسے دانشوروں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے ساختیات کو نہ صرف اردو میں متعارف کروایا بلکہ اس کے اہم نکات کے ذریعہ اردو شاعری ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی لفظیات کی ساختیات پر بحث اور مباحثہ کا آغاز کیا۔

9.2.3 لسانیات اور ساختیات

علم لسانیات سے وجود میں آنے والے الفاظ کی درجہ بندی کرنے والا طریقہ ساختیات کہلاتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے باہمی رشتہ اور ان کے تعلقات کو استوار کر کے لسانیات نے اس میں ایک حد تک اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف جامعات میں باضابطہ لسانیات کے شعبے قائم کیے گئے اور لسانیات کی تدریس کا اہتمام کیا گیا۔ بلاشبہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی اس ملک میں لسانیات کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندوستان کی بیشتر زبانوں کے ناقدین اگر چہ لسانیات سے واقفیت رکھتے تھے لیکن ساختیات کا پس منظر معلوم نہیں تھا، جس طرح آزادی کے بعد ملک کی کئی جامعات کے ذریعہ لسانیات کی تدریس کا اہتمام کیا گیا اسی طرح آزادی کے زائد از نصف صدی کے بعد ساختیات کی تعلیم کا اہتمام ہوا۔ اس طرح ساختیات کی تدریس کا سلسلہ عصر حاضر کی نمائندگی کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کو بلاشبہ لسانیات اور لسانیاتی جائزے سے واقفیت تھی لیکن ساختیات اور پس ساختیات کے موضوعات سے ان کو آگاہی نہیں تھی۔ کسی حد تک جدیدیت پسند ادیبوں نے اطلاق لسانیات کے مطالعہ کے ذریعہ ساختیات کی طرف توجہ دی۔ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت کا دور شروع ہوا تو ساختیات کے علاوہ پس ساختیات کا سلسلہ بھی دراز ہوتا چلا گیا۔ اس طرح ساختیات کو لسانیات کا اہم حصہ قرار دیا جاتا ہے لیکن بیشتر ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں اور نقادوں نے لسانیات کی تعلیم ضرور حاصل کی لیکن ساختیات کے پیچ و خم سے واقفیت حاصل نہ کر سکے۔ اس انداز کی طرف ہندوستانی نقادوں کی توجہ 1970ء کے بعد مرکوز ہوئی۔ اس طرح لسانیات سے ساختیات کی طرف مراجعت کرتے ہوئے ہندوستانی ادیبوں اور نقادوں نے بھی اپنی زبانوں کی لفظیات اور زبان کی ساخت کو نمائندگی دینے کا حق ادا کیا ہے۔

9.3 پس ساختیات کا تعارف

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے پس ساختیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ساختیاتی مفکرین اور ادبی نقادوں میں پیش روکی حیثیت سے رولاں بارتھ کا نام پیش کیا جاتا ہے۔ اس نقاد کو ایک نظریہ ساز اور باغیانہ طبیعت کا مالک دانشور قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس نے معنی کی وحدت کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ادب کو اشیا اور عوامل کی معنی خیزی (Signification) کا پیغام قرار دیا جاتا ہے اور یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ادب صرف معنی خیزی کا نام نہیں بلکہ بنیادی حیثیت سے

فکر کی موجودگی میں متن کی کثیر المعنیت ہی درحقیقت ادب کا ایک حصہ ہے۔اس نے تحریروں کے کئی معنی پیدا کر کے متون کی کثیر المعنیت کا ثبوت فراہم کیا۔رولاں بارتھ نے ژاں ، پال، سارتر سے حددرجہ متاثر ہوتے ہوئے وہ بھی متن کی لازمیت کو غیر ضروری قرار دیا ہے اور یہی ثابت کیا ہے کہ لازمیت اور جبریت کے خلاف بغاوت کی جانی چاہیے۔اس طرح تحریر میں موجود متن کی لازمیت اور جبریت کے علاوہ وحدت اور سالمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ لفظوں کی شکست وریخت میں پیدا ہونے والی وحدت کو اہمیت دیتے ہوئے اس نے مرکز گریز گی (Centrifugal) کی نمائندگی کی۔مرکز کی طرف مائل ہونے والے متن کو اس نے (Centripetal) یا واحد قرار دیا۔اس پس منظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پس ساختیات ایک ایسا عمل ہے جس میں پیش کیے گئے متن میں کثیر معنویت اور مرکز گریز گی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اسے پس ساختیات کا درجہ دیا جاتا ہے۔ پس ساختیات کے دو ادوار کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بتایا ہے کہ ابتدائی دور میں رولاں بارتھ نے پس ساختیات کی نمائندگی کی جس کے بعد دوسرے دور میں لاکاں،فوکو اور کرسٹیوا کے علاوہ ژرگ لاکاں،ژاک فوکو نے پس ساختیات کو نمائندگی دی اور پھر جولیا کرسٹیوا نے ساختیات کی درجہ بندی کا حق ادا کیا۔نقادوں نے مکتبی تنقید کی مخالفت کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ مکتب میں پڑھائی جانے والی تنقید مکمل طور پر نفسیاتی شعور کے معاملہ میں مجرمانہ اور معصومانہ ہوتی ہے۔ان تمام پس ساختیات کے نقادوں نے یہ بتایا کہ لذت کوشی درحقیقت ایک قسم کی خوشی ہے جو لطف ونشاط سے حاصل ہوتی ہے۔پس ساختیات کے علم برداروں نے کسی بھی متن کو آزادانہ پڑھنے اور ادب کو لامحدود سطح پر پیش کرنے کی نمائندگی کی جن کا مقصد یہی تھا کہ کسی بھی فن پارے میں موجود متنیت (Textuality) کو ساخت کا حصہ ہونا چاہیے۔اس اعتبار سے ہر فن پارہ لکھے ہوئے ادب کے ذریعہ لامحدود خصوصیات کا علم بردار ہوتا ہے جس طرح سمندر کی موجوں میں ایک موج کا رشتہ دوسری موج سے استوار ہوتا ہے اس لیے حقیقت پسندی کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی بھی متن کو ''بند متن'' (Closed Text) نہ رکھا جائے بلکہ ہر متن کے نئے معنی اخذ کرنے کی کوشش کرنا ہی پس ساختیات کی دلیل ہے۔متن کے تقاضوں اور اس کے نکاس کے آگے بھی خیالات کی نمائندگی ہوتی ہے اسی نمائندگی کو پس ساختیات کا درجہ دیا جاتا ہے۔یعنی کوئی بھی متن اپنے لکھے ہوئے معنی سے آگے بھی معنی بیان کرتا ہے۔ایسے معنی کی تلاش بلاشبہ پس ساختیات کی دلیل ہے۔اس طرح ساختیات اور پس ساختیات کے ذریعہ بھی تحریری متن کے اندر چھپے ہوئے معنی کی تلاش کو جاری رکھنا ساختیات یعنی متن کے جملوں اور فقروں کی ساخت اور اس میں متن کے اندر چھپے ہوئے معنی کی تلاش کرنا پس ساختیات کہلاتا ہے۔اس طرح یوروپ کی سرزمین سے متن کی مطالعاتی خصوصیت کو پیش کرنے والا علم ساختیات اور پس ساختیات کہلاتا ہے۔جس کی شناخت کے لیے بارتھ، بالزک نے کسی بھی متن کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جنھیں تفہیماتی (Hermeneutic) اور معنیاتی (Semitic) اور علامتی یعنی (Symbolic) اور عملی یعنی (Proairtic) اور ثقافتی یعنی (Cultural) کی حیثیت سے نمائندگی دی گئی ہے۔ ساختیاتی نظام میں معنیاتی نظام کے کوڈ استعمال نہیں ہوتے جب کہ پس ساختیات میں ان معنیاتی پانچ کوڈ کا استعمال ہونا ضروری ہے۔اس طرح کسی بھی متن کو ان پانچ کوڈ کے ساتھ جانچنے کا عمل پس ساختیات کہلاتا ہے۔ساختیات ہی نہیں بلکہ پس ساختیات بھی یوروپی نقادوں کے ذریعہ شروع کردہ ایسی تحریک ہے جس کے ذریعہ پیش کردہ متن کو اس کے معنی کے ساتھ نہیں بلکہ اجزائے معنی کے ساتھ نمائندگی دی جاتی ہے اور معنیاتی کوڈ کا عمل باقی رہتا ہے اور اسی سے پس ساختیات کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔

9.3.1 پس ساختیات کی تاریخ

پس ساختیات کے نظریہ کو فروغ دینے اور اس نئی تھیوری کو متعارف کرنے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ معنیت پر ان کے مضامین کا سلسلہ 1963ء سے جاری رہا اور مختلف علاقوں میں 1987ء اور 1988ء میں انھوں نے خطبات دے کر اس نئے نظریہ کی نمائندگی کی۔ ڈاکٹر نارنگ نے پس ساختیات کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس نظریہ کو پھیلانے والوں کے نام اور ان کی کارکردگی کا مکمل جائزہ لیا ہے چوں کہ پس ساختیات بہ ذات خود ایک نیا نظریہ ہے اسی لیے گوپی چند نارنگ نے ساختیات کی فکر کے نقادوں کے افکار کی توضیح و تشریح پر خصوصی توجہ دی اور یہ بتایا کہ فرانس کے علاقہ میں سب سے پہلے ساختیاتی پس ساختیاتی مفکروں اور نقادوں کا ورود ہوا اور یہ بھی بتایا ہے کہ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے آخری برسوں میں فرانس کے مفکروں نے ساختیات کی جگہ پس ساختیات کی نمائندگی کی۔ ماہرین کا یہ خیال ہے کہ ساختیات میں جو معروضی توقعات پیدا کیے تھے ان میں انسانی نظام اشاریت کو داخل کر کے پس ساختیات کی بنیاد رکھی گئی۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ پس ساختیات کے ماہرین ہی دراصل ساختیات کے ماہرین قرار دیے جاتے ہیں، جنھوں نے ساختیات کی مجبوری کو دور کرنے کے لیے پس ساختیات کی بنیاد رکھی۔ اس طرح ساختیات میں اعضائے صوت کے بجائے معنی نما اور تصور معنی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں لسانی آوازی نظام کی تقلید اور نشانات کی پیش کشی پر توجہ دی جاتی تھی۔ جب کہ ساختیات کے اس عمل سے مثبت وحدت ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ پس ساختیات کے ذریعہ معنی کے رشتہ کو خود مختار بناتے ہوئے متن کے معنی کو واحد نہیں بلکہ اس کے معنی کی دوسری ساخت کا اشارہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح پس ساختیات کے مفکرین کی حیثیت سے انھوں نے پانچ اہم شخصیات کے نام گنوائے ہیں جن میں رولاں بارتھ، ژاک لاکاں، ژاک دریدا، جولیا کرسٹیوا اور مشل فوکو کے نام شامل ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ دریدا نے ردتشکیل کی بنیاد رکھی۔ اس طرح تقریباً تین دہائیوں سے پس ساختیات کے ذریعہ زیادہ تر اس طاقت کی سراغ رسانی کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس کے ذریعہ کوئی بھی لفظ کس طرح معنی در معنی اس کے مفہوم کو نمایاں کرتا ہے اور معنی در معنی اس پیچیدہ نظام کی نشان دہی کرتا ہے جو موج در موج زبان و ادب کی متنیت کی خصوصیت کو واضح کرتا ہے۔ اس طرح کسی بھی متن کے ایک سے زیادہ معنی کی تشکیل پر توجہ دینا، پس ساختیات کی دلیل ہے، جس کی نمائندگی فرانس کے پانچ اہم نقادوں نے کی ہے اور یوروپ کی سرزمین سے ساختیات اور پس ساختیات کا علم تیز رفتاری کے ساتھ مشرقی ممالک کے ادبیات کا حصہ بنتا جارہا ہے اور یہ ثبوت ملتا ہے کہ ساختیات اور پس ساختیات کے نظریات سے متن کی وحدت کی توثیق نہیں ہوتی بلکہ اس میں پوشیدہ معنی کی خصوصیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ژاک دلاکاں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ 1901ء میں بہ مقام پیرس پیدا ہوا، پیشہ کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر تھا۔ 1932ء میں اسے دواخانہ کا چیف بنایا گیا، 1964ء میں اس نے پیرس کی فیڈرل اساس کا آغاز کیا، 1981ء تک وہ ونیسنس یونی ورسٹی کے شعبہ جام فروڈین کا صدر رہا۔ لاکاں کا انتقال 1981ء میں ہوا۔ اسی طرح فوکو کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے 1926ء میں پیدا ہونے کے بعد کالے دی فرانس میں پروفیسر ہوگیا۔ تربیت کے اعتبار سے اس فلسفی نے کثیر تصانیف لکھیں۔ فوکو کا انتقال 1984ء میں ہوا۔ اس نے ڈسکورس کو ذہن انسانی کی مرکزی سرگرمی قرار دیا ہے۔ دریدہ نے ردتشکیل کی روایت کا آغاز کیا۔ اس طرح ساختیات اور پس ساختیات کے ذریعہ جہاں معنیت کی سطح ابھرتی رہی، وہیں ردتشکیل کی خصوصیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

9.3.2 پس ساختیات کا ادب میں داخلہ

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ فرانس سے معنیت کی نئی تشکیل کا نظریہ شروع ہوا اور فرانسیسی نقادوں نے ادب کی تفہیم و ترسیل کے نئے انداز کی نشان دہی کرتے ہوئے سیاسی اور معاشی آئیڈیالوجی سے اختلاف کر کے نئی تنقید کے ذریعہ متن کی آزادانہ حیثیت سے پیش کشی اور فن پارے کو خود مکتفی بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ جس کے ذریعہ فن پارے میں موجود پے چیدہ لسانی شبیہہ یعنی نشان سے معنیت پیدا کرنے پر خصوصی زور دیا گیا اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی تصورات بلاشبہ مابعدالطبعیاتی انداز کو نظر انداز کر کے زبان اور اظہار کی لامحدود آوازوں کو تلاش کرنے پر توجہ دی گئی جس میں کثرالمعنیت کی نمائندگی کی گئی۔ یہ تمام فرانسیسی افکار رفتہ رفتہ دنیا کے زبانوں میں عام ہونے لگے اور رولاں بارتھ کے ابتدائی خیالات کے مطابق (Symbology) یا نشانیات سے آگے بڑھ کر ساختیات کی پہچان اور توقعات کے علاوہ محرکات کی سائنسی تخلیق کا نظام بناتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ ساختیاتی طریقہ کار سے انسانی کلچر کے تمام نظام ہائے نشانات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح فن پارے کے اصل الاصول کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور یہی انداز چاہے تکلم کی زبان میں ہو یا ضومعنوی انداز سے پیش کیا جائے بلاشبہ زبان کے لسانی نظام سے مربوط ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ثابت کیا گیا کہ ساختیات اور پس ساختیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ جس کے تحت فرانسیسی خیالات کو تیز رفتاری کے ساتھ دنیا کی زبانوں میں قبول کیا گیا چناں چہ ہندوستان کی دوسری لسانی خصوصیات کی حامل زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی ساختیات اور پس ساختیات کا چلن عام ہو چکا ہے جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سب سے پہلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان فرانسیسی افکار کی اردو میں نمائندگی کرتے ہوئے متن اور متن کی حقیقت کے لیے ساختیات اور پس ساختیات کی ضرورت اور اہمیت کی نمائندگی کی جس کے نتیجہ میں ان فرانسیسی نظریات کو اردو میں نمائندگی کا حق حاصل ہو گیا۔

9.3.3 پس ساختیات کی اہمیت

متن کے جدید مطالعہ کے اہم نظریہ کی حیثیت سے پس ساختیات کو اہمیت حاصل ہے جس کے ذریعہ نہ صرف کسی بھی متن کے اندر چھپے ہوئے معنیات کی تلاش کی جاتی ہے بلکہ معنی کے اندر موجود حقیقتوں کی جانچ اور پرکھ بھی پس ساختیات کی خصوصیت ہے۔ ادب میں اس نظریہ کے شامل ہونے کی وجہ سے متون کی اہمیت اور اس میں موجود لفظیات کی بندش سے زیادہ مفہوم کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ساختیات کے ساتھ ساتھ پس ساختیات کو بھی اس لیے اہمیت دی جاتی ہے کہ ان نظریات کے ذریعہ جس طرح کسی زمانہ میں صوتیات کا تجزیہ ممکن تھا اسی طرح آج کے دور میں متنیات کا تجزیہ ہی پس ساختیات کہلاتی ہے۔ کسی بھی تحریر کے لکھنے کے دوران لفظیات کے پیچھے چھپے ہوئے معنی و مفہوم اور اس کی صحت کو پیش کرنا ہی پس ساختیات کا رویہ ہے۔ عام طور پر یوروپی مفکرین نے جس طرح ایجادات کے ذریعہ مادی چیزوں میں تغیر لایا ہے اور اس سے انسانیت ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اسی طرح یوروپ کی سرزمین سے زبان، ادب اور متن کو شناخت کرنے کے نئے نئے نظریہ پیش کیے جا رہے ہیں اور ان نظریوں کی پہچان اور اس میں موجود حقائق سے نہ صرف ادبی متون کی تشکیل ہوتی ہے بلکہ ان کی وضاحت میں بھی سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ پس ساختیات کے توسط سے کسی بھی شاعر یا ادیب کے متن کو جانچتے ہوئے لفظیات کے پیچھے چھپی ہوئی

کائنات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح ساختیات کو اگر متن کے ظاہری اصول کو جانچنے کا طریقہ قرار دیا جائے تو پس ساختیات کو متن کے باطنی مزاج کو پرکھنے کا انداز قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مشرقی ممالک کے نقاد ابھی تک متن کی ظاہری کیفیت کو نمائندگی دے رہے تھے جب کہ مشرق میں ہی تصوف کے علم نے ظاہر اور باطن کی بحث کا آغاز کیا لیکن مشرقی ناقدین کی ذہانت متن کی اوپری سطح اور اندرونی کو جانچنے میں ناکام رہی جب کہ اس عمل کو یوروپی مفکروں نے اہمیت دیتے ہوئے متن کی شناخت کے لیے ظاہری عمل ساختیات اور باطنی عمل کو پس ساختیات کے ذریعہ واضح کیا۔ اس طرح فرانس سے ساری دنیا میں پھیلنے والے یہ دو نظریے دنیا کے ادبیات کے متن کو پرکھنے کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان نظریات کے اردو میں شامل ہونے کی وجہ سے متن کی تصدیق کا موقع فراہم ہو جاتا ہے اور اس جدید نظریہ کی اردو میں پذیرائی کی وجہ سے نہ صرف لسانی تحقیق کو فروغ حاصل ہوتا ہے بلکہ متنی تنقید اور متن کے متعلقات کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے اسی لیے پس ساختیات کے نظریہ کو جدید اور عصری نظریہ کی حیثیت سے اردو زبان اور ادب میں قبول کیا گیا ہے جس سے متن کی گہرائی اور اجرائی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

9.4 ساختیات اور پس ساختیات

تحریری یا تقریری متن کی جانچ پڑتال کا جدید انداز ساختیات اور پس ساختیات کہلاتا ہے۔ اس انداز کو فرانس کے مشہور نقادوں نے شروع کیا۔ اردو میں اس انداز کی نمائندگی سب سے پہلے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ذریعہ واضح ہوئی۔ گوپی چند نارنگ نے ساختیات کے دانش وروں کو ہی پس ساختیات کا آئینہ قرار دیا اور مختلف تنقیدی دبستانوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا کہ ساختیات بھی ایک طریقہ تنقید ہے اور اسی طرح پس ساختیات کو بھی انسانی فکر کا امتیازی وصف قرار دیا۔ ساختیاتی فکر انفرادیت پسندی اور ہیومنزم کی نفی کرتی ہے لیکن ساختیاتی مفکرین نے اس رویہ سے سوشلسٹ رنگ بھی پیدا کیا۔ انسانی موضوعات کسی اعتبار سے تشکیل محض نہیں ہوتے بلکہ ان میں معنی کی وحدانیت کے علاوہ کئی متزلزل خصوصیات بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے بتایا کہ ساختیات سے پس ساختیات کی طرف کسی بھی متن کو بے دخلی اور معنی کی وحدانی کیفیت کی جانچ کا وسیلہ بتا کر یہ ثابت کیا کہ ساختیات میں معنی کی وحدت کو تلاش کیا جاتا ہے جب کہ پس ساختیات میں معنی کی تفریقیت کو نمائندگی دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساختیات کو وحدانی خصوصیات کا علم بردار اور پس ساختیات کو وحدت کے ٹانکے کھولنے کا ذریعہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فلسفہ لسان میں ہر حرف اور لفظ کسی نشان کی علامت قرار پاتا ہے اور اسی نشان سے فکر اور معنی کی وحدت قائم ہوتی ہے اور اس وحدت میں تفریق کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس طرح ساختیات بھی ایک سائنسی نظریہ ہے جس میں وحدت کو تلاش کیا جاتا ہے جب کہ پس ساختیات میں تکثیر معنی کی تلاش کی جاتی ہے۔ اس طرح ساختیات کسی جہت کی نشان دہی کرتی ہے تو پس ساختیات کے ذریعہ مختلف جہات کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس طرح کسی بھی متن کا اکہری ساخت کا مطالعہ کلاسیکی ساختیات کہلاتی ہے اور اس میں ایک سے زیادہ معنی کی تلاش اور ہر معنی میں متن کی گہرائی کو تلاش کرنے کا عمل پس ساختیات کی دلیل ہے۔ اس طرح ساختیات اور پس ساختیات کو فرانسیسی مفکرین نے واضح کیا لیکن اس میں موجود معنونیت کی گہرائی اور ساخت کی کیفیت کی وجہ سے دنیا کے مختلف زبانوں کے علوم میں ساختیات اور پس ساختیات کو نمائندگی دی گئی۔ چناں چہ اردو میں بھی تنقیدی نظریہ کی حیثیت سے ساختیات اور پس ساختیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

9.4.1 ساختیات کے عوامل

فرانس کی سرزمین سے شہرت حاصل کرنے والے متن کے تجزیہ کے علم کو ساختیات کہا جاتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے ماہر لسانیات سوسیئر (1857-1913ء) نے سوئٹزرلینڈ کی جینیوا یونی ورسٹی میں مسلسل پانچ، چھ سال تک مختلف خطابات کیے جو 1906ء سے 1911ء تک جاری رہے۔ ان کے شاگردوں نے ان خطابات یا لکچر کو ان کے انتقال کے دو سال بعد یعنی 1916ء میں شائع کیا۔ سوسیئر کی فرانسیسی کتاب کا انگریزی ترجمہ چار دہائیوں کے بعد 1959ء میں شائع ہوا اور زبان کے بارے میں اس کے نظریات اور مجتہدانہ رویہ اور انقلاب آفریں اقدام کو لسانی طور پر اہمیت دی گئی اور وہیں سے ساری دنیا میں ساختیات اور پس ساختیات کی بنیاد مستحکم ہوئی۔ ساختیات میں جہاں زبان کے متن کو اہمیت حاصل ہوتی ہے وہیں زبان کے جامع نظام اور اس کے تکلم اور واقع کو اہمیت دی جاتی ہے۔ نظام ساخت درحقیقت وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ کسی بھی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کی صوتی سطح نہیں بلکہ اس کے لفظ و معنی کی سطح کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ساختیات میں لفظ کے جوڑ اور ان کی درجہ بندی ممکن ہے۔ ہر جوڑ کو ساختیہ اور جوڑ میں رکاوٹ پیدا کرنے والی خصوصیت کو حائل ساختیہ کہا جاتا ہے۔ عام طور پر تشکیلیات میں جملہ کی ترکیب اور کلمہ کے وجود میں آنے سے بحث کی جاتی ہے لیکن ساختیات میں کسی بھی زبان کے معنی نما اور تصور معنی کی نمائندگی ہوتی ہے۔ جیسے کسی بھی جانور کا نام لیا جائے اور اس کو لفظوں میں تحریر کرلیا جائے تو جس طرح لفظ کے لکھنے کے ساتھ اس جانور کا تصور ابھر جاتا ہے اسی طرح زبان کے نشانات سے بھی ابھرنا ضروری ہے جیسے شیر، گائے، بکری، بھینس اور بلی کا ذکر کیا جائے اور لفظوں میں ان کا اظہار کیا جائے تو بہ ذات خود لفظ معنی دیتا ہے لیکن معنی کے تصور کو ابھار دیتا ہے چناں چہ ساختیات کے ذریعہ کسی متن میں موجود اور مستعمل الفاظ کی ساختی خصوصیت اور معنوی خصوصیت کے علاوہ پس معنی خصوصیت کو ظاہر کرنا ساختیات کی دلیل ہے اور یہ عمل ہر زبان کی تحریروں کا حصہ ہوتا ہے۔ جہاں تک لکھی جانے والی زبانوں کا معاملہ ہے ان میں معنی کے ساتھ ہی پس معنی بھی مفہوم کی ادائیگی ہوتی ہے۔ ساختیات میں صرف ظاہری معنی پر توجہ دی جاتی ہے جب کہ پس ساختیات میں باطنی معنی کو پیش نظر رکھ کر متن کی تلاش اور اس میں موجود خصوصیات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اس طرح ساختیات کا وجود جس قدر اہم ہے اسی طرح پس ساختیات کے رویہ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم متن کی لفظیات میں موجود ساختیہ کی تلاش ہی ساختیات کی دلیل ہے۔

9.4.2 پس ساختیات کے عوامل

پس ساختیات درحقیقت یوروپی نقادوں کی فکر کا ایسا دائرہ ہے جس کے ذریعہ نہ صرف متن کی خصوصیت پر توجہ دی جاتی ہے بلکہ اس کے اندر چھپے ہوئے معنی کو بھی نمایاں کرنے کا عمل پس ساختیات کہلاتا ہے۔ پس ساختیات میں جن عوامل کا استعمال ہوتا ہے ان میں کثیر معنیت کو بڑا دخل ہے۔ معنی کی وحدت اور اس کے خلاف رویہ کو معنی خیزی کہا جاتا ہے۔ عام طور پر تصور معنی اور معنی نما کے فرق کو ظاہر کرنا اور اس کے تصور سے پیش ہونے والی فکر کا جائزہ لینا، پس ساختیات کا عمل ہے۔ پس ساختیات میں مرکز گریز کا انداز بھی شامل ہوتا ہے۔ پس ساختیات میں متنیت، ابتدائی عامل ہے جس کے بعد لامحدودیت کو دوسرا عامل قرار دیا جائے

گا۔اسی طرح متن کی تلاش میں ایک رکنی معنی دینے والے متن کو''بند متن'' کہا جاتا ہے۔معنی پیدا کرنے والے عوامل اور معنیاتی نظام کو پس ساختیات میں پانچ اہم خصوصیات سے وابستہ کیا گیا ہے جنھیں پیش نظر رکھ کر پس ساختیات کا عمل واضح ہوتا ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ان پانچ عوامل سے گزارنے والے متن کو پس ساختیات کا درجہ دیتے ہیں چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی متن جب تفہیمات، معنیات، علامت اور عمل کے علاوہ ثقافت کے نظریہ سے تلاش کیا جاتا ہے تو اس تلاش کا عمل بنیادی طور پر پس ساختیات کی دلیل بن جاتا ہے اور اس کے توسط سے کثیر المعنیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔اسی کثیر المعنیاتی پس منظر میں متن کو تلاش کرنا درحقیقت پس ساختیات کی دلیل ہے۔اس طرح متن کے ظاہری معنی ومفہوم کے بجائے اس کے اندرونی معنی کی تلاش کے دوران موضوعیت سے گریز اور لفظی پیکر تراشی سے اجتناب اور صرف متن کے اساس پر تنقید کرنا پس ساختیات نہیں بلکہ اس میں شامل تمام عوامل کو پیش نظر رکھ کر فن پارے کے متن میں چھپے ہوئے جوہر کو تلاش کرنے کا عمل پس ساختیات کہلاتا ہے۔پس ساختیات کو نمائندگی دینے والے اہم یوروپی مفکرین میں پانچ اہم نام نمائندگی کا درجہ رکھتے ہیں جنھیں رولاں بارتھ، ژاک لاکاں، مشل فوکو اور جولیا کرسٹیوا کے نام پیش پیش ہیں جب کہ ژاک دریدہ کو ردتشکیل کا بانی قرار دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ساختیات کے ساتھ ساتھ پس ساختیات کو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے بعد تنقیدی نظریہ کا موقف حاصل ہوا۔

9.4.3 ساختیات اور پس ساختیات میں تامل

جیسا کہ مثال سے بتایا جا چکا ہے کہ ساختیات کو انسانی جسم کا لباس قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا جب کہ انسانی جسم کے اندرونی اعضا کے طور پر پس ساختیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔کسی بھی فن پارے کے متن کے تجزیہ کے ظاہری عوامل ساختیات اور باطنی عوامل پس ساختیات کے ذریعہ نمایاں ہوتے ہیں۔یہ دونوں تنقیدی طریقے فرانس کی سرزمین سے دنیا کے مختلف مقامات تک پہنچ گئے۔ان دونوں طریقوں میں متن کی ظاہری ساخت کو ساختیات کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے اور متن کی باطنی ساخت کی نمائندگی کا عمل پس ساختیات کے پیش نظر وجود میں آتا ہے۔اس اعتبار سے جس طرح جسم اور روح کا باہمی تعلق ہے اسی طرح ساختیات اور پس ساختیات کی رو کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔بغیر جسم کے روح کا وجود بیکار ہے اسی طرح بغیر روح کے جسم زندہ نہیں رہ سکتا۔جیسا کہ بتایا جا چکا ہے لفظ کی ساخت اور اس کی بناوٹ ہی نہیں بلکہ اس میں شامل عوامل کی نشان دہی ساختیات کے ذریعہ ممکن ہے جب کہ پس ساختیات میں کثیر معنی خصوصیات کو تلاش کرتے ہوئے پانچ اہم عوامل کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔اس طرح ساختیات کا دائرہ ظاہری متن پر مرکوز ہے۔جب کہ پس ساختیات کا دائرہ کثیر معنیت سے علاقہ رکھتا ہے۔اس طرح ساختیات اور پس ساختیات میں باہمی تعاون ہونے کے باوجود بھی یہ تعامل دیکھا جا سکتا ہے یہ دونوں ظاہری اور باطنی خصوصیات کے علم بردار ہونے کی وجہ سے ساختیات کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے جب کہ پس ساختیات کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے اس رویہ کو اہمیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔غرض ساختیات سے زیادہ مشکل اور عملی انداز پس ساختیات میں ہے لیکن ان دونوں کے باہمی رشتہ میں موجود تامل کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

9.5 ساختیات اور زبان

تنقیدی رویے کے عصری رجحان کی حیثیت سے ساختیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لازمی طور پر کسی متن میں موجود لفظیات کی ترکیب اور اس میں چھپے ہوئے معنی کی تلاش کا عمل ساختیات کہلاتا ہے۔ لسانی پس منظر میں عالمی سطح پر جب زبانوں کے تاریخی پس منظر اور قواعد کے علاوہ جملے کی ساخت کے پس منظر کو ڈھونڈا جانے لگا تو ساختیات کا وجود ہوا۔ ساختیات کا رویہ لسانیات سے وجود میں آیا لیکن ساختیات کو ایک نظریہ اور تنقیدی عمل کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی شروعات یوروپ کی سرزمین میں ہوئی اور فرانسیسی ماہرین علم زبان کی جانب سے اس رویے کو فروغ حاصل ہوا۔ کسی بھی زبان کے وجود اور اس کے املا و انشا ہی نہیں بلکہ اس کی لفظیات اور قواعد کی ضرورت کی بنیاد پر ہی ساختیات کا دارومدار ہوتا ہے۔ ساختیات اور زبان کے پس منظر میں یہ بات واضح کی جاتی ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان میں موجود الفاظ اور اس میں چھپے ہوئے معنی کی تلاش کی طرف پیش قدمی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جو ساختیات کا پیش خیمہ ہے۔ زبان نہ ہو تو پھر زبان کی لفظیات کی ساخت اور ساخت میں چھپے ہوئے مختلف محرکات کو تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ درحقیقت لفظ اور جملوں میں موجود کسی متن میں چھپی ہوئی معنویت کی تلاش کا عمل لسانی اعتبار سے ساختیات کہلاتا ہے۔ لفظ کی صرفی اور نحوی ترکیب اور جملوں اور فقروں کی خصوصیات کی پہچان کو قواعد اردو کے ذریعہ ممکن ہے لیکن کسی شاعر یا نثر نگار کے لکھے ہوئے فن پارے میں چھپے ہوئے اسلوب کی تلاش کرنا اسلوبیات ہے اور اس اسلوب کی پیش کشی کے دوران جملوں اور فقروں کی ساخت کا اظہار کرنا ساختیات کہلاتا ہے۔ کسی تحریر کو سوالیہ، منفی، مثبت یا پھر خطابیہ اور انکاریہ انداز سے تلاش کرنا کسی لحاظ سے بھی ساختیات نہیں ہوتا کیوں کہ ان تمام نکات کی نشان دہی قواعد کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس کے بجائے الفاظ، جملوں اور فقروں کی ساخت کے ذریعہ کثیر معنویت کی تلاش اور لفظ کی ساختی اور تفاعلی کیفیت کو پیش کرنے کا انداز ساختیات ہے کیوں کہ کسی بھی زبان کے متن کے بغیر ساختیات کا عمل تکمیل نہیں پاتا۔ اس لیے کوئی بھی زبان تحریری شکل میں موجود ہو تو ہی اس کی ساختیات اور زبان کا متن دیا گیا ہو تو ہی اس عمل کی تکمیل ممکن ہے۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ کسی بھی زبان کے بغیر اور اس زبان کے متن کے وجود کے بغیر ساختیات کا عمل ناممکن رہ جاتا ہے۔

9.5.1 ساختیات اور ادب

کسی زبان کے لفظیات کے وجود سے ہی ساختیات کا عمل پورا نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی ادب پارے یا فن پارے سے اخذ کیا گیا متن ہی ساختیات کی ضرورت کو نمایاں کرتا ہے۔ فن پارہ یا ادب پارہ سے مراد صرف ادبی تحریر نہیں بلکہ صحافتی بیان اور عدالتی ثبوت کے علاوہ علمی اور ادبی نکات سے مالا مال تحریر ہی متن کی نمائندگی کرتی ہے۔ عام طور پر شعر و ادب کی تحریروں کو متن کا درجہ دے کر اس میں شامل لفظ اور فقرے ہی نہیں بلکہ جملوں میں ساختیاتی عمل کو تلاش کیا جاتا ہے، اس لیے عام نظریہ یہی ہے کہ ادب کے بغیر ساختیات کی نمائندگی ممکن نہیں۔ نثر کی افسانوی اور غیر افسانوی اصناف کے علاوہ شعر گوئی کے تمام انداز کے توسط سے بھی مصرعوں اور فقروں میں بھی ادب کی صلاحیت کی بنیاد پر ساختیات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے ذریعہ واضح کیا کہ متن میں شامل لفظ کو بطور نمونہ استعمال کر کے اس کے

ذریعہ معنی نما اور تصور معنی کی نشان دہی کرنا ساختیات کی دلیل ہے۔ زبان کو وسیلہ کا درجہ حاصل ہے اور اس وسیلہ سے لفظوں کا سہارا لے کر انسان ادبی پس منظر میں خیالات کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ خیالات نثر میں بھی ادا ہو سکتے ہیں اور شاعری میں بھی ممکن ہیں۔ اس لیے ہر لفظ کسی نہ کسی معنی ومفہوم کے تصور کو نمایاں کرتا ہے حالاں کہ لفظ بہ ذات خود ایک نشان کے طور پر واضح ہوتا ہے۔ چوں کہ ادب کے ذریعہ ترسیل معنی کا کام لیا جاتا ہے اس لیے ادب کی تحریروں کے متون کو اس کی لفظی ساخت اور اس میں موجود واقعہ کی گونج اور حقیقت یا مبالغہ کی صلاحیت کی نشان دہی کرتے ہوئے لفظ کے ظاہری اور پوشیدہ معنوں کی نمائندگی کرنے کا انداز ساختیات ہے۔ ادبی نظریات کے پس منظر میں ساختیات کو ایک نئے تنقیدی دبستان کا درجہ حاصل ہے اور اس کے ذریعہ ہر لفظ کسی شخص کے توسط سے کسی نہ کسی پیام کو دوسروں تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ اس لیے ادب کو رابطہ کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور یہ رابطہ بہ یک وقت جذباتی، تاریخی، شعری، تعبیری اور مافوق لسانی ہوسکتا ہے۔ ان پانچوں عوامل کی تلاش ساختیات ہے جسے تعبیری حیثیت کا علم بردار قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے توجہ کو مرکوز کرنے کے لیے الفاظ کے لسانی نظام میں مرکزیت پیدا ہوگی اور معنی خیزی بھی نمایاں ہوگی۔ لفظوں میں تعبیری خصوصیات، مرکزیت اور لسانی نظام کی تلاش کرنے کا عمل ہی ساختیات ہے اور اس کا اطلاق بلاشبہ ادب اور ادب کی شعری اور نثری اصناف پر ہوتا ہے اس لیے ساختیات کو تنقیدی رویہ اور اس کے توسط سے مکمل معنیاتی نظام کو شکل دینے کا کارنامہ انجام دیا جاتا ہے۔ اس طرح ساختیات اور ادب کی آپسی ضرورت اور لازمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

9.5.2 ساختیات اور شاعری

کسی بھی شعر یا مصرعہ میں نمایاں کیے گئے اظہار کو بھی متن کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کے ہر شاعر کے کلام میں موجود الفاظ کی ساختیات پر توجہ دی جاتی ہے۔ اس عمل کو شاعری میں ساختیات کی تلاش قرار دیا گیا ہے۔ ساختیات کا دائرہ صرف نثر اور نثری متون تک محدود نہیں بلکہ شاعری اور شاعری کی تمام اصناف پر بھی ساختیات کا لزوم ہوتا ہے۔ جس طرح نثر کے متن میں لفظ اور اس کی چھپی ہوئی معنویت کو تلاش کرنے کا عمل ساختیات ہے، اسی طرح شاعری میں بھی کسی شاعر کے کلام اور اس میں استعمال ہونے والے لفظیات سے معنویت میں پیدا ہونے والے نکھار کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ خود گوپی چند نارنگ نے علامہ اقبال کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' کی شاعرانہ کیفیت اور شعری حقیقت کو ساختیات کے ذریعہ پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال نے اس نظم میں الفاظ کی تکرار سے کیفیاتی فضا ہموار کی ہے۔ چناں چہ انھوں نے اقبال کے مصرعہ ''سلسلہ روز وشب، نقش گر حادثات'' کی لفظیات کی ساختیاتی کیفیت پیدا کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اقبال نے اس مصرعہ میں ''س ل، س ل'' کی تکرار اور ''ر ر'' کی تکرار کے علاوہ ''ش ش'' کی تکرار سے مصرعہ میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ''روز وشب'' کے درمیان بھی دو واؤ کی تکرار کی وجہ سے ساختیات میں حسن پیدا ہوگیا ہے۔ اس طرح اقبال کے ایک مصرعہ میں لفظوں کی تکرار کو زیر بحث لاکر گوپی چند نارنگ نے شعری متن سے اخذ ہونے والے ساختیات کی نشان دہی کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف نثری متون کو ہی ساختیات کے ذریعہ پرکھا نہیں جاسکتا بلکہ شعری متون کی بھی ساختیاتی درجہ بندی ممکن ہے۔ اس لیے ساختیات کا اطلاق نثر پر ہی نہیں بلکہ شاعری پر بھی ہوتا ہے۔

9.5.3 ساختیات کے ادبی اثرات

جیسے کہ بتایا جا چکا ہے کہ ساختیات کو ایک تنقیدی نظریہ کا درجہ حاصل ہے اور اس تنقیدی نظریہ کو شروع کرنے والے افراد کا تعلق فرانس کے نقادوں سے ہے۔ فرانس کی سرزمین سے سب سے پہلے ان تنقیدی افکار کو شہرت حاصل ہوئی۔ فرانس کے ماہرین لسانیات نے یہ محسوس کیا کہ کسی بھی متن میں بہ یک وقت انفرادی معنی بھی پوشیدہ ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ کثیر معنی بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ معنی کی وحدت اور کثرت کا دارومدار کسی بھی متن میں موجود معنی خیزی کی دلیل ہے۔ اس لیے ساختیات کے ذریعہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ متن میں شامل الفاظ کو پرکھ کر اس کی معنوی تہہ داری کو تلاش کیا جائے۔ لفظی ساخت اور اس کی کیفیت کی نمائندگی ساختیات کا بنیادی عمل ہے۔ فرانسیسی ناقدوں نے تنقید کے ایک جدید انداز کی حیثیت سے ساختیات کو نمائندگی دی۔ جس کے ذریعہ کسی فن پارے کی لفظیات کی تلاش کی جاتی ہے چوں کہ ساختیات کو نفسیات ہی نہیں بلکہ انسان کے ذہنی تعاملات اور معاشرے کی روشن خیالی یا روایت پرستی سے علاقہ ہے اس لیے ادب میں ایک تنقیدی نظریہ کی حیثیت سے ساختیات کا مطالعہ عصر حاضر کی اہم خصوصیت ہے۔ جس طرح تقابلی تنقید، نفسیاتی تنقید اور جمالیاتی تنقید کے علاوہ دوسری قسم کی تنقیدوں کے ذریعہ فن پارے کی جانچ کا عمل ادبی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح ساختیاتی تنقید کے پس منظر میں فن پارے کی جانچ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم یہ حقیقت پیش نظر رکھی جانی چاہیے کہ مغربی مفکرین نے لسانیات کے پس منظر میں لفظ اور اس کی ساخت پر نظر رکھتے ہوئے ساختیاتی تنقید کا آغاز کیا اور اس تنقید کے ذریعہ عصر حاضر کے معاشرے میں پیش ہونے والے شعری اور نثری متون میں شامل لفظیات کی درجہ بندی اور اس میں درپیش کثیر معنوی یا پھر قلت معنوی کی کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح ساختیات کو ادبیات کی تنقیدی روش کا انداز قرار دیا جاتا ہے۔

9.6 پس ساختیات اور زبان

ایک اہم نظریہ کی حیثیت سے ساختیات اور پس ساختیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے اس مطالعہ میں ادب کے تنقیدی رویہ کو کام میں لایا جاتا ہے۔ اس لیے فرانس سے دنیا کی زبانوں کے ادبیات میں منتقل ہونے والے رویے پس ساختیات کو درحقیقت کسی بھی زبان کی لفظی اور عملی کیفیت کو نمائندگی دینے والا عمل قرار دیا جاتا ہے۔ ابھی تک زبان کی صوتیات سے بحث ہوتی تھی اور کسی زبان میں موجود لفظیات کی آوازوں کی درجہ بندی کی جاتی تھی لیکن یوروپ کے مفکرین کی تازہ سوچ کے نتیجہ میں پس ساختیات کا وجود ہوا۔ جس کے ذریعہ کسی بھی متن میں موجود لفظ اور الفاظ ہی نہیں بلکہ ان کے ذریعہ ساخت کے اندر پھیلنے والی خصوصیت کو تلاش کیا جاتا ہے اس لیے اسے پس ساختیات کہا جاتا ہے۔ بنیادی متن میں پانچ علامتوں کو پیش نظر رکھ کر پس ساختیات کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اس تکمیل کے لیے لامحالہ کسی بھی زبان اور اس کی لفظیات کا تعین ہونا ضروری ہے۔ بغیر کسی زبان اور اس کی لفظیات کے نہ تو ساختیات کا وجود باقی رہتا ہے اور نہ ہی پس ساختیات کے ذریعہ لفظی تفاعل کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ پس ساختیات کی نمائندگی کے لیے پانچ عوامل جیسے تفہیماتی، معنیاتی، علامتی، عملی، ثقافتی انداز پر توجہ دیتے ہوئے لفظی کیفیت میں شامل ان خصوصیات کی تلاش سے ہی فن پارہ یا متن میں زبان کی نمائندگی ہوتی ہے۔ غرض زبان کی لفظیات سے ہی پس ساختیات کا وجود ہے۔ اس لیے ہر زبان کے لفظ کی کثیر معنوی کیفیت کے لیے پس ساختیات کا استعمال کیا جاتا ہے۔

9.6.1 پس ساختیات اور ادب

پس ساختیات کو تنقیدی روش کا علم بردار قرار دیتے ہوئے چوں کہ اس کو ادب کے ایک نظریہ کا درجہ حاصل ہے اس لیے ساختیات کو جس طرح ادبی پس منظر میں جانچا اور پرکھا جاتا ہے اسی طرح پس ساختیات بھی لفظوں کی بندشوں اور اس کے اندر پوشیدہ ہمہ گیر معنوں کو تلاش کرنے کا تنقیدی عمل ہے چوں کہ ادب کی تمام تحریروں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ادب کی جانچ پڑتال کے لیے تنقید کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے پس ساختیات کو بھی کسی بھی زبان کے ادب میں موجود لفظیات اور ان میں شامل خصوصیات کو تلاش کرنے کے ایک عمل کی حیثیت سے قبول کیا جائے گا۔ اس طرح پس ساختیات بھی ادب کی نمائندگی کرنے والا ایسا انداز ہے جس میں لفظ کے اندر چھپی ہوئی معنی کی کئی تہوں کو تلاش کیا جاتا اور اسے بیان کر کے معنویت کی نمائندگی کی جاتی ہے۔ اس لیے پس ساختیات کو بھی ادب کی نمائندگی کرنے والی اہم خصوصی تنقید کا درجہ دیا جاتا ہے۔

9.6.2 پس ساختیات اور شاعری

نثر کے متون ہی نہیں بلکہ شعری متون کو بھی جانچنے پرکھنے کا طریقہ تنقید کے ذریعہ واضح ہوتا ہے چوں کہ موجودہ زمانے کی مغربی تنقید کی ایک منفرد روش پس ساختیات ہے اور اس کے ذریعہ لفظ کے اندر چھپے ہوئے کثیر جہت معنی کی تلاش کی جاتی ہے اس لیے دنیا کی ہر زبان کی شاعری اور شعری حسیت کو بھی پس ساختیات کے ذریعہ جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ شعر میں نثر سے زیادہ نزاکتوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور شاعری چوں کہ وزن اور بحر کے علاوہ قافیہ ردیف کی پابندی کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کی مثالوں سے وابستہ رہتی ہے۔ اس لیے پس ساختیات کے ذریعہ شاعری کو بھی جانچنے کا عمل پورا کیا جاتا ہے۔ عام طور پر پس ساختیات میں چوں کہ حرف و لفظ کی ترکیب کے دوران درپیش تکراری لفظوں کو اعداد کے ذریعہ بھی واضح کیا جاتا ہے اس لیے بعض ناقدین نے ساختیات ہی نہیں بلکہ پس ساختیات کو ادبی عمل کے بجائے حسابی عمل قرار دیا تاہم شاعری کی بحریں اور ان کے افاعیل میں موجود ارکان پر توجہ دی جائے تو وہ بھی حسابی اعداد کی نمائندہ ہیں۔ اسی لیے ساختیات یا پس ساختیات کو حسابی عمل کا درجہ دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان تنقیدی رویوں کی وجہ سے معنویت کی جہتوں اور لفظوں کے اندر پیوست پھیلاؤ کو پیش کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے پس ساختیات کے ذریعہ شاعری اور اس کی اصناف کو پرکھنے کی ضرورت مسلمہ ہے اور اس عمل سے ادب اور شاعری کی خصوصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔

9.6.3 پس ساختیات کا سماجی موقف

یوروپی مفکرین نے پس ساختیات کی بنیاد اس لیے رکھی کہ کسی بھی متن میں شامل ہونے والے الفاظ اور ان کے پیچھے چھپی ہوئی کائنات کو منظر عام پر لایا جا سکے۔ جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے کہ متن کی لفظیات میں موجود ظاہری کیفیت کو تلاش کرنے کا عمل ساختیات ہے اور لفظ کے باطن میں چھپے ہوئے معنی کی تلاش کرنے کے وسیلہ کو پس ساختیات کا درجہ دیا جاتا ہے۔ زبان اور ادب کا کوئی بھی مرحلہ سماج اور معاشرے سے غیر وابستہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن تھا کہ قدیم زمانہ میں پیش کیے جانے والے

ادب اور شاعری میں فوق فطری اور مافوق الفطری خصوصیات کا ذکر بھی ہوتا تھا تو اس دور میں بھی شعری اور نثری زبان میں پیش ہونے والے قصوں کے درمیان طرز معاشرت کا ذکر کرنے کے لیے ہر شاعر یا نثر نگار کو اپنے سماج سے استفادہ کرنا پڑتا تھا۔ چناں چہ داستانوں میں موجود دہلوی اور لکھنوی تہذیب اور آداب معاشرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر فطری قصے لکھنے کے دوران بھی ادب کے ذریعہ سماج اور معاشرے کی نمائندگی ہوتی رہی۔ فرانسیسی ماہرین لسانیات اور نئے نظریات کو پیش کرنے والے نظریہ سازوں نے صرف ساختیات ہی نہیں بلکہ پس ساختیات کو بھی اس وجہ سے منظر عام پر لایا کہ ان دونوں انداز کے ذریعہ نہ صرف لفظی اور معنوی کیفیت کو اجاگر کیا جائے بلکہ اس کے پیچھے چھپی ہوئی سماجی، معاشی اور معاشرتی تفہیمات کا حق ادا کیا جائے۔ اسی طرح معنیاتی سطح پر ایک پرتی، دوپرتی اور کثیر جہتی یعنی ہمہ معنوی کیفیت کی نشان دہی کی جائے۔ اسی طرح کسی نشان یا علامت کے ذریعہ سیاست، معاشرت، معیشت اور تہذیب و اخلاق کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ ہی کسی بھی تحریر میں عملی خصوصیت کو بھی جانچتے ہوئے ہر دور کی ثقافتی ضرورت کے اعتبار سے متن کے لفظیات کا تجزیہ درحقیقت پس ساختیات کی دلیل ہے۔ اس طرز تنقید کے ذریعہ الفاظ کا تجزیہ اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے کسی انسان کا جسمانی، طبی، نفسیاتی اور جنسی اعتبار سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ غرض معنیاتی سطح پر بھی ساختیات اور پس ساختیات کی جانچ کا رویہ ادبی انداز کے ساتھ ساتھ سماجی انداز کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس لیے ان دونوں تنقیدی رویوں کو عصر حاضر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

9.7 خلاصہ

فرانسیسی تنقید کے ماہرین نے جدید تنقیدی نظریات کی حیثیت سے ساختیات اور پس ساختیات کی نمائندگی کی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے پہلی مرتبہ اردو میں ان نظریات کی وضاحت کی جس کے مطابق فرانس کی سرزمین میں سب سے پہلے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں لسانیات کے علم بردار مفکرین نے نئے نظریات کو پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا جس کے تحت ساختیات کو لفظ کے تعملی رشتوں سے جوڑا گیا اور لفظ کی ساخت میں زبان اور زبان کے نشانات اور اس کے عمودی رشتہ کی نشان دہی کی۔ ساختیات اور پس ساختیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ پانچ اشخاص نے اس انداز کی نمائندگی پر توجہ دی جن میں رولاں بارتھ، ژاک لاکاں، مشل فوکو اور جولیا کرسٹیوا شامل ہیں۔ اس اکائی میں ساختیات کے عمل کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اس طرح کسی بھی چیز کا ظاہری عمل، شکل وصورت کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح زبان کی لفظیات کا ظاہری عمل ساختیات ہے جس کے ذریعہ لفظ میں موجود ساختیوں اور ساختی تفاعل کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات میں فرق یہی ہے کہ پس ساختیات کے ذریعہ معنی کی کثیر جہات کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ ساختیات کا دور بھی بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے مربوط ہے اس اکائی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بیانیہ نثر ہی نہیں بلکہ وضاحتی نثر کا جائزہ بھی ساختیاتی عمل کے ذریعہ ممکن ہے اور اسی طرح شاعری کو بھی ساختیاتی انداز سے جانچا جاسکتا ہے۔ یوروپی سرزمین سے ساختیات اور پس ساختیات کا رویہ دنیا کے مختلف ادبیات کی چھان بین کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ ساختیات اور پس ساختیات بنیادی طور پر لسانیات سے تعلق رکھنے والے دو تنقیدی رویے ہیں ان کی تاریخ بھی بیسویں صدی سے وابستہ ہے۔ ان دونوں طریقوں کو رواج دینے والے نقادوں میں رومن جیکب سن، نوام چومسکی کے علاوہ ولادمیر، لیوی سٹراس، نارتھروپ، فرائی اور جوناتھن کلر کے نام مشہور ہیں جب کہ پس ساختیات کے لیے رولاں بارتھ،

ژاک لاکاں، مشل فوکواور جولیا کرسٹیوا کے علاوہ ژاک دریدہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تمام نظریہ سازوں نے بیسویں صدی میں زندگی گزاری اور اہم کارنامے انجام دیے۔ اس اکائی میں ساختیات کی تاریخ اور پس ساختیات کی تاریخ کے علاوہ ادب میں ان دونوں نظریوں کے استعمال کے علاوہ ان میں شامل مختلف عوامل کے ساتھ ساتھ ادب سے ان دونوں نظریات کا رابطہ قائم کرتے ہوئے شعر گوئی کے پس ساختیات کے جائزہ کے لیے علامہ اقبال کی نظم ''ساقی نامہ'' کے ایک مصرعے کی تشریح کی گئی ہے۔ اس طرح اس اکائی کے ذریعہ ساختیات اور پس ساختیات کی نمائندگی پر توجہ دیتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ پس ساختیات کو پانچ عوامل سے جانچنے کے نتیجہ میں یہ نظریہ کسی بھی فن پارے یا متن کو پانچ اہم نکات سے مالا مال کرتا ہے جنھیں تفہیماتی، معنیاتی، علامتی، عملی اور ثقافتی انداز سے جانچنے کی وجہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تنقید کے ان نظریات میں ادبی خصوصیات اور زبان کی لفظی کیفیت ہی نہیں بلکہ سماج اور معاشرے کی خصوصیات بھی شامل ہیں۔ اسی لیے ساختیات اور پس ساختیات کو عصر حاضر کے جدید ادبی نظریات کا علم اور ان کے توسط سے ادب کے شعری اور نثری متون کی جانچ کے طریقہ آسان ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لیے ادبی نظریہ سازی اور تنقید کی نئی جہت کی حیثیت سے ساختیات اور پس ساختیات کو ادب کی تفہیم کے طور پر نمایاں کیا جاتا ہے۔

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ ساختیات کا تعارف دیتے ہوئے اس کے لوازمات اور تاریخ کا جائزہ لیجیے۔

2۔ پس ساختیات کا تعارف اور اس کی تاریخ کے علاوہ اس رویہ کی ادب میں شمولیت کا اظہار کیجیے۔

3۔ پس ساختیات کی اہمیت واضح کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ ساختیات اور پس ساختیات میں موجود فرق کو واضح کیجیے۔

2۔ ساختیات اور پس ساختیات کے عوامل کا ذکر کرتے ہوئے ان دونوں میں موجود تعامل کی نشان دہی کیجیے۔

3۔ پس ساختیات کی تاریخ بیان کیجیے۔

9.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات : گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2004ء

اکائی 10 تدریس زبان

ساخت

10.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں تدریس زبان کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- تدریس کے مقاصد بیان کر سکیں
- تدریس کا طریقہ اور مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کی وضاحت کر سکیں
- زبان کی مہارتوں کی تعلیم، مادری زبان کی تدریس کے طریقہ پر روشنی ڈال سکیں
- اردو بہ حیثیت مادری زبان کیا ہے؟ اس سے متعلق وضاحت کر سکیں اور
- اردو نثر، نظم، قواعد اور تدریس انشا کے طریقہ کار کی نشان دہی کر سکیں۔

10.1 تمہید

تعلیم کو موجودہ دور کا وہ بنیادی اور طاقتور آلہ تصور کیا جاتا ہے جس کے ذریعہ پچھلی صدی میں نسل انسانی نے بے مثال

اور نا قابل یقین رفتار سے ترقی کے منازل طے کی ہیں۔اسی آلہ کے اثر سے اس کی رفتار اور ترقی میں روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ یہاں تعلیم سے ہماری مراد منصوبہ بند اور باضابطہ تعلیمی سرگرمیوں سے ہے۔جن کی بدولت ہی دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تعلیمی سرگرمیوں کو موثر بنانے اور تعلیمی اہداف کو حاصل کرانے میں اصل کردار تدریسی عمل کا ہے جو تعلیمی نشانوں کو حقیقت کا روپ دینے کا ذمہ دار ہے اور جس کی بدولت ہی ہم تعلیمی مقاصد کو عملی شکل میں حاصل ہوتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔تعلیمی نشانوں اور مقاصد کی حصولیابی کی سطح کا اصل دارومدار تدریسی عمل کی اپنی قوت اور اس کے خواص پر ہے۔پچھلی ایک صدی کے دوران سائنس اور ٹکنالوجی نے زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔خود تعلیمی اور تدریسی عمل بھی اس انقلاب سے غیر متاثر نہیں رہا ہے۔سائنسی تحقیقات نے جس قدر ٹکنالوجی اور صنعتی ترقی میں مدد کی ہے شاید اس سے کہیں زیادہ ان تحقیقات نے تعلیم و تدریس کے عمل کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد بہم پہنچائی ہے۔یہ ان مسلسل تحقیقات، غور و خوض اور جدت پسندی کا نتیجہ ہی ہے کہ آج روایتی محاصراتی طریقہ تدریس کے بالمقابل ایسے بے شمار نئے نئے طریقے اور تراکیب موجود ہیں جن کی مدد سے عمل تدریس کو نہ صرف زیادہ کامیاب بنایا جا رہا ہے بلکہ اس کی وجہ سے تعلیم کا عام معیار بہتر بنانے اور بامعنی تعلیم عوام کے مختلف طبقات تک پہنچانے کے امکانات بھی روشن ہو گئے ہیں۔نئی تحقیق کے سبب خود تدریس کے تصور اور دائرۂ عمل میں بھی کافی تبدیلی آئی ہے۔آج کمرہ جماعت میں محض مواد مضمون کا انتقال ہی تدریس نہیں ہے بلکہ تدریس اب ایک بہت پے چیدہ لیکن دلچسپ عمل کی شکل اختیار کر گئی ہے۔اس میں طرح طرح کے آلات و وسائل بھی استعمال ہونے لگے ہیں اور آموزش کے مختلف مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بہت سے طریقے بھی ایجاد کر لیے گئے ہیں۔اس بدلتے ہوئے تعلیمی تناظر میں تعلیمی مقاصد کی بہترین حصولیابی کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس فرد میں بنیادی برتاوی تبدیلی لائی جائے جو تدریسی عمل کے اطلاق کے لیے مرکزی حیثیت کا حامل ہے یعنی مدرس۔اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے تعلیم و تدریس سے متعلق نئی معلومات، نئے تصورات اور وسائل سے روشناس کروایا جائے اور میدان عمل میں اترنے سے پہلے ان مہارتوں سے آراستہ کیا جائے جن کی مدد سے وہ کمرہ جماعت اور اس کے باہر تدریسی عمل کے لیے موزوں حکمت عملی تیار کر سکے اور اسے عملی شکل دے کر طلبہ میں مطلوب برتاوی تبدیلیاں پیدا کر سکے۔غرض اس اکائی میں تدریس، تدریسی زبان، طریقے، اہمیت، مہارت، مادری زبان کی تدریس کے طریقے، اردو بہ حیثیت مادری زبان، نثر، نظم، قواعد اور تدریسی انشا سے واقف کروانا اصل مقصد ہے۔

10.2 زبان کی تدریس کے مقاصد

زندگی کے ارتقا میں زبان کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اگر انسان حیوان ناطق نہ ہوتا تو تہذیب گونگی رہ جاتی۔قوت گویائی کے بغیر نہ ہی فرد کی انفرادی صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں اور نہ ہی سماج کی نشو و نما ہو سکتی ہے کیوں کہ زبان ہی ترسیل خیالات کا سب سے اہم وسیلہ ہے۔اسی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے سے رابطہ قائم کر سکتا ہے اور دوسروں کو اپنے خیالات و جذبات سے واقف کروا سکتا ہے۔زبان اور فکر دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔اسی کے ذریعہ انسانی شعور کی تربیت ہوتی ہے اور تہذیب پروان چڑھتی ہے۔زبان ہی کے ذریعہ انسان اپنے اطراف و اکناف کے حقائق کو تصورات میں ڈھالتا ہے اور ایک نئی دنیا آباد کرتا ہے۔بہر حال زبان ذہنی ترقی کا ایک نہایت لطیف اور موثر ذریعہ ہے۔زبان سیکھنا ایک اکتسابی

عمل ہے جو ہمیشہ نمو پذیر رہتا ہے۔اس کے لیے سماجی ماحول ناگزیر ہے سماج کے بغیر زبان سیکھنے کا تصور بھی محال ہے۔تجربات سے ثابت کیا گیا ہے کہ وہ بچے جو سماج سے محروم رہتے ہیں ان میں زبان کی نشو ونما بھی نہیں ہو پاتی۔

بعض ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ مدرسہ کی تقریباً تمام تعلیم زبان ہی کی تعلیم ہے۔اس قول کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مدرسہ کی مکمل تعلیم زبان ہی کی تعلیم پر منحصر ہے۔اگر زبان کی تعلیم ناقص ہو تو دوسرے مضامین کی تعلیم بھی نامکمل اور ادھوری رہ جاتی ہے۔ مدرسہ کے تمام مشاغل چاہے وہ نصابی ہوں یا پھر غیر نصابی، زبان ہی کے وسیلہ سے مکمل ہوتے ہیں۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زبان کی تعلیم مدرسہ کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

عام طور پر زبان کے دو پہلو ہوتے ہیں۔اس کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔جس کو ہم اظہار مافی الضمیر کہتے ہیں یا پھر دوسروں کی بات سمجھی جاسکتی ہے۔ان میں ہر ایک کی دو صورتیں ہیں (i) اظہار مافی الضمیر ،(ii) دوسروں کی بات سمجھنا۔

(i) اظہار مافی الضمیر

اظہار مافی الضمیر کو دو طرح سے پیش کیا جاسکتا ہے پہلا آواز کے ذریعہ یعنی بولنا اور دوسرا علامتوں کے ذریعہ یعنی لکھنا ہے۔

(ii) دوسروں کی بات سمجھنا

اس میں سنی ہوئی بات سمجھنا اور دوسرا لکھی ہوئی بات سمجھنا، یعنی پڑھنا شامل ہے۔

ان چار بنیادی مہارتوں کے استعمال کے طریقے مختلف ہیں۔جنھیں زبان کے تحت ذریعہ ابلاغ و ترسیل (Language as Communication) کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔جس کے تحت دو زمروں میں تقسیم کریں تو پہلا اپنی بات دوسروں تک پہنچانا اظہار مافی الضمیر یعنی Expression کہلاتا ہے جب کہ دوسروں کی بات کو سمجھنا افہام مطلب یعنی Comprehension کہلاتا ہے جس کے تحت مزید زمرے نکلتے ہیں۔ مافی الضمیر میں تقریری اظہار (بولنا) (Speaking) اور تحریری اظہار (لکھنا) (Writing) شامل ہیں جب کہ افہام مطلب کے زمرہ میں زبانی بات چیت کو سمجھنا (Understanding) جب کہ دوسرے زمرہ میں تحریر کو پڑھنا اور سمجھنا (Reading) شامل ہیں۔ بہ غور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان چار بنیادی مہارتوں میں ہر ایک کئی مہارتوں کا مجموعہ ہے۔مثال کے طور پر بولنا (Speak) جس کے تحت تلفظ (Pronounciation)، لب ولہجہ (Intonation)، روانی (Fluency) اور فصاحت مخارج (Clear Articulation) شامل ہیں۔

2۔ لکھنا (Writing) اس میں ہجے (Spelling)، املا (Script)، اوقاف وعلامات کا صحیح استعمال (Correct Punctuation) اور خوش خطی (Good Hand Writing) شامل ہیں۔

3۔ سمجھنا (Understanding) کے تحت صحیح سننا (Correct Auditory Habits) اور صحیح تلفظ سے واقفیت (Knowledge of Correct Pronounciation) شامل ہیں۔

4۔ پڑھنا (Reading) کے تحت حرف شناسی (Recognition of Letters)، تیز رفتاری سے پڑھنا (Reading with Speed)، خاموش مطالعہ (Silent Reading) اور بلند خوانی (Reading loud) شامل ہیں۔

زبان سکھانے کے یہ چار مقاصد ''افادی مقاصد'' کہلاتے ہیں چوں کہ مدارس میں زبان اور ادب ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوتے ہیں کیوں کہ مدارس میں جو چیز زبان کے نام سے پڑھائی جاتی ہے وہ ادب ہی ہے۔ مذکورہ چار مقاصد کے علاوہ ادب کے تین مقاصد ہیں جو کہ کلچری مقاصد کہلاتے ہیں۔ جس میں ذوق تسلیم کی پرورش، اخلاق کی تربیت وفیصلہ اور تخیل کی مشق شامل ہیں۔

افادی مقاصد

بولنا سکھانا

بہ ظاہر یہ بات بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہوان کو اردو بولنا سکھایا جائے۔ حالاں کہ بولتا ہوا بچہ جب مدرسہ میں قدم رکھتا ہے تو ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اس کو ایک نئے ماحول، ایک نئی فضا اور نئے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بولنے میں جھجھک محسوس کرتا ہے۔ اس لیے اس کو یہاں بولنا سکھانا پڑتا ہے۔ یہاں بولنا سکھانے کا مقصد یہ ہے کہ بچہ بغیر کسی شرم، جھجھک اور بغیر کسی تکلف کے بالکل فطری انداز میں روانی کے ساتھ بات چیت کر سکے اور پھر انھیں رفتہ رفتہ بہتر بولنے کی تربیت دی جائے۔ بہتر بولنے میں از خود صحت لفظ، ادائیگی، روانی اور شائستگی شامل ہے۔ ابتدائی مدارس میں بولنے اور سننے کی تربیت کے لیے درج ذیل مہارتوں پر زور دیا جاتا ہے۔

1۔ تقریری آوازوں پر قدرت حاصل کرانا۔
2۔ الفاظ کی صحیح ادائیگی کی صلاحیت پیدا کرانا۔
3۔ صحیح تلفظ کے ساتھ بولنے کی مشق کرانا۔
4۔ آہنگ اور لہجہ پر قدرت حاصل کرانا۔
5۔ فطری انداز میں بولنے کی عادت ڈالنا۔

پڑھنا سکھانا

مدرسہ کی پرائمری منزل میں پڑھنا سکھانے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ میں اعراب، تلفظ اور ادائیگی کے اعتبار سے عبارت کو صحیح پڑھنے کی تربیت دی جائے۔ پڑھائی عام طور پر دو قسم کی ہوتی ہے۔ جو خاموش مطالعہ یا خاموش خوانی اور بلند آواز کے ساتھ یا بلند خوانی ہے۔ بلند خوانی میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ طلبہ صحت الفاظ، لحن اور روانی کے ساتھ عبارت پڑھ سکیں اور خاموش خوانی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ نفس مضمون کو سمجھ سکیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو اور جملہ کی ساخت اور مختلف شکلوں کی شناخت کر سکیں۔

سمجھنا، سکھانا

صحت کے ساتھ بولنے کا دارومدار صحت کے ساتھ سننے پر بھی ہے۔ سننے کے معنی صرف کانوں کو کھلا چھوڑ دینا نہیں بلکہ صحیح الفاظ کی سماعت کرنا اور موقع محل پر ان کا صحیح استعمال ہے کیوں کہ بچہ سنی ہوئی بات کو جب ہی صحیح استعمال کرسکتا ہے۔ اس لیے سمجھنے کا دارومدار بھی صحیح سننے پر ہے۔ اس لیے ابتدائی مدارس میں سمجھنا سکھانے پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

لکھنا سکھانا

مدرسہ کی پرائمری منزل میں لکھنا سکھانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ اپنے خیالات، مشاہدات اور احساسات کو ضبط تحریر میں لاسکیں۔ مدرسہ کی ابتدائی منزل میں صرف اس بات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ طلبہ جو کچھ سوچتے ہیں اس کو تحریر کردیں وہ جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں صفائی، سادگی اور روانی کے ساتھ لکھ سکیں۔ عام طور پر اساتذہ لکھنا سکھاتے وقت فن کی باریکیوں پر توجہ دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے طلبہ میں بے کیفی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ صحت زبان اور فن تحریر کی جزئیات پر توجہ دیں۔ ان باتوں کا خیال ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے۔

کلچری مقاصد

ذوق سلیم کی تربیت

ذوق سلیم کی تربیت زبان کی تحصیل کا اولین مقصد ہے کیوں کہ جو لوگ پڑھ سکتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ عام طور پر اچھے ذوق سے عاری ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مدرسہ میں اچھے اور برے ادب کو تمیز کرنے کی تربیت نہیں دی جاتی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور پر مدارس میں اور گھروں میں اساتذہ اور والدین کا طلبہ پر نفسیاتی عمل یہ پڑتا ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے ناولیں پڑھنے لگتے ہیں۔ اس لیے انھیں مدرسہ میں ایسی کتابیں فراہم کی جاتی ہیں جس سے ان کے شوق کو ابھارنے اور ان کے ذوق کی بہتر رہنمائی کرنے والی ہوں۔ طلبہ جب ایسی کتب بینی کریں گے تو ان میں ذوق سلیم بیدار ہوگا اور رفتہ رفتہ ان کے ذوق کی نشوونما ہوگی۔

اخلاق کی تربیت

ادب کے مطالعہ کی وجہ سے اخلاق کی تربیت ہوتی ہے۔ ذوق سلیم کی وجہ سے طلبہ میں اچھی اور بری کتابوں کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اچھی کتابیں پڑھنے کی وجہ سے طلبہ کے اخلاق پر بھی مثبت اثر پڑتا ہے کیوں کہ جب بچے اچھی کتابیں پڑھیں گے تو ان کتابوں میں سے اچھی اور کارآمد باتیں اخذ کریں گے اور انھیں اپنانے کی کوشش کریں گے۔ جب اچھی باتیں اپنائیں گے تو خود بہ خود برے کاموں سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ درسی کتابوں میں ہمت الوالعزمی، بہادری، حب الوطنی، ایمانداری اور کفایت شعاری جیسے موضوعات پر مضامین شامل نصاب کیا جاتا ہے۔ ادب کی اخلاقی قدر و قیمت اسی بنیاد پر منحصر ہے کہ اس کی تحصیل سے جذبات پر اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے ادب میں اخلاقی تربیت کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

فیصلہ اور تخیل کی مشق

قوت فیصلہ کا تعلق صرف ادب سے ہی نہیں بلکہ ہماری روزمرہ زندگی سے بھی وابستہ ہے۔اس لیے اس قوت کی تربیت مدارس میں دینا ضروری ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر مختلف چھوٹے بڑے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔اس لیے اگر قوت فیصلہ کی صحیح تربیت نہ ہو تو ہمیشہ انسان کش مکش میں مبتلا رہتا ہے۔ جب تک انسان میں ذوق سلیم صحیح نہ ہو اس وقت تک وہ صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا کیوں کہ ذوق سلیم ہی میں قوت فیصلہ پوشیدہ رہتی ہے۔اس لیے معلم زبان کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ طلبہ میں قوت فیصلہ کی تربیت کریں کیوں کہ اس کا تعلق ادب سے ہی نہیں بلکہ تجربہ حیات سے بھی ہے۔تخیل دماغ کا فعل ہے جو محسوس کرتا ہے۔اس کا تعلق حقائق سے ہوتا ہے لیکن بعض اوقات تخیل کے سامنے حقائق پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے۔ شاعر اور فلسفی ان کو واضح کرتے ہیں اور اپنے تخیل کی دنیا کو حقیقی دنیا سمجھتے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ تخیل کی پرورش کریں جو پڑھنے اور لکھنے سے ہی ہو سکتی ہے۔

مندرجہ بالا افادی مقاصد اور کلچری مقاصد کے علاوہ اردو بہ حیثیت مادری زبان سیکھنے کے مزید مقاصد ہو سکتے ہیں۔ اردو بہ حیثیت مادری زبان کے طلبہ سے دیگر جن مقاصد کی توقع رکھی جاسکتی ہے وہ حسب ذیل ہے:

1۔ طالب علم زبان وادب سے متعلق بنیادی معلومات اور نفس مضمون سے واقفیت حاصل کریں۔
2۔ طالب علم سن کر تفہیم زبان کی صلاحیت پیدا کرے۔
3۔ طالب علم پڑھ کر تفہیم زبان کی صلاحیت کا حامل ہو سکے۔
4۔ طالب علم تقریر کے ذریعہ اظہار مافی الضمیر کی صلاحیت پیدا کر سکے۔
5۔ طالب علم تحریر کے ذریعہ اظہار مافی الضمیر کی صلاحیت کا حامل ہو سکے۔
6۔ طالب علم میں ابتدائی تنقیدی صلاحیت آجائے۔
7۔ طالب علم دوسری زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔
8۔ طالب علم میں صحیح ادبی ذوق کی نشوونما ہو۔

طالب علم کا زبان وادب سے متعلق بنیادی معلومات اور نفس مضمون سے واقفیت حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک طالب علم معنی، الفاظ اور محاورے، قواعد، علم ہجا، علم صرف، علم نحو، مطابقت کلام، جملہ، ترکیب نحوی، رموز واقعات، نثر و نظم، اصناف سخن جیسے نظم، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعات وغیرہ سے کماحقہ واقفیت رکھتا ہو۔اس طرح طالب علم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان بنیادی معلومات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ان کا اعادہ کرے اور بنیادی معلومات کی شناخت کر سکے۔

10.3 تدریس

تدریس کا مفہوم (Meaning of Teaching)

تعلیم میں تدریس کا وہی مقام ہے جو جسم میں ریڑھ کی ہڈی کا ہوتا ہے۔جس طرح ریڑھ کی ہڈی جسم کی ساخت کو بنائے رکھتی ہے اس طرح تدریس تعلیم کے عمل کو موثر بنانے میں اہم رول انجام دیتی ہے۔تعلیم اور تدریس میں نمایاں فرق موجود

ہے۔ تعلیم کا تعلق 3R's یعنی پڑھنا (Reading)، لکھنا (Writing) اور ریاضی (Arithematic) سے ہے جب کہ تدریس کا تعلق بچہ کی ہمہ گیر شخصیت کی نشوونما سے ہے۔ اس اعتبار سے ایک معلم کو بچے کی ذہانتی، جذباتی، سماجی، روحانی، جسمانی اور اقداری صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما پر توجہ دینا ضروری ہے۔

تدریس کی تعریف (Definition of Teaching)

ایڈمیرل امیڈان (Admiral Amidon) کے مطابق:

''تدریس سے مراد کمرہ جماعت میں معلم اور طالب علم کے درمیان انجام دیے جانے والا عمل ہے۔''

کلارک (Clark) کے مطابق:

''تدریس میں وہ تمام تنظیمی سرگرمیاں شامل ہیں جو طالب علم کے کردار میں تبدیلی لانے کا باعث بنتی ہیں۔''

گرین (Green) کے مطابق:

''تدریس ایک پیشہ ہے جس میں ایک معلم، بچہ کی ترقی کے لیے مفوضہ کام کو انجام دیتا ہے۔''

تدریس کی خصوصیات (Characteristics of Teaching)

تدریسی عمل کی مرحلہ وار تفصیل کے لیے درج ذیل خاکہ غور سے ملاحظہ کریں:
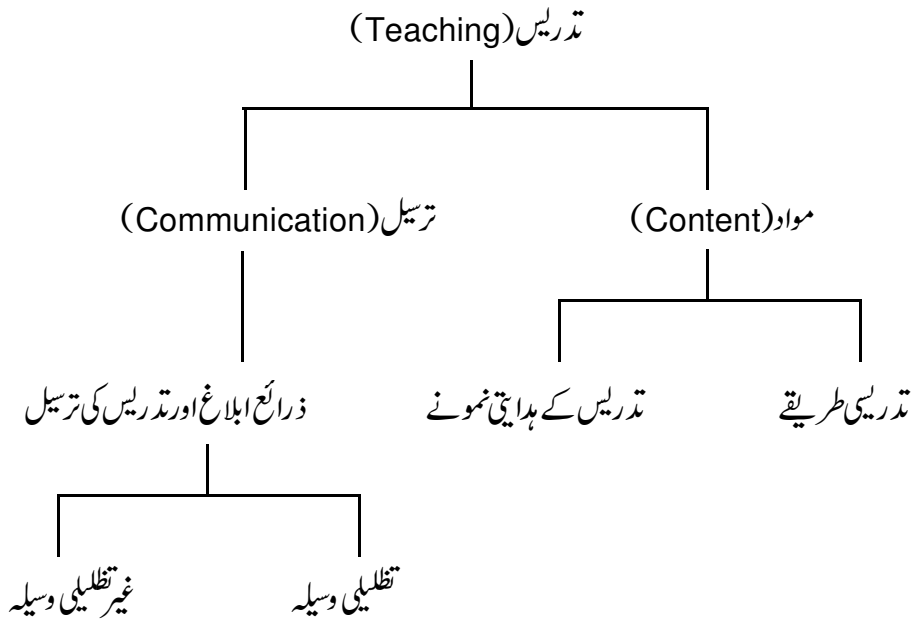
تدریس کیا ہے؟

تدریس ایک پیچیدہ سماجی مظہر ہے۔
تدریس ایک فن ہے۔
تدریس ایک سائنس ہے۔
تدریس ایک پیشہ ہے۔
تدریس بنیادی طور پر ایک ترسیلی عمل ہے۔
تدریس کا عمل مختلف طریقوں سے انجام پاتا ہے۔

موثر تدریس کی خصوصیات(Characteristics of Effective Teaching)

موثر تدریس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1۔ موثر تدریس محرکہ پیدا کرتی ہے۔
2۔ موثر تدریس منصوبہ بند ہوتی ہے۔
3۔ موثر تدریس جمہوری ہوتی ہے۔
4۔ موثر تدریس شفیق اور ہمدرد ہوتی ہے۔
5۔ موثر تدریس تشخیص کار اور اصلاحی ہوتی ہے۔
6۔ موثر تدریس کے لیے قابل معلم ضروری ہے۔

موثر تدریس کے لیے ایک معلم میں حسب ذیل خصوصیات ضروری ہیں:

1۔ معلم کا ذہین ہونا ضروری ہے۔
2۔ معلم کو مواد مضمون پر عبور ہونا چاہیے۔
3۔ معلم میں موثر ترسیل کی مہارت ہونی چاہیے۔
4۔ معلم طلبہ کی نفسیات سے واقفیت رکھنے اور طلبہ کے برتاؤ یا کردار میں تبدیلی لانے والا ہو۔
5۔ معلم پر اثر شخصیت کا حامل ہے۔
6۔ معلم طلبہ میں محرکہ پیدا کرنے والا ہو۔
7۔ معلم طلبہ کی انفرادی اختلافات کی نشاندہی کرنے والا اور نقائص کو دور کرنے میں مدد دینے والا ہو۔

اکتساب کا تصور(Concept of Learning)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دانش مندی، علم، فراست کی دولت سے نوازا ہے۔ ان ہی عطیوں سے انسان اپنے تجربات سے مستفید ہوتا ہے۔ اکتساب ایک زندگی بھر جاری

رہنے والا اور تجربات سے مالا مال عمل ہے۔اکتساب ہی انسانی نشوونما کی بنیاد ہے۔اس لیے تعلیمی میدان میں یہ ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔تدریس کا وہ عمل بے معنی ہے جس میں اکتساب نہ پیدا ہو۔اکتساب کے ذریعہ ہی طلبہ میں تعمیری اور مطلوبہ کرداری تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔

اکتساب کی تعریف(Definition of Learning)

گیٹس(Gates)کے مطابق ''اکتساب دراصل تجربات کے ذریعہ رویہ یا کردار میں تبدیلی ہے۔جب کہ کنگسلے اور گیری(Kingsley & Gary)کے مطابق ''اکتساب ایک عمل ہے جس سے کردار میں مشق یا تربیت کے ذریعہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔''اسی طرح کرو اینڈ کرو(Crow & Crow)کے مطابق ''اکتساب دراصل اچھی عادتوں،علم اور رویوں کے حصول کا نام ہے۔اس کے لیے نئے طریقے درکار ہوتے ہیں فرد کی ان کوششوں میں عمل پذیری ہوتی ہے اور وہ اکتساب مشکلات پر قابو پانے یا نئے حالات سے ہم آہنگ ہونے کے لیے کرتا ہے۔''

میلوین ایچ۔مارکس(Malvin H. Marx)کہتا ہے کہ ''اکتساب کردار میں نسبتاً ایک مستقل تبدیلی ہے جو سابقہ کردار کی ایک کارکردگی ہے(جس کو عموماً مشق کہتے ہیں)۔

اکتساب کی خصوصیات(Characteristics of Learning)

- اکتساب عالم گیر اور مسلسل ہوتا ہے۔
- اکتساب ایک تسلسلی عمل ہے،جس کا آغاز پیدائش سے ہوتا اور عمر بھر جاری رہتا ہے۔
- اکتساب عام طور پر با مقصد ہوتا ہے۔مقاصد کی کامیابیوں کی طرف رواں رکھتا ہے۔
- اکتساب،فرد کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے نئے طریقوں سے آگاہ کرتا ہے۔
- اکتساب زندگی کو جہت دیتا ہے اور زندگی کی پیچیدگیوں سے نمٹنے میں مدد کرتا ہے۔
- اکتساب فرد کے فروغ کا واحد ذریعہ ہے۔
- اکتساب انسان کو حالت جمود سے نکال کر فعال بناتا ہے۔
- اکتساب با مقصد اور محرک ہوتا ہے۔

تدریس اور اکتساب(Teaching and Learning)

تدریس اور اکتساب دو ایسے تصورات ہیں جن کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔گویا تدریس اور اکتساب ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔اس لیے تدریس میں اکتساب نہ ہو تو ایسا تدریسی عمل بیکار ہے۔بعض مخصوص حالات میں کوئی فرد خود اکتساب کے ذریعہ اپنے شخصی رجحان کے ذریعہ سیکھتا ہے اور بعض اوقات ہم،رسمی یا غیر رسمی طریقہ پر بھی اندرونی محرکہ اور دلچسپی کے ذریعہ بھی سیکھتے ہیں۔بعض اوقات دلچسپی اور سیکھنے کی خواہش نہ رکھنے والا موثر تدریس کے باوجود بھی سیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

ظاہری طور پر تدریس اور اکتساب میں مماثلت نظر آتی ہے لیکن ان کے درمیان فرق پایا جاتا ہے جسے حسب ذیل جدول میں پیش کیا گیا ہے۔

تدریس بہ مقابلہ اکتساب(Comparison between tecahing learning)

نمبر	تدریس(Teaching)	نمبر	اکتساب(Learning)
1	تدریس ایک پیچیدہ گروہی عمل ہے جو کئی ایک دوسرے سے متعلقہ سرگرمیوں جیسے لکچر، مظاہرے، ہدایات، معلومات، ستائش، ہمت افزائی وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے	1	اکتساب ایک انفرادی واحد سرگرمی ہے یہ وہ سرگرمی ہے جسے فرد اپنے آپ اپنی مرضی سے انجام دیتا ہے
2	تدریس میں مقاصد پہلے سے ہی متعین کیے جاتے ہیں	2	اکتساب کے مقاصد تدریس کے نتائج ہوتے ہیں
3	تدریس ایک سماجی عمل ہے جسے سیکھنے والے کو فائدہ پہنچانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے	3	طالب علم کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا انفرادی عمل ہے
4	تدریس ایک بامقصد عمل ہے	4	یہ کامیابی یا مقاصد کے حصول کی راہ دکھاتا ہے
5	تدریس ایک مفوضہ کام ہے جو اکتساب کی انجام دہی کا ذریعہ بنتی ہے	5	تدریس کے ذریعہ اکتساب حاصل ہوتا ہے
6	تدریسی عمل معلم کے ذریعہ انجام پاتا ہے جس میں مہارتیں، استعداد شامل ہیں۔ یہ کامیاب یا ناکام ہوسکتی ہے	6	اکتساب سیکھنے والے کی دلچسپی پر منحصر ہوتا ہے

10.4 طریقہ تدریس

تدریس کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے چوں کہ تدریسی عمل میں معلم کا سابقہ ایک بچے سے رہتا ہے جو ایک زندہ ہستی ہے جس کی اپنی خواہشات اور دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ تدریس میں اگر اس کی آمادگی، دلچسپیوں اور سابقہ معلومات کا لحاظ رکھا جائے تو معلم کی لگاتار کوشش بھی اس سمت میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکتیں اس لیے معلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طریقہ تدریس سے واقف رہے اس کے لیے معلم کا تدریسی مراحل سے واقف ہونا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کا سب سے اہم مفکر تعلیم جان ڈیوی کا فلسفہ تعلیم افادیت یا تجربیت یا(Pragmaticism) کے نام سے مشہور ہے۔ اس فلسفہ کا خاص اصول یہ ہے کہ پہلے سے متعین اور دائمی قدروں کی کوئی حقیقت نہیں۔ انسان اپنی قدریں خود بناتا ہے۔ افادیت کے مطابق سچائی وہ ہے جو طبع انسانی کے مطابق ہو اور جس کی تصدیق تجربہ سے کی جاسکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کارآمد ہے وہی حق ہے۔ افادیت کی اصل بنیاد تبدیلی ہے۔

ڈیوی کے نزدیک طریقہ تدریس ایسا ہونا چاہیے جو زندگی کے حقیقی مسائل سے مطابقت رکھتا ہو کیوں کہ اس کے نزدیک عمل اور تجربات کے ذریعہ علم حاصل ہوتا ہے اس لیے وہ بچوں میں تفکر کی صلاحیت کو نشوونما دینے پر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے

کہ سبق آموز تجربہ تفکر کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔تفکر کا لازمی نتیجہ علم ہوتا ہے اور علم سے فائدہ اٹھانا بھی تفکر پر منحصر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موجودہ طریق تعلیم میں بچوں کے سامنے بنے بنائے درسی مضامین رکھ دیے جاتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بچوں کو غور و فکر پر آمادہ کر دیں گے۔مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس کے نزدیک بغیر عمل کے غور وفکر کا مادہ پیدا نہیں ہوتا۔اس نے اس عمل کے پانچ مدارج بتائے ہیں۔ جسے وہ ''عمل تفکر'' کہتا ہے(i) کسی مشکل کا احساس،(ii) اس کا تعین اور تعریف،(iii) ممکن حل کے لیے تدابیر،(iv) استدلال کے ذریعہ صورت حال کی کیفیت اور حالات کی فصاحت اور(v) مزید مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ قبول کرنے یا ترک کرنے کی منزل پر پہنچنا۔عمل تفکر میں آخری قدم یہ ہوگا کہ نئے حاصل کردہ خیال کا کہیں اطلاق کیا جائے تاکہ جو کچھ سیکھا ہے وہ واقفیت کا رنگ پاکر اور پختہ ہو جائے۔اس طریقہ تعلیم کی مثال ڈیوی کا منصوبی طریقہ ہے جس میں بچوں کے ذاتی مسائل کے حل کی کوشش کی جاتی ہے کیوں کہ وہ بچوں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں اس لیے وہ بہت محنت اور شوق سے اس کے حل میں دلچسپی لیتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں نصابی تعلیم کو موثر بنانے کے لیے تدریسی آلات کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔اس کے لیے مختلف قسم کے ساز وسامان اور دیگر وسائل استعمال کیے جاتے ہیں۔ان امدادی تدریسی آلات میں سمعی وبصری آلات کا استعمال کیا جاتا ہے ان کے علاوہ اسباق کو موثر بنانے کے لیے دیگر ادبی مشاغل منظّم کرنا بھی ضروری ہے۔ترقی یافتہ ممالک میں تدریسی آلات اور ادبی مشاغل پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس پر اتنی توجہ نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے تعلیمی ادارے جدید امدادی وسائل سے محروم یا محدود ہو جاتے ہیں۔تدریس کو موثر اور دلچسپ بنانے کے لیے امدادی مسائل جیسے تختہ سیاہ، چارٹس وتصاویر، ماڈل، فلم پروجیکٹر، اپیڈ سکوپ، گراموفون اور لنگوافون، ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم وغیرہ۔

مندرجہ بالا تدریسی آلات میں چند ایسے ہیں جو سماعت سے متعلق ہیں اور چند بصارت سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو سماعت اور سماعت دونوں سے متعلق ہیں۔اس طرح تدریسی آلات تین قسم کے ہیں۔

سمعی آلات جیسے گراموفون، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر۔

بصری آلات جیسے تختہ سیاہ، چارٹ وتصاویر، ماڈل، فلم پروجیکٹر، اپیڈ سکوپ۔

سمعی وبصری آلات جیسے ٹیلی ویژن اور فلم۔

تدریسی آلات سے تعلیم کو موثر اور دلچسپ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمارے تصورات بڑی حد تک بصری اور سمعی تجربات پر مبنی ہوتے ہیں اور ان سے درج ذیل تعلیمی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

1۔ سمعی وبصری وسائل سے تجربات وسیع ہوتے ہیں۔

2۔ ایتلاف مادی کے ذریعہ الفاظ وتصورات کو سمجھنے میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

3۔ تصورات کی تفہیم میں طلبہ کو کم وقت درکار رہوتا ہے۔

4۔ سمعی وبصری وسائل کے ذریعہ مستند معلومات حاصل ہوتے ہیں اور حصول معلومات کا عمل سہل اور آسان ہو جاتا ہے۔

5۔ ان وسائل کے ذریعہ تحسین کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

6۔ ان کے توسط سے بہم اور پے چیدہ تصورات کی تفہیم میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

7۔ سمعی و بصری وسائل کی مدد سے خیال آرائی کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور مشاہدہ کی قوت بڑھتی ہے۔

چناں چہ ان فوائد کے پیش نظر معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ درج ذیل آلات کے استعمال سے واقف ہوں:

1۔ تختہ سیاہ
2۔ چارٹ اور تصاویر
3۔ ماڈل
4۔ فلم پروجیکٹر
5۔ اپیڈسکوپ
6۔ گراموفون اور لنگوافون
7۔ ٹیپ ریکارڈر
8۔ ریڈیو
9۔ ٹیلی ویژن

تختہ سیاہ کا استعمال تلفظ کی مشق اخذ معنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جب کہ چارٹ اور تصاویر زبان کی تدریس میں معاون ثابت ہوتا ہے تاہم ثانوی درجات میں اس کے استعمال کی محدود گنجائش ہوتی ہے جب کہ ماڈل کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح فلم پروجیکٹر کا استعمال تدریس کے دوران اکثر و بیشتر ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر سے واقف کروانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اپیڈسکوپ کا استعمال تصاویر بڑے دکھانے یا پھر مسودوں کے صفحات سے واقف کروایا جاتا ہے۔ گراموفون اور لنگوافون درس و تدریس کے دوران اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ گراموفون سے تلفظ اور ادائیگی الفاظ کی تربیت، ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ کسی بھی قسم کے پروگرام کو محفوظ کر کے ضرورت کے مطابق سنایا جاسکتا ہے۔ سائنس وٹکنالوجی کے دور میں تدریس کے دوران ریڈیو کی اہمیت کافی زیادہ ہے۔ ریڈیو اسباق کے ذریعہ تلفظ کی ادائیگی اور صحت وصفائی کے ساتھ بولنے اور پڑھنے کی مشق کروائی جاسکتی ہے۔ ٹیلی ویژن زمانہ کے لحاظ سے عام ہوگیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ادبی وتہذیبی پروگراموں کے علاوہ ریڈیو اسباق سے بھی طلبہ کو مستفیض کیا جاسکتا ہے۔ ٹیلی ویژن میں چوں کہ سمعی اور بصری دونوں وسیلے بہ یک وقت استعمال ہوتے ہیں اس لیے بہت موثر ہوتے ہیں جب کہ فلم ایک موثر لیکن مہنگا ذریعہ ہے۔ تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لیے فلمیں بنانے کا کام ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ تاہم ترقی یافتہ ممالک میں اس وسیلہ کا کافی زیادہ استعمال ہے۔ فلم کے ذریعہ سے زبان وادب کا ذوق پیدا کیا جاسکتا ہے۔

10.5 مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

ماہرین تعلیم اس بات سے متفق ہیں کہ بچہ اپنی مادری زبان کے ذریعہ جس آسانی سے تعلیم حاصل کرسکتا ہے وہ غیر زبان کے ذریعہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ بچہ جب غیر زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرے گا تو سب سے پہلے اس کو غیر زبان سیکھنا پڑے گا۔ جس کے لیے وقت درکار ہوگا جیسے اگر انگریزی ذریعہ تعلیم ہو تو بچہ کی توجہ دو حصوں میں بٹ جائے گی، ایک زبان کی طرف اور

دوسرے اس مضمون کی طرف جس کی وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اگر مادری زبان ذریعہ تعلیم ہوگا تو بچہ کو یہ دقت نہ ہوگی۔

تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچہ کو ایسا ماحول فراہم کیا جائے جس میں وہ علم حاصل کر سکے، معلومات حاصل کر سکے اور اس دنیا میں میں رہنے کے طور طریقے سیکھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بچہ مدرسہ میں جو تربیت حاصل کرے وہ اس کو آئندہ زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ اس حقیقت سے زبان ایک بنیادی ذریعہ ہے جو ایک دوسرے سے تعلقات کو استوار کرنے اور خیالات کو ظاہر کرنے کا موثر ذریعہ ہے اسی لیے مادری زبان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

بچہ جب پہلی مرتبہ اپنی ماں کے منہ سے الفاظ کو سنتا ہے اور ان کو سمجھتا ہے تو خود بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہی بچہ کی مادری زبان ہے۔ اس مسلسل نقل اور مشق کی وجہ سے بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ زبان کو سیکھ سکے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو مادری زبان سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ وہ مادری زبان بھی خود بخود سیکھ جاتا ہے۔ آج کے دور میں مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم اور تہذیب کا ایک موثر ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں بھی مادری زبان کو وہ مرتبہ اور مقام دیا گیا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ یہاں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مدرسہ میں مادری زبان کی اہمیت صرف ایک مضمون کی حیثیت سے نہیں بلکہ مادری زبان مدرسہ کے تمام افعال کی بنیاد تسلیم کی گئی ہے۔

مادری زبان کی بہت زیادہ اہمیت اس لیے بھی ہے کہ زبان اور خیالات کا ایک دوسرے سے بہت قریبی تعلق ہے کیوں کہ بچہ ہمیشہ اپنی مادری زبان ہی میں سوچتا ہے اور اپنی زبان ہی میں خواب دیکھتا ہے۔ مادری زبان اور مادری زبان کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ بچہ کی نشوونما کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ یعنی علم کی نشوونما، صلاحیت کی نشوونما، ذہانت کی نشوونما اور تخلیق کی نشوونما کا انحصار بھی اسی پر ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں مادری زبان بڑا ہی اہم رول ادا کرتی ہے کیوں کہ مادری زبان کا شعر و ادب جذبات پر جو اثر ڈالتا ہے وہ دوسری زبان کے شعر و ادب پر نہیں ڈال سکتا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچہ کی تعلیم و تربیت کے لیے مادری زبان سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

10.6 زبان کی مہارتوں کی تعلیم

کسی بھی زبان کی تعلیم کا مقصد بچہ میں چار طرح کی صلاحیتیں پیدا کرنا ہے۔ یعنی سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا۔ سننے سے مراد سن کر سمجھنا، بولنے کا مطلب گفتگو میں صحیح زبان کا استعمال کرنا، پڑھنے کا مطلب ہے مخصوص رسم الخط میں لکھے ہوئے مواد کو پڑھنا اور لکھنے سے مراد مخصوص رسم الخط میں عبارتوں کا لکھنا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سننے اور بولنے کے لیے کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں بلکہ خود بخود دونوں باتیں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن حقیقتاً بولنے اور سننے میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے بھی تعلیم ضروری ہے کیوں کہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ''بچوں میں بول چال کی صلاحیت کا پیدا ہونا سیکھنے کے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صرف پیدائشی صلاحیتوں کے پختہ ہونے کا نتیجہ ہے۔''

زبان کی تعلیم کا دارومدار ماحول پر ہوتا ہے۔ مادری زبان کی تعلیم کے لیے بچہ اپنے گھر کا ماحول پاتا ہے لیکن اس ماحول میں مادری زبان کی تعلیم کے تمام عناصر موجود نہیں ہوتے اور زبان کی درستگی کے مواقع بھی پوری طرح فراہم نہیں ہو پاتے کیوں کہ زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے مکمل وسائل گھر کے ماحول میں مفقود ہوتے ہیں۔ اس لیے اچھی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے

اسکول اور با قاعدہ تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔

زبان سیکھنے کا عمل اکتسابی ہوتا ہے اور ہر وقت جاری رہتا ہے۔ جیسے جیسے بچہ کی نشو ونما ہوتی ہے ویسے ہی بچہ کا یہ عمل بھی جاری رہتا ہے لیکن اس کے لیے سماجی ماحول کا ہونا بھی از بس ضروری ہے کیوں کہ سماج میں بغیر زبان سیکھنے کا عمل ناممکن ہے ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ مدرسہ کی تمام تر تعلیم زبان ہی کی تعلیم ہے کیوں کہ مدرسہ کی پوری زندگی زبان کی تعلیم پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر زبان کی تعلیم ناقص ہوگی تو دوسرے مضامین کی تعلیم بھی نامکمل رہے گی کیوں کہ مدرسہ کے تمام مشاغل چاہے وہ نصابی ہوں یا غیر نصابی صرف زبان کے وسیلہ سے ہی تکمیل پاتے ہیں۔ اس لیے مدرسہ کی زندگی میں زبان کی تعلیم سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ زبان کی چار مہارتیں ہیں جن کے حصول کی وجہ سے ہی زبان پر مہارت حاصل ہو سکتی ہے جس میں سننا سکھانا، بولنا سکھانا، پڑھنا سکھانا اور لکھنا سکھانا شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ترکیبی طریقوں میں ابجدی طریقہ یا حروف تہجی کا طریقہ، صوتی طریقہ، صوتیاتی طریقہ، تحلیلی طریقہ، دیکھو اور بولو کا طریقہ، ارکانی یا اجزائی طریقہ، قصہ گوئی کا طریقہ، مخلوط طریقہ، مس اسٹیونسن کا طریقہ، پرنسپل سجاد مرزا کا طریقہ شامل ہے۔ طلبہ کو پڑھائی میں دلچسپی بڑھانے کے لیے عبارت خوانی، بلند خوانی اور خوش خوانی، خاموش خوانی، زود خوانی اور مطلب فہمی کے علاوہ خوش نویسی، املا نویسی پر بھی توجہ دی جاتی ہے جس سے بچوں میں پڑھنے، لکھنے کا نہ صرف شوق پیدا ہوگا بلکہ دیگر بچوں کے ساتھ مسابقت کا جذبہ پیدا ہوگا۔

10.7 مادری زبان کی تدریس کے طریقے

ماہرین تعلیم اس بات سے متفق ہیں کہ بچہ اپنی مادری زبان کے ذریعہ جس آسانی سے تعلیم حاصل کر سکتا ہے وہ غیر زبان کے ذریعہ ممکن نہیں کیوں کہ بچہ جب غیر زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرے گا تو سب سے پہلے اس کو غیر زبان سیکھنا پڑتا ہے۔ جس کے لیے وقت درکار ہوگا۔ جیسے اگر انگریزی ذریعہ تعلیم ہو تو بچہ کی توجہ دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ ایک زبان کی طرف اور دوسرے اس مضمون کی طرف جس کی وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اگر مادری زبان ذریعہ تعلیم ہوگا تو بچہ کو اس طرح دقت نہیں ہوگی۔ بچہ جب پہلی مرتبہ اپنی ماں کے منہ سے الفاظ کو سنتا ہے اور ان الفاظ کو سمجھتا ہے تو خود بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہی بچہ کی مادری زبان ہے۔ اس مسلسل نقل اور مشق کی وجہ سے بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ زبان کو سیکھ سکے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو مادری زبان سکھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ وہ مادری زبان بھی خود بخود سیکھ جاتا ہے۔ چوں کہ زبان ایک معاشرتی اور اکتسابی عمل ہے۔ معاشرتی عمل سے بچہ کو سب سے زیادہ اس زبان کے اکتساب کا موقع ملتا ہے جو اس کے ماحول میں استعمال ہوتی ہے۔ بچہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے اور بچپن کھیلتا ہے اسی زبان کو وہ سب سے پہلے سیکھتا ہے۔ خواجہ غلام السیدین کے مطابق مادری زبان وہ ہے جس کو بچہ اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے یہ کہنا کہ مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ بچہ کے منہ میں اترتی ہے ایک طرز بیان ہے۔ جب کہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ غیر ممالک میں بسنے والوں کے بچے غیر ملکی زبان روانی سے ادا کرتے ہیں کیوں کہ وہ اسی ماحول میں آنکھ کھولتے ہیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''ہر شخص کی مادری زبان وہ زبان ہوتی ہے جس کی مشق اور اکتساب کے مواقع زیادہ سے حاصل رہیں

اور ایسے زمانے میں حاصل رہیں جو لسانی اکتساب کا زمانہ ہوتا ہے۔'' یوں تو ہر زبان اکتسابی ہوتی ہے چاہے وہ مادری زبان ہو یا غیر مادری۔ لیکن ہم جس زبان کو زیادہ اچھی طرح سے جانتے ہیں اور جو ہماری شخصیت اور انفرادیت کے اظہار کا سب سے اہم وسیلہ ہوتی ہے وہی ہماری مادری زبان ہو سکتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر مادری زبان وہ اکتسابی زبان ہے جو ہمارے اعصابی نظام کا جز بن گئی ہو۔ اپنی بے ساختگی کی وجہ سے جس پر فطری حرکات وسکنات کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اسی لیے زبان کو شخصیت کا اہم جز تسلیم کیا گیا ہے چناں چہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب کبھی جبر واستبداد کے ذریعہ کسی شخص یا گروہ کی زبان چھین لی جاتی ہے تو وہ اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ لسانی برتری ہی سیاسی برتری کا ذریعہ رہی ہے۔ جس زبان میں طلبہ کو معلومات اور مضامین کا مواد فراہم کیا جائے وہی زبان ذریعہ تعلیم کہلاتی ہے۔ ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے کیوں کہ طالب علم مادری زبان ہی میں اچھی طرح سوچ سمجھ سکتا ہے اور لکھ پڑھ سکتا ہے۔ مادری زبان کا ذخیرہ الفاظ نہایت وسیع ہوتا ہے۔ احساسات اور خدمات کے اظہار میں جو آسانی مادری زبان میں ہے وہ غیر زبان میں نہیں ہو سکتی۔ مادری زبان تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مادری زبان کے بجائے کوئی غیر زبان کو اپنانا گویا اپنی تہذیب سے پہلو بچانا ہے تخیل وتفکر کی صلاحیتوں کو مادری زبان ہی سے جلا ملتی ہے۔ اسی لیے ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے کیوں کہ تخلیقی صلاحیتیں مادری زبان ہی کی وجہ سے نشو ونما پا سکتی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے فروغ دینا مناسب اور بہتر ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ثانوی مدارس تک اس کی بڑی اہمیت ہے۔

تدریس کے طریقے

بچوں کی تعلیم کے لیے کھیل کھیل کا طریقہ، مانٹیسوری طریقہ، کنڈرگارٹن طریقہ، سوپروائزر طریقہ رائج ہے کھیل بچوں کی جبلت ہے اور کھیل کے ذریعہ ہم بچوں کو بہتر انداز میں تعلیم بھی دے سکتے ہیں۔ اس طریقہ میں نہ صرف مشقی وتکراری کام ہوتا ہے بلکہ کام کی یکسانیت بھی دور ہوتی ہے۔ جو کام خوشی اور دلچسپی کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ موثر بھی ہوتا ہے کھیل کھیل میں تعلیم سے سے مراد ایسے طریقہ میں کام کھیل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کھیل ذہنی نشو ونما کے لیے انتہائی ضروری ہے بچہ کھیل کے ذریعہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لیتا ہے۔ سماجی تربیت کے لیے بھی کھیل کے طریقے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ کھیل میں بچہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے میں خوشی اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ مانٹیسوری طریقہ تعلیم، کنڈرگارٹن طریقہ تعلیم طریقے بھی بہت ہی مناسب ہیں جب کہ ہربارٹی سبق میں عملی سبق، مشقی سبق، مباحثی سبق، اجتماعی سبق اور مصنوعی سبق کو شامل کرنے سے بچوں کی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔

10.8 خلاصہ

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ صدی سائنٹیفک اور ٹکنالوجی کی ترقی کی

صدی ہے جس سے ہر میدان میں چاہے اس کا تعلق خلائی سائنس سے ہو یا پھر نیوکلیر توانائی کمپیوٹر ٹکنالوجی سے ہو یا پھر ملٹی میڈیا یا کمیونیکشن سے ہو، ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ان موجودہ حالات کے چیلنجس سے نمٹنے کے لیے ہمیں ذہین تربیت یافتہ اور انسانی وسائل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایک ایسے ترقی یافتہ پروگرام کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ ہم معلومات، مہارتوں، صلاحیتوں اور پسندیدہ رویوں اور اقداروں کو فروغ دے سکیں۔

تعلیم میں تدریس کا وہی مقام ہے جو جسم میں ریڑھ کی ہڈی کا ہوتا ہے۔ جس طرح ریڑھ کی ہڈی جسم کی ساخت کو بنائے رکھتی ہے اس طرح تدریس تعلیم کے عمل کو موثر بنانے میں اہم رول انجام دیتی ہے۔ تعلیم اور تدریس میں نمایاں فرق موجود ہے۔ تعلیم کا تعلق 3R's یعنی پڑھنا (Reading)، لکھنا (Writing) اور ریاضی (Arithematic) سے ہے جب کہ تدریس کا تعلق بچہ کی ہمہ گیر شخصیت کی نشو ونما سے ہے اس اعتبار سے ایک معلم کو بچے کی ذہانتی، جذباتی، سماجی، روحانی، جسمانی اور اقداری صلاحیتوں کی بھرپور نشو ونما پر توجہ دینا ضروری ہے۔

تدریس ایک سماجی عمل ہے۔ تدریس پر سیاسی نظام، سماجی فلسفہ، اقدار اور قومی تہذیب کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کے سیاسی نظام اور فلسفیانہ نظریات کا اثر تدریسی نظام پر اپنی گہری چھاپ چھوڑتا ہے۔ تدریس ایک ایسا پیشہ ہے جس میں مختلف مہارتیں شامل ہیں۔ اس لیے اس کی عمدہ تربیت بہت ہی ضروری ہے۔ اس لیے ہر معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ تدریس کے بارے میں مکمل جانکاری اور اپنے فرائض سے واقفیت رکھنے والا ہو۔

تدریس کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے چوں کہ تدریسی عمل میں معلم کا سابقہ ایک بچہ سے رہتا ہے جو ایک زندہ ہستی ہوتا ہے۔ جس کی اپنی خواہشات اور دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ تدریس میں اگر اس کی آمادگی، دلچسپیوں اور سابقہ معلومات کا لحاظ نہ رکھا جائے تو معلم کی لگاتار کوشش بھی اس سمت میں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکتیں اس لیے معلم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طریقہ تدریس سے واقف رہے اور اس کے لیے معلم کا تدریسی مراحل سے واقف ہونا ضروری ہے۔

تدریس سے مراد کمرہ جماعت میں معلم اور طالب علم کے درمیان انجام دیے جانے والا عمل ہے۔ تدریس میں وہ تمام تنظیمی سرگرمیاں شامل ہیں جو طالب علم کے کردار میں تبدیلی لانے کا باعث بنتی ہیں۔ تدریس ایک پیشہ ہے جس میں ایک معلم بچہ کی ترقی کے لیے مفوضہ کام کو انجام دیتا ہے۔ تدریس بنیادی طور پر ایک ترسیلی عمل ہے۔ تدریس کے لیے معلم کا ذہین ہونا ضروری ہے۔ معلم کو مواد مضمون پر عبور رہنے کے ساتھ ساتھ موثر ترسیل کی مہارت ہونی چاہیے۔ معلم طلبہ میں معرکہ پیدا کرنے والا ہو۔

زبان کیسے وجود میں آئی؟ اس سلسلہ میں یقینی طور پر کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابتدائی انسان نے اپنی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے ضرور کچھ آوازوں سے کام لیا ہوگا یا پھر جسمانی اشاروں سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہوگا۔ اس طرح آگے چل کر ان آوازوں اور اشاروں کے معنی مقرر ہوئے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی طرح آہستہ آہستہ اظہار خیال کی زبان وجود میں آئی ہوگی۔ اس کے بعد بول چال کی زبان یہ زبان بہ تدریج تحریری شکل اختیار کر لی ہوگی۔ اس طرح مختلف زبانیں جیسے اشاری زبان، آواز کی زبان یا گفتگو یا تقریری اور علامتوں کی زبان یا تحریر وجود میں آئی ہیں۔

10.9 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ تدریسی زبان میں چند اہم مفکرین کے نظریات تعلیم کا مفصل جائزہ لیں۔

2۔ درس وتدریس کے اہم مقاصد کیا ہیں؟ تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔

3۔ طریقہ تدریس پر سیر حاصل گفتگو کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ مادری زبان کی تدریس کے طریقے کیا ہیں؟ مفصل بیان کیجیے۔

2۔ زبان کی مہارتوں کی تعلیم کیا ہیں؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

3۔ زبان کی تدریس کے مقاصد بیان کیجیے۔

10.10 سفارش کردہ کتابیں

1۔ ایجوکیشنل ٹکنالوجی اینڈ کمیونیکیشن : سید اصغر حسین

2۔ اصول تعلیم : ڈاکٹر ضیاء الدین علوی

3۔ طرز تعلیم : پروفیسر عبد المغنی

4۔ اساس تعلیم : محمد ابراہیم خلیل

5۔ اردو کیسے پڑھائیں : سلیم عبداللہ

6۔ ابھرتے ہندوستان میں تعلیم : سید اعجاز احمد

7۔ تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے (ایجوکیشنل سائیکالوجی) : مسرت زمانی / ابن فرید

8۔ انتظام مدرسہ اور نظام تعلیم : محمد ابراہیم خلیل

9۔ طریقہ تدریس اردو : سید جلیل الدین

اکائی 11 لغت نویسی اور اصطلاح سازی

ساخت

11.0 اغراض ومقاصد

یہ اکائی لغت نویسی اور اصطلاح سازی سے متعلق ہے۔اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- لغت کی تعریف اور اس کی اہمیت بیان کر سکیں
- لغت کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت کر سکیں
- اردو میں لغت نویسی کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈال سکیں
- اصطلاح کی تعریف اور اس کی اہمیت بیان کر سکیں
- اصطلاح سازی کے مسائل کی وضاحت کر سکیں اور
- اردو میں اصطلاح سازی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈال سکیں۔

11.1 تمہید

اس اکائی میں ہم لغت کی تعریف، اس کی اہمیت، لغت کے اجزائے ترکیبی اور اردو میں لغت نویسی کی روایت کا مطالعہ کریں گے۔

دنیا میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کی اپنی ایک شناخت ہے۔ گرامر کا ڈھانچا ہے جو کہیں مماثلت رکھتا ہے تو کہیں پوری طرح سے اختلاف۔ ہر زبان کے الفاظ اپنے ملک، ملک کے جغرافیائی حالات، مخصوص علاقوں اور موقع و مناسبت سے تشکیل پاتے رہے ہیں۔ آج ہم کئی زبانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے لغت کا استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ کے معنی تلاش کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اردو ادب کے کسی شاہکار کے مطالعے کے دوران بھی لغت کا استعمال کرتے ہیں تا کہ نامانوس الفاظ کے معنی معلوم کر سکیں۔

ہم اپنی تقریر یا تحریر کے ذریعہ اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی معلومات و تجربات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے اس عمل میں بعض اوقات ہمارے جملے طویل ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب بعض تصورات کی ترسیل ہے۔ مثلاً ذیل کے جملے دیکھیے:

i۔ ہندوستان کے تین طرف سمندر اور ایک طرف خشکی ہے۔

ii۔ ہندوستان جزیرہ نما ہے۔

پہلے جملے میں دس الفاظ ہیں اور دوسرے جملے میں صرف چار الفاظ ہیں۔ یعنی پہلے جملے میں جو بات دس الفاظ میں کہی گئی ہے دوسرے جملے میں وہی بات صرف چار لفظوں میں ادا ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے جملے میں ''جزیرہ نما'' کی اصطلاح استعمال کی گئی جو دو لفظوں میں ایک بڑے مفہوم کو ادا کرتی ہے۔ اس مثال سے آپ کو اصطلاح کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا۔ اس اکائی میں اصطلاح کی تعریف اور اصطلاح سازی کی اہمیت بیان کی جائے گی۔ اصطلاح سازی کے مسائل پر روشنی ڈالی جائے گی اور اردو میں اصطلاح سازی کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا جائے گا۔

11.2 لغت کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور اہمیت

لغت نویسی ایک مشکل ترین کام ہے جو عرق ریزی کا تقاضا کرتا ہے۔ کسی بھی زبان کی لغت تیار کرنا آسان کام نہیں ہے۔ خود اپنی ہی زبان کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں الفاظ کو یکجا کر کے حروف تہجی کی ترتیب میں پیش کرنا، اعراب کی مدد سے الفاظ کی ادائیگی میں مدد کرنا کسی لغت نویس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہر زبان کی اپنی ایک شناخت ہوتے ہوئے بھی وہ کسی دوسری زبان سے رشتہ بنائے ہوئے ہے۔ چاہے وہ رشتہ لسانی ہو یا ادبی و تہذیبی۔ الفاظ کے لین دین کا عمل زبانوں میں جاری رہتا ہے اور یہی عمل لغت نویسی کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں لغت کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

''لغت یعنی وہ کتاب جس میں زبان کے الفاظ کے معنی ایک جگہ جمع ہوں۔''

(فرہنگ آصفیہ: سید احمد دہلوی، ص: 194)

انسائیکلو پیڈیا براٹینکا کے مطابق:

''لغت ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی زبان کے الفاظ کا اندراج عموماً تہجی ترتیب سے کیا جاتا ہے۔ نیز ان کے معنی اسی یا کسی دوسری زبان میں دیے جاتے ہیں۔ اکثر لغات میں الفاظ کے تلفظ، اصل وماخذ اور محل استعمال پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔''

(اردو لغت کا پس منظر: ڈاکٹر مسعود ہاشمی، ص: 22)

لغت میں لفظوں کے جو معنی درج ہوتے ہیں ان کو لغوی معنی کہتے ہیں۔ لغوی معنی اصلی اور موضوعی ہوتے ہیں۔ جب کہ کہا جائے کہ فلاں لفظ کے لغوی معنی یہ ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے اس لفظ کے اصل معنی جو لغت میں دیے گئے ہیں۔

لغت کی تعریف کے پیش نظر لغت کے اجزائے ترکیبی اس طرح قرار دیے گئے ہیں:

i اندراج الفاظ : لغت میں الفاظ کا اندراج حروف تہجی کی ترتیب سے کیا جاتا ہے تاکہ جس لفظ یا محاورے کے معنی معلوم کرنے ہوں اسے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

ii تلفظ : کسی بھی لفظ کے صحیح تلفظ کی ادائیگی میں اعراب مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا لغت میں الفاظ پر لگائے گئے اعراب نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

iii اصل وماخذ : لغت میں دیے گئے الفاظ کی اصل کیا ہے اور اس کا تعلق کس زبان سے ہے۔ لغت میں اس کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

iv معنی، تشریح اور وضاحت: لغت میں شامل الفاظ کے اصل معنی کے علاوہ اصطلاحی معنی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض اوقات ایک لفظ کے دیگر معنی بھی معہ وضاحت دیے جاتے ہیں اور ساتھ ہی مترادفات بھی شامل کیے جاتے ہیں۔

v قواعدی نوعیت : الفاظ کی قواعدی نوعیت بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لغت میں الفاظ کی علاقائی بنیاد پر تذکیر و تانیث کے علاوہ اس کی اسمی، فعلی اور صفتی نوعیت کا تعین کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔

لغت ایک ایسا کارآمد ذریعہ ہے جو نہ صرف الفاظ کے معنی بتاتا ہے بلکہ الفاظ کے معنی کی تشریح، اس کی کیفیت (فعل، صفت اور تعداد وغیرہ) کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ اس میں صرف مفرد اور مرکب الفاظ کے معنی ہی نہیں ہوتے بلکہ ان الفاظ کی ادائیگی کو اعراب کی مدد سے آسان بنایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں لغت میں محاورات اور ضرب الامثال کے بھی معنی دیے جاتے ہیں۔ جو اردو زبان کا حصہ بھی ہیں اور حسن بھی۔ یہ الفاظ دیگر لغت الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کا تحفظ کرتی ہے۔ ایسے الفاظ جو آج متروک ہو چکے ہیں ان کے تعلق سے بھی لغت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

11.3 لغت نویسی کا آغاز و ارتقا

اب ہم اردو میں لغت نویسی کی ابتدا اور ارتقا کا مطالعہ کریں گے۔

11.3.1 اردو میں لغت نویسی کی ابتدا اور نصاب نامے

ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قومیں مختلف مقامات سے آتی رہیں جس کی وجہ سے ہمارا ملک لسانی اور تہذیبی قوس قزح کا منظر پیش کرتا ہے۔ ابتداً آریوں اور یونانیوں کی آمد کے بعد یہاں مسلمانوں کی آمد اور دیگر یوروپی اقوام کی آمد کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور تہذیبی لین دین کے عوامل کے زیر اثر اردو لغت نویسی کی ابتدا ہوئی۔ ایک طرف عربی۔ فارسی لغت نویسی نے اردو لغت نویسی کی بنیاد قائم کی اور دوسری جانب مستشرقین (یوروپی اقوام) نے اپنے جدید علوم جیسے سائنس اور منطق کے بے شمار الفاظ کے لین دین کے تحت ہندوستانی لغت نویسی کی جدید کاری کی۔ اگرچہ اردو لغت نویسی کی ابتدا کے اولین نقوش اسلام کے ظہور کے بعد کے ابتدائی عہد میں ہندوی الفاظ یا بہ ذات خود اپنی شناخت کے یا ان کی معرّب شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ عرب سیاحوں، مسلمان تاجر اور ابوزید حسن البرائی کے سفر ناموں اور دیگر عربی تحریروں میں کئی ہندی الفاظ ملتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی فارسی اور ہندی کے میل جول کے اثر سے کئی ہندی الفاظ پہلے مفرد شکلوں میں فارسی کتابوں کی زینت بنے۔ بعد میں ترجموں کی مدد سے وہ فارسی تحریروں کا جزو بنتے چلے گئے اور تشریح کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کی مترادفات کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے تاکہ ہندوستان میں ان ہندی مترادفات کی مدد سے فارسی الفاظ کے صحیح معنوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ان الفاظ کی طرف سب سے پہلے حافظ محمود شیرانی نے توجہ دلائی اور فرہنگ نامہ قواس، اُدات الفضلا، زفانِ گویا، قنیۃ الطالبین، شرف نامۂ منیری، موید الفضلا، ریاض الدویہ وغیرہ میں شامل اس طرح کے الفاظ کی نشاندہی کی۔ حافظ محمود شیرانی کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد نے اس طرح کے الفاظ کی نشان دہی مذکورہ بالا لغات کی پوری چھان پھٹک کے ساتھ کی ہے۔ اس طرح فارسی فرہنگوں میں ہندی (اردو) مترادفات کی شمولیت کا سلسلہ جو ''فرہنگ نامۂ قواس'' سے ساتویں صدی ہجری کے آخر یا آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں شروع ہوا تھا وہ نویں صدی ہجری میں ''بحر الفضائل فی منافع الافاضل'' کے نام سے ایک باقاعدہ باب کی شکل میں ملتا ہے۔ اردو لغت نویسی کے ان ابتدائی نقوش کے بعد باقاعدہ لغت، اردو۔ فارسی منظوم نصاب ناموں کی شکل میں دستیاب ہوئی ہیں۔

اردو کے ابتدائی نصاب ناموں میں ''خالق باری'' یا ''حفظ اللسان'' منظوم لغت ہے جو امیر خسرو سے منسوب ہے جب کہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی گجرات میں تالیف کی گئی لغت ''لغات گجری'' کو قدیم مانتے ہیں۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے مطابق ''لغات گجری'' میں ایسے ہندی (اردو) الفاظ ملتے ہیں جو ''خالق باری'' میں دیے گئے الفاظ کی شکلوں سے زیادہ قدیم ہیں۔ ان دونوں کے بعد چار نصاب نامے دستیاب ہوئے ہیں جن میں تجلی کا ''اللہ خدائی'' (1060ھ)، اسماعیل کا ''رازق باری'' (1071ھ) اور کھتری مل پسر سامل داس کا ''ایزد باری'' (1105ھ) شامل ہیں۔ اسی زمانے میں ''حمد باری'' یا ''رسالۂ جان پہچان'' کے نام سے ایک سہ لسانی نصاب لکھا گیا جسے میر عبدالواسع ہانسوی نے ترتیب دیا۔ اس نصاب نامے میں انسانی اعضا، میوے اور ادویات وغیرہ کے نام عربی، فارسی اور ہندی (اردو) تینوں زبانوں میں دیے گئے ہیں۔ نصاب ناموں کی ایک مثال

حسب ذیل ہے:

خواندن، نوشتن، فہمیدن جانو پڑھنا، لکھنا، سمجھنا مانو
آوردن، بردن، سوختن کہیے لانا، لے جانا، جلانا کہیے

تقریباً بیسویں صدی کے اوائل تک نصاب ناموں کی تالیف کا سلسلہ جاری رہا اور غالب کے ''قادر نامہ'' کے علاوہ ایسے دوسرے کئی نصاب ناموں کی تالیف کی گئی جن کا مقصد صرف تدریسی نہ رہ کر ہمہ جہتی ہوگیا۔ تمام نصاب نامے تدریسی مقصد کے تحت لکھے گئے تھے لیکن ان میں الفاظ کے معنی اور مترادفات نے انھیں لغت نویسی کی بنیاد قرار دے دیا۔ دسویں صدی ہجری کے نصف اول کے نصاب نامے ''قصیدہ در لغات ہندی'' (950ھ م 1543ء) سے شمالی ہند میں لغت نویسی کی ابتدا ہوئی لیکن جنوبی ہند اور دکن میں لغت نویسی اس سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی دریافت کردہ ''لغات گجری'' نے مکمل لغت کہلانے کا حق اس طرح حاصل کیا کہ اس میں اندراج کی ترتیب کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ انھیں کے کالم میں لکھے گئے ہیں اور حاشیے میں مختلف نکات کے حوالے سے ہر لفظ کو عربی یا فارسی میں سمجھایا گیا ہے لیکن نصاب نامے سے بھی لغت نویسی کے ابتدائی دور میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ دکن میں بھی لغاتی نصاب ناموں کی تدوین شروع ہو چکی تھی۔ ان میں ''گنج نامہ'' (جس کا سن تالیف اور مصنف کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکیں) اور سید طاہر شاہ کرنولی کی مختصر لغت ''خوانِ یغما'' ہے چوں کہ اس لغت میں فارسی کے دکنی مترادفات دیے گئے ہیں لہٰذا اسے فارسی۔ دکنی اردو لغت کہا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور نصاب نامے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے ایک ''فرہنگ اصطلاحات سائنس'' (1200ھ) ہے لیکن یہ نصاب نامہ نہ ہوتے ہوئے لغت کے زمرے میں آتی ہے کیوں کہ اس میں ہجوں کی ترتیب کی مدد سے سائنسی اصطلاحات کی اردو میں وضاحت کے ساتھ اصل انگریزی الفاظ بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مسعود ہاشمی:

> **''شمالی اور جنوبی ہند کے ان نصابوں اور ابتدائی لغات کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند میں اردو لغت نویسی کی بنیاد ان نصاب ناموں کی شکل میں سولہویں صدی عیسوی کے وسط (قصیدہ در لغات ہندی 950ھ مطابق 1543ء) میں پڑی جن کو لغات کی بجائے اردو لغت نویسی کے ابتدائی نقوش سے ہی موسوم کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ان میں لغت نویسی کی بنیادی شرائط مفقود ہیں جب کہ دوسری طرف جنوبی ہند میں اردو لغت نویسی اپنی ابتدا ہی سے مکمل شکل میں سامنے آئی۔ جنوبی ہند کی ابتدائی لغت یعنی ''لغات گجری'' اس لیے مکمل لغت کہی جا سکتی ہے کہ اس میں تو ترتیب اندراج کا ایک منطقی طریقہ کار بھی اختیار کیا گیا ہے۔ باقاعدہ فصلیں اور ابواب قائم کیے گئے ہیں۔''**
> **(اردو لغت نویسی: ڈاکٹر مسعود ہاشمی، ص:38)**

11.3.2 اردو۔ فارسی لغات

عہد عالم گیری کے ملا عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' اردو۔ فارسی لغت دراصل اردو لغت نویسی کا دوسرا مرحلہ

ہے۔ یہ پہلی با قاعدہ اردو۔فارسی لغت ہے جسے بعد میں 1750ء (1165ھ) سراج الدین علی خان آرزو نے ''نوادرالالفاظ'' کے نام سے تصحیح اور ترمیم کے ساتھ مرتب کیا۔تقریباً چالیس (40) برس بعد 1792ء میں مرزا جان طپش نے (66) صفحات پر مشتمل ایک مختصر لغت ''شمس اللبیان فی مصطلحات ہندوستان'' کے نام سے شائع کی۔اس کے بعد 1833ء میں مولوی محمد مہدی واصف نے لغت ''دلیل ساطع'' کی تدوین کی۔اس لغت کے اکثر الفاظ یا تو متروک ہو چکے ہیں یا بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ 1837ء میں مولوی اوحدالدین بلگرامی نے ''نفائس اللغات'' کے نام سے ایک لغت مرتب کی۔1844ء میں ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط اشک نے ''نفس اللغہ'' نامی لغت ترتیب دی۔ایک اور اہم لغت ''منتخب النفائس'' ہے جسے 1845ء میں محبوب علی رام پوری نے مرتب کیا تھا۔یہ لغت اردو۔فارسی کی بجائے اردو۔فارسی۔عربی یعنی سہ لسانی لغت ہے جس میں اردو زبان کے عربی اور فارسی مترادفات تینوں کالم میں ترتیب دیے گئے ہیں۔

11.3.3 انگریزی۔اردواوراردو۔انگریزی لغات

ہندوستان میں انگریزوں کے عہد میں بھی لغات پر کافی کام ہوا ہے۔انگریزوں کی اردولغت نویسی کی تکنیک کے اردو۔اردولغت نویسی پر جواثرات مرتب ہوئے ہیں اس کی روشنی میں یوروپی اقوام کی لغت نویسی کا ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ انگریزوں سے پہلے ڈچ۔پرتگالی اور فرانسیسی قومیں بھی تجارت کی غرض سے ہندوستان آئیں۔یہاں مقامی لوگوں کی زبان کو سمجھنے کے مقصد سے چھوٹی چھوٹی لغات مرتب کرتے رہے۔تجارت کے علاوہ ان اقوام کے مذہبی مبلغین کے لیے بھی اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لیے ذولسانی لغت کی تدوین ضروری تھی لہذا 1630ء میں مسٹر کورچ نے ''اورینٹل کیٹلاگ'' سورت میں مرتب کی جو فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور پرتگالی الفاظ پر مشتمل تھی۔اس ''اورینٹل کیٹلاگ'' میں فارسی الفاظ فارسی رسم الخط اور رومن انگریزی میں اور اردو الفاظ گجراتی اور رومن انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ان کے علاوہ لغت نویسی کے تعلق سے دو اہم نام جارج ہیڈلے اور فرگوسن کے ہیں۔

ان تمام لغت نویسوں کے بعد سب سے اہم نام جان گلکرسٹ کا ہے جنھوں نے 1790ء۔1778ء میں دوجلدوں پر مشتمل انگریزی۔ہندوستانی ڈکشنری کلکتہ سے شائع کی۔1790ء ہی میں ہنری ہیرس نے انگریزی۔ہندوستانی ڈکشنری مدراس سے شائع کی۔اس لغت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دکنی الفاظ کو بھی بطور خاص شامل کیا گیا تھا۔کیپٹن جوزف ٹیلر نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے 1805ء میں ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری تیار کی تھی جسے ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی مدد سے نظر ثانی کے بعد دوبارہ 1808ء میں کلکتہ ہی سے شائع کیا۔یہ ڈکشنری جان شیکسپیئر کی مدون کردہ ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری کے علاوہ دیگر لغات کی بھی بنیاد بنی۔

ان ڈکشنریوں کے بعد کئی ڈکشنریاں ترتیب دی گئیں۔انیسویں صدی کے درمیانی عہد میں ڈنکن فاربس کی ڈکشنری کے علاوہ چھوٹی بڑی تقریباً پندرہ (15) ڈکشنریاں تیار کی گئیں۔ان کے بعد دو اہم ڈکشنریاں فیلن کی ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری اور پلیٹس کی اردو، ہندی۔انگریزی ڈکشنری 1884ء میں شائع ہوئی۔ڈاکٹر فیلن نے اپنے اسٹاف میں شامل لالہ فقیر چند، منشی چرنجی لال، لالہ ٹھاکرداس، لالہ جگن ناتھ اور منشی سید احمد صاحب کی مدد سے ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری 1879ء میں

شائع کی۔اس ڈکشنری کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ ہے کہ اس میں لغت نویسی کے اصولوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ڈاکٹر فیلن کے بعد جان ٹی۔ پلیٹس نے 1884ء میں اردو، ہندی۔انگریزی ڈکشنری ترتیب دی۔ان کے بعد کئی دولسانی لغات مدون کی گئیں۔

11.3.4 اردو۔اردو لغات

انیسویں صدی تک مستشرقین کی تدوین کردہ فارسی۔اردو، اردو۔فارسی، انگریزی۔اردو اور اردو۔انگریزی لغات نے اردو۔اردو لغت نویسی کو تحریک عطا کی۔اس ضمن میں بطور خاص ڈاکٹر فیلن اور ٹی۔پلیٹس کی ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری سے تحریک پاکر اردو۔اردو لغت نویسی کی بھی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔

اردو میں لغت نویسی کی ابتدا امام بخش صہبائی سے ہوئی۔انھوں نے 1849ء میں جب کہ ہندوستان میں فارسی کا رواج تھا۔فارسی کی بجائے اردو میں لغت کی تدوین کی اور اس میں اردو محاورات بھی شامل کر کے ان کی وضاحت بھی اردو ہی میں کی۔امام بخش صہبائی کے بعد سید ضامن جلال لکھنوی نے ''گنجینۂ زبان اردو'' یعنی ''گلشن فیض'' کے نام سے 1881ء میں محاورات جمع کیے۔لیکن ان کی وضاحت فارسی میں کی۔اس لحاظ سے یہ لغت خاص اہمیت کی حامل نہیں ہے لیکن اس کے بعد سید ضامن جلال لکھنوی نے الفاظ و محاورات پر مبنی دوسری لغت ''سرمایۂ زبان اردو'' کے نام سے مدون کی۔اس لغت میں انھوں نے معنی اردو ہی میں دیے۔1886ء میں نیاز علی بیگ نکہت نے قدیم دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر بوٹرسن کی سفارش پر ایک اور لغت ''مخزن فوائد'' مدون کی۔اسی دوران منشی چرنجی لال نے ''مخزن المحاورات'' کی تالیف کی جو اردو کے تقریباً دس ہزار محاورات پر مشتمل ہے۔اس وقت کی مدون شدہ اردو۔اردو لغات میں اس لغت کو ضخیم ترین لغت کہا جا سکتا ہے۔مرزا محمد مرتضٰی عرف مچھو بیگ عاشق لکھنوی نے 1888ء میں ''بہار ہند'' شائع کی۔اس لغت میں عام محاورات کے معنی نہایت خوبی کے ساتھ دینے کے علاوہ ان کی سند بھی دی گئی تھی لیکن یہ لغت صرف ردیف الف تک ہی چھپ سکی۔اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بہترین کوشش تھی۔1888ء ہی میں سید احمد دہلوی کی لغت ''لغات اردو'' شائع ہوئی جو بعد میں مشہور لغت ''فرہنگ آصفیہ'' کی تدوین میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔سید احمد دہلوی کی دوسری لغت ''لغات النسا'' ہے جو صرف عورتوں کی زبان اور محاورات پر مشتمل ہے۔1890ء میں مولوی اشرف علی لکھنوی نے ''مصطلحات اردو'' کی تدوین کی۔1891ء میں امیر احمد مینائی نے دو جلدوں میں ''امیر اللغات'' کی تدوین کی لیکن یہ لغت مکمل نہ ہو سکی۔1893ء میں مفتی غلام سرور لاہوری نے ''جامع اللغات'' مدون کی۔

بیسوی صدی کے ربع اول میں مولوی نور الحسن منیر کاکوری نے چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ''نور اللغات'' کی تدوین کی۔ ڈاکٹر مسعود ہاشمی کے مطابق:

> **''یہ 1919ء میں طبع ہوئی تھی اور اس میں صرف وہی محاورات شامل کیے تھے جو ناسخ، آتش، غالب اور ذوق نے باندھے تھے۔اس میں سند کے طور پر ان شاعروں کے کلام سے اشعار بھی پیش کیے تھے۔''**

امیر مینائی کی لغت ''امیر اللغات'' جو نامکمل تھی، اس کی تدوین 1924ء میں نور الحسن نیر کاکوری نے کی۔اسی دوران

لاہور کے خواجہ عبدالمجید نے ''جامع اللغات'' ترتیب دی جو چار جلدوں میں دستیاب ہے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے دو حصوں پر مشتمل یک جلدی لغت ''فرہنگ اثر'' تالیف کی۔ مہذب لکھنوی نے ''مہذب اللغات'' کی تدوین کی۔ اس کے بعد ''لغت کبیر اردو'' اور ''اردو لغت'' (ترقی اردو بیورو، حکومت ہند) بھی اردو۔ اردو لغات میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ بعد میں مزید لغات منظر عام پر آئیں جن میں ''فیروز اللغات''، ''دکنی اردو لغت'' وغیرہ نے اردو زبان کے سرمائے کے اضافے میں مددگار ثابت ہوئیں۔

11.4 اصطلاح کی تعریف اور اصطلاح سازی کی اہمیت

لفظ اصطلاح کا ماخذ عربی لفظ ''الصلح'' ہے۔ انگریزی میں اس لفظ کا متبادل لفظ Term ہے جو لاطینی لفظ Terminum اور یونانی لفظ Termon سے ماخوذ ہے۔ اسی سے جرمنی لفظ Terma وضع کیا گیا ہے۔

شان الحق حقی کے مطابق Term کے معنی ایسا کوئی لفظ ہے جو مخصوص یا معین معنی میں استعمال ہو، خصوصاً علمی یا تکنیکی۔ اس کے علاوہ کسی چیز کو کوئی نام دینا یا کسی لفظ سے پکارنا اور مصالحت کرنا بھی Term کے معنوں میں آتا ہے۔

عربی لفظ ''الصلح'' کے معنی سلامتی اور مصالحت کے ہیں۔ بقول سید احمد دہلوی:

> **''جب کوئی قوم یا فرقہ کسی لفظ کے معنی، موضوع کے علاوہ یا اس سے ملتے جلتے کوئی اور معنی ٹھہرا لیتا ہے تو اسے اصطلاح یا محاورہ کہتے ہیں کیوں کہ اصطلاح کے لغوی معنی باہم مصلحت کر کے کچھ معنی مقرر کر لینے کے ہیں۔ اسی طرح وہ الفاظ جن کے معنی بعض علوم کے واسطے مختص کر لیے ہیں، اصطلاح علوم میں داخل ہیں۔ خیال رہے کہ اصطلاحی اور لغوی معنوں میں کچھ کچھ نسبت ضرور ہے۔'' (فرہنگ آصفیہ، مولفہ سید احمد دہلوی، ص: 177)**

ڈاکٹر انور سدید نے فرہنگ آصفیہ کے حوالے سے لکھا ہے:

> **''اصطلاح کے معنی باہمی صلاح مشورہ کرنے کے ہیں اور کسی گروہ کا متفق ہو کر کسی لفظ کے معانی ان معانی کے علاوہ مقرر کر لینے کے ہیں جو مروج ہوں اور یہ کہ ہم اپنی قوم کی اصطلاح میں اس لفظ سے یہ مخصوص معانی مراد لیں گے۔''**

ڈاکٹر انور سدید مزید رقم طراز ہیں:

> **''اصطلاحی طور پر جملہ زبانوں کے ماہرین السنہ اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ اصطلاح کے مطالب و معانی مخصوص، معین اور محدود ہوتے ہیں۔ ہر اصطلاح علما و فضلا کی مخصوص علمی اور فنی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔''**

> **(تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات، مرتبہ اعجاز راہی، ص: 62-63)**

ان تمام باتوں کی روشنی میں اصطلاح کی تعریف اس طرح بھی بیان کی جاسکتی ہے کہ:

''اصطلاح وہ لفظ ہے جو علمی اور فنی ضرورتوں کے تحت کسی چیز، فکر، نظریے، عمل وغیرہ کے لیے مخصوص یا معین معنی میں استعمال ہو۔''

اصطلاح کسی فن یا علم میں مخصوص نوعیت کے الفاظ کا نام ہے اور یہ علم وفن کے کئی موضوعات میں شامل ہیں۔ جیسے کہ ادب، سائنس، قانون، معاشیت وغیرہ۔ اسی لحاظ سے یہ ادبی اصطلاحات، سائنسی اصطلاحات، قانونی اصطلاحات، معاشی اصطلاحات وغیرہ کے نام سے جانی جاتی ہیں اور ان کی الگ الگ لغات بھی تدوین ہوچکی ہیں۔ ذیل کے جدول میں چند اصطلاحات دی گئی ہیں:

ادبی اصطلاحات	سائنسی اصطلاحات	سیاسیاتی اصطلاحات
شاعری Poetry	توانائی Energy	جمہوریہ Republic
تشبیہ Simile	جوہری توانائی	تجویز، قرارداد Resolution
المیہ Tragedy	Atomic Energy	حکومت سرکار Government
جمالیاتی Aesthetic	ولوج Osmosis	مالی، مالیاتی Financial
بیان کرنے والا یا تذکرہ نویس	شعاعی تالیف	بحران Crisis
Narrator	Photosynthesis	

علاوہ ازیں دوسری زبان سے اخذ کی گئی کچھ اصطلاحات جوں کی توں اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ جیسے:

تکنیک Technique
فلٹر Filter
سیکولر Secular
پلاٹ Plot
کمپیوٹر Computer
پارٹی Party

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جملوں کی مدد سے زبان کا ڈھانچا تشکیل پاتا ہے جس کی مدد سے انسان اپنے خیالات اور فکر کا اظہار بھی کرتا ہے اور علوم میں وسعت بھی پاتا ہے۔ کسی بھی زبان میں محدود الفاظ سے بنے جملوں کے توسط سے اپنی فکر اور علم کو دوسروں تک پہنچانے میں انسان ناکام بھی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زبان میں جدید الفاظ کا شامل ہونا حد درجہ ضروری ہوتا ہے۔ اردو زبان میں بھی نئے نئے الفاظ داخل ہو کر بول چال (گفتگو) اور تحریر میں استعمال ہوتے گئے۔ زبان میں استعمال ہونے والے جدید الفاظ وضع کرنا یا ترتیب دینا ہی اصطلاح سازی اور الفاظ سازی کہلاتا ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں بے شمار اصطلاحات ملتی ہیں۔ ان اصطلاحات نے خیالات، فکر، علوم وفنون

کے موضوعات کو پیش کرنے میں آسانیاں مہیا کردی ہیں۔مختلف علوم میں اپنی زبان میں رائج کیے ہوئے الفاظ (اصطلاح) نے زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کیا جو زبان زد ہو کر اپنی فکر اور علم کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔اصطلاح رائج کیا ہوا وہ چھوٹا سا لفظ ہے جو بطور خاص علمی مطالب کو بیان کرتے وقت بڑے بڑے جملوں کو دہرانے سے بچا لیتا ہے۔اس سے لکھنے اور پڑھنے والے کا وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔بقول مولوی وحید الدین سلیم:

> **''اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں، جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کردیتے ہیں۔''**

نئی نئی اصطلاح وضع کرنے سے زبان ثروت مند ہوتی ہے۔اس میں مختلف الفاظ کی شمولیت اس زبان کے بولنے والوں کے ذہن کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرتی ہے۔زبان میں کم الفاظ ہونے کی وجہ سے اعضائی اشاروں کا استعمال بڑھ جاتا ہے جسے اصطلاحات کے استعمال سے کم کیا جاسکتا ہے اور پھر ظاہر ہے جب زبان مالدار ہوگی، اشارے خود بخود کم ہوں گے اور ذہن مستقل طور پر ان الفاظ کو دہراتا رہے گا جس سے حافظہ بھی قوی ہوگا۔مورخوں کے مطابق سنسکرت، لاطینی، یونانی اور عربی زبانوں میں دیگر ہم عصر اقوام کی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ الفاظ شامل ہیں۔اس لیے یہ زبانیں بولنے والی اقوام کے حافظے بھی قوی تھے۔اس کے علاوہ جس قوم کی زبان میں کثیر تعداد میں الفاظ ہوتے ہیں اس قوم کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور دن بہ دن معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے چوں کہ قوم یا انسان کی معلومات کا پیمانہ اس کی زبان میں مستعمل الفاظ سے ناپا جاسکتا ہے لہذا جتنے زیادہ الفاظ سے روشناس ہوگا اسی قدر اس کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔بقول مولانا وحید الدین سلیم:

> **''اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم شائستہ اور مہذب قوموں کی صف میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور اگر ہم علوم وفنون حاصل کرنا زندگی کا اہم مقصد جانتے ہیں تو زبان میں جدید الفاظ اور اصطلاحات کے اضافے سے ہم کو ڈرنا نہیں چاہیے کیوں کہ ترقی کے لیے اس بوجھ کا برداشت کرنا ناگزیر ہے۔''**
>
> **(وضع اصطلاحات از مولوی وحید الدین سلیم،ص:5-2)**

11.5 اصطلاح سازی کے مسائل

جامعہ عثمانیہ میں وضع اصطلاحات کی کمیٹی میں اردو زبان میں اصطلاح سازی کی ضرورت کے تحت اصول مرتب کرنے کے سلسلے میں مختلف لوگوں نے اپنی اپنی رائیں پیش کیں۔لیکن وہاں پیش کیے گئے اصولوں کے تحت دو گروہ بن گئے۔دونوں گروہوں کی دلیلیں حسب ذیل تھیں:

i عربی زبان مسلمانوں کی زبان ہے۔مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہیں لہذا عربی زبان دنیا کے مختلف حصوں کی زبان ہے۔اس لیے اگر اردو زبان کے لیے عربی زبان کے الفاظ اور قواعد کے مطابق اصطلاحیں بنائی جائیں یا الفاظ وضع

کیے جائیں تو دنیا کے تمام مسلمان اسے سمجھ سکیں گے اور اس طرح اردو زبان بین الاقوامی زبان بن جائے گی۔

ii مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں جو علمی کارنامے سرانجام دیے تھے وہ تمام عربی زبان میں جمع ہیں۔ لہٰذا عربی زبان جو کہ علمی زبان ہے، اس کے الفاظ اور قواعد کے مطابق، اگر اردو زبان میں جدید علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں تو مسلمانوں کے علم میں وہ تمام علمی کارنامے شامل ہو جائیں گے اور ان کی قابلیت میں اضافہ ہوگا۔ (وضع اصطلاحات از مولوی وحید الدین سلیم، ص:9)

دوسرے گروہ کے دلائل حسب ذیل ہیں:

i کسی زبان کی ترقی کے معنی دوسری زبان کے الفاظ کی کثرت سے شمولیت نہیں ہے بلکہ ایسے الفاظ جو اس زبان کے قدرتی ساخت اور اصل گرامر کے مطابق ہوں اور الفاظ کے مادے بھی اس زبان سے مطابقت رکھتے ہوں، ان کا استعمال کیا جانا چاہیے۔

ii عربی زبان میں مفرد مادوں کی افراط ہے اس لیے یہ اعلیٰ درجے کی زبان ہے جب کہ عربی، فارسی اور ہندی زبانیں اردو زبان کے قدرتی عناصر ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک زبان پر قناعت کرنے سے زبان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ لہٰذا جب نئے الفاظ بنائے جائیں یا اصطلاح وضع کی جائیں تو ان کے مادے تینوں زبانوں سے لیے جائیں جس سے اردو زبان ترقی کرتی رہے گی۔

iii ہندوستان کے مختلف گروہوں نے اردو زبان کے بننے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اسے سمجھنے اور سمجھانے کی غرض سے ہر گروہ نے اپنی اپنی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے عام فہم بنا دیا ہے۔ اگر ہم کسی ایک گروہ کی زبان کے الفاظ اردو زبان میں کثرت سے شامل کریں تو دوسرے گروہ کو اسے سمجھنے میں دشواری ہوگی۔

iv عرصہ دراز سے ہندوستان میں ہندوؤں کے لیے سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے عربی بہ حیثیت ذریعہ تعلیم رہی ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں علمی اصطلاحیں بھی دو قسم کی استعمال ہوتی رہی ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہندوؤں نے اپنی قوم کی تعلیم کی غرض سے اپنی تعلیمی کتابوں میں سنسکرت کی اصطلاحات درج کیں اور مسلمانوں نے تمام اصطلاحات عربی زبان سے اخذ کیں اور انھیں کو درس و تدریس کی غرض سے استعمال کیا لیکن اگر اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کا درجہ دینا ہو تو اسے نہ تو سنسکرت کی اصطلاحوں سے بوجھل کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا ہوں اور نہ ہی عربی کی اصطلاحات سے کہ ہندوستان کی دوسری قومیں اسے نامانوس اور اجنبی سمجھیں۔ ایسا کرنے سے زبان کے ثقیل ہونے کے بھی امکانات ہیں لیکن اگر اردو زبان کے خمیر میں شامل زبانوں کی ترکیب کے لحاظ سے اصطلاحیں وضع کی جائیں تو تعلیم میں سہولت اور آسانی ہوگی۔ (وضع اصطلاحات از مولوی وحید الدین سلیم، ص:14-13)

ان دونوں گروہوں کی دلیلوں کے مطالعے سے یہ واضح ہوا کہ گروہ اول کی دلیل اگرچہ موثر اور مسلمانوں کے جذبات کے مطابق ہے لیکن یہ دلیل نامناسب ہے کیوں کہ اس پر عمل کرنا نہایت مشکل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاطینی اور یونانی زبانیں آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ عربی زبان سامی خاندان سے۔ آریائی اور سامی خاندانوں میں الفاظ بنانے کے قاعدے مختلف ہیں۔ یعنی آریائی خاندان کی زبانوں میں مرکب الفاظ اور نئے الفاظ بنانے کے خاص قاعدے ہیں جن کی وجہ سے

علمی اصطلاحات بنانے میں آسانی ہوتی ہے۔ سامی زبانوں میں یہ قاعدے نہیں ہیں اس لیے مرکب الفاظ اوران کے مشتقات کو معرّب کرنا ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ علاوہ ازیں عربی زبان کی گرامر بھی مختلف ہے۔ ایران، افغانستان، ترکستان، چین، روس اور ملایا کے مسلمان جو فارسی، پشتو، ترکی، چینی، روسی اور ملائی زبانیں بولتے ہیں وہ سامی زبان کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ اس لحاظ سے اگر عربی زبان سے علمی اصطلاحات بنائی جائیں تو ان ملکوں کے مسلمانوں کے لیے اردو زبان مشترک علمی زبان نہیں بن سکتی۔ دوسری دلیل میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس ضمن میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو قوم عربی زبان بولتی تھی اس نے یونانی زبان سے مختلف علوم کا ترجمہ عربی زبان میں کیا اور ان کے یہاں عربی ہی میں درس وتدریس کی جاتی رہی۔ ہندوستان اور ایران وغیرہ میں جب یہ علوم آئے تب بھی ذریعہ تعلیم عربی زبان ہی تھی۔ لیکن جب اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینا ہوا اور اس میں یوروپ کے تمام علوم وفنون کو منتقل کرنا ہو تو نئی اصطلاحات اور الفاظ کو اردو زبان کی قدرتی ساخت اور گرامر کے مطابق ہی وضع کرنا چاہیے۔ بقول مولوی وحیدالدین سلیم:

> **''دونوں دلیلیں جو گروہ اول کے نظریہ کی حمایت میں پیش کی گئی ہیں وہ اگرچہ دل خوش کن ضرور ہیں مگر عملاً بے کار ہیں۔''**
>
> **(وضع اصطلاحات از مولوی وحیدالدین سلیم، ص:10-12)**

جامعہ عثمانیہ کی وضع اصطلاحات کی کمیٹی نے دوسرے گروہ کے دلائل کو منظور کیا کہ عربی، فارسی اور ہندی سے لیے گئے الفاظ کی مدد سے عملی اصطلاحات وضع کی جائیں۔ البتہ اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ان الفاظ کی ترکیب میں اردو زبان کی گرامر کا خیال رکھا جائے۔ عربی، فارسی اور ہندی کے جو الفاظ انہی زبانوں کے گرامر سے متعلق ہوں گے وہ اردو کے الفاظ نہیں کہلائیں گے بلکہ عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ کہلائیں گے۔ ایسے الفاظ اس وقت تک اردو زبان کے الفاظ نہیں کہلائے جاسکتے جب تک کہ وہ اردو زبان کی گرامر کے مطابق نہ ہوں۔ بقول مولوی وحیدالدین سلیم:

> **''دوسرے لفظوں میں اس فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ جدید الفاظ اردو زبان میں خود اس زبان کی قدرتی ساخت کے مطابق بنائے جائیں، نہ کہ اور کسی اجنبی زبان کی بناوٹ اور قواعد کے مطابق۔''   (وضع اصطلاحات از مولوی وحیدالدین سلیم، ص:15-14)**

11.6 اردو میں اصطلاح سازی کا آغاز وارتقا

ہر قوم کو اپنی ضروریات کے مطابق دوسری اقوام سے رابطہ رکھنا اور ترقی کے مطمع نظر دیگر اقوام کی زبانوں سے استفادہ کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اس طرح قومیں نہ صرف اپنے علوم میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ جدید علوم سے روشناس ہوتے ہوئے اپنی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ بھی کرتی ہیں۔ ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کے لیے دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کے الفاظ کے مترادفات (یعنی نئے الفاظ یا اصطلاح) کو اپنی زبان میں وضع کرتی ہیں۔ جس سے زبان کے سرمایے

میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ عمل صدیوں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اردو زبان نے بھی اپنے سرمایے میں اضافہ کیا۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے اور دیگر زبانوں سے اس نے اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا لیکن خاصیت یہ رہی ہے کہ اردو نے مغربی زبانوں کی طرح صرف یونانی اور لاطینی کے الفاظ پر انحصار نہیں کیا بلکہ اس نے دوسری زبانوں سے اخذ کیے گئے الفاظ کے ساتھ اس کے تصرف کے طریقے بھی اختیار کیے اور ان الفاظ کو نئے معنی دے کر اردو زبان میں اس طرح اختیار کر لیا کہ وہ اسی کا حصہ بن گئے۔

انگریزوں نے عملی سیاست کے تحت فورٹ ولیم کالج قائم کیا جو اردو زبان وادب کے فروغ میں بہت مفید اور مبارک ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو ادب کے فروغ کے علاوہ ذخیرہ الفاظ کی ترتیب، ضرب الامثال اور محاورات کی تلاش و تفہیم اور ان کی تدوین کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی قواعد کی تدوین اور اصطلاحات سازی کے کاموں کو بھی فروغ عطا کیا۔ اس طرح اردو زبان کی علمی، سماجی اور فنی ضرورتوں کے تحت اصطلاح سازی کی اہمیت کے پیش نظر نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کر کے اردو کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید، پنڈت دتا تریہ کیفی کے نئے الفاظ گھڑتے ہوئے ''اردو نامہ'' میں پیش کردہ بیان سے متعلق لکھتے ہیں:

''مقصد یہ ہے کہ اردو کی اشتقاقی اور اختراعی قوتوں کا علم ہو کر غیر زبانوں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی عادت رفع ہو جائے اور لوگ اپنی ہی مسالے سے نئی عمارتیں بنانے لگیں۔

لہذا اپنی ضرورتوں اور مسائل نے اردو میں اصطلاحات وضع کرنے کے اصولوں کو قائم کرنے کی ترغیب دی۔''

(ڈاکٹر انور سدید۔ اردو میں وضع اصطلاحات کا عمومی جائزہ، ص:63-62)

فورٹ ولیم کالج کے بعد انگریزی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے مقصد سے جن اداروں نے عملی قدم اٹھائے ان میں قدیم دلی کالج نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کالج میں بڑے پیمانے پر ترجمہ اور تالیف کے کام کے لیے ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی گئی جس میں ترجمے کے علاوہ اصطلاح سازی پر بھی کام کیا گیا۔ اس سوسائٹی کی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلم ہے کہ یہاں نہ صرف اصطلاح سازی پر کام کرتے ہوئے اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا گیا بلکہ اصطلاح سازی کے اصول بھی مرتب کیے گئے۔

قدیم دلی کالج کے بعد سائنٹفک سوسائٹی، لکھنو (1831ء)، آگرہ بک سوسائٹی، آگرہ (1833ء)، مدرسہ فخریہ، حیدرآباد دکن (1834ء، مدرسہ طبابت، حیدرآباد دکن (1845ء)، انجمن مجمع علم و ہنر، مدراس (1853ء)، میڈیکل اسکول، آگرہ (1854ء) اور انجینئرنگ کالج رڑکی (1856ء) میں ترجمے کے کام کے ساتھ ساتھ اصطلاح سازی پر بھی کام کیا گیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی نے ان تمام اداروں کو بہت نقصان پہنچایا۔ سرکاری طور پر انگریزی زبان نے اردو زبان پر فوقیت حاصل کر لی لیکن اردو زبان اس امتحانی دور میں بھی ترقی کرتی گئی۔ اسی دور میں سرسید نے غازی پور، علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس پر تاریخ ناز کرتی ہے۔ دلی کالج کے بعد اسی سائنٹفک سوسائٹی میں ترجمے اور وضع اصطلاحات پر سب سے زیادہ کام ہوا اور تاریخی، سائنسی، فنی اور دیگر علمی موضوعات کے ترجمے کیے گئے، وضع اصطلاحات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو دو علم پرور

حضرات بابورام چندمترا اور مولوی تمیزالدین خان پر مشتمل تھی۔ سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد نئے اور جدید علوم سے روشناس کرانا اور وضع اصطلاحات سے اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا تھا۔ جب مولوی وحیدالدین سلیم لٹریری اسسٹنٹ ہو کر علی گڑھ آئے تو سرسید نے انھیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کی ادارت میں شریک کیا۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے وضع اصطلاحات کے اصول مرتب کر کے ایسی اصطلاحات وضع کیں جن میں سے بیش تر کے اجزا مانوس اور گوش آشنا تھے۔ ان کے مرتب کردہ اصولوں کی رہنمائی میں معمولی تبدیلی کے ساتھ اصطلاح سازی بہ آسانی کی جاتی رہی ہے۔ ان کی کتاب ''وضع اصطلاحات'' اس سلسلے کی نہایت اہم تصنیف ہے جو بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونی ورسٹی میں تمام علوم وفنون کی تدریس اردو زبان میں ہونی طے پائی اور 1917ء میں شعبہ تالیف وترجمہ قائم ہوا جس کے سربراہ مولوی عبدالحق تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں 1917ء سے 1939ء کے دوران تقریباً پچاس ہزار اصطلاحات وضع کی گئیں۔ جامعہ عثمانیہ ہی کے ساتھ ساتھ اصطلاح سازی وضع کرنے کا عمل انجمن ترقی اردو ہند نے بھی شروع کر کے اردو زبان کی خدمت کی۔ انجمن ترقی اردو ہند کو بھی مولوی عبدالحق کی سرپرستی حاصل رہی۔ جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات کی بنیاد پر کئی کتابیں تالیف ہوئیں جن سے جامعہ عثمانیہ کے تمام تدریسی شعبوں نے استفادہ کیا جب کہ انجمن ترقی اردو ہند نے جامعہ عثمانیہ کے کام کے متوازی نوعیت ہی کا کام کیا اور نافذ کردہ اصطلاحات پر نظر ثانی کرتے ہوئے دارالترجمہ کے تعاون سے علمی اور فنی اصطلاحات پر مشتمل کتابیں شائع کیں جن میں سے چند کے نام ''فرہنگ اصطلاحات'' (1939ء)، ''اصطلاحات طبعیات''، ''معاشیات''، ''فلکیات'' اور ''جغرافیہ'' (1941ء) وغیرہ ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند نے اصطلاحات پیشہ وارانہ بھی متعدد جلدوں میں شائع کیا جو اردو زبان کے لیے باعث افتخار ہے۔

آزادی کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کی ایک علاحدہ اور آزاد شاخ پاکستان میں قائم ہوئی۔ اس انجمن نے اصطلاح سازی کے کام کو پاکستان میں نئے جوش اور ولولے کے ساتھ شروع کیا اور اسٹینڈرڈ انگلش۔ اردو ڈکشنری مرتب کی جس میں مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کا وافر خزانہ موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> **''انجمن کی اصطلاح سازی میں سابقہ اصطلاحات پر نظر ثانی کے اس رویے کو بھی فوقیت حاصل ہے جو جامعہ عثمانیہ میں رائج تھا اور جن کے تحت اصطلاحات کو آسان بنانے کا مسلسل عمل جاری کیا گیا تھا۔۔۔ پنڈت دتاتریہ کیفی نے اولڈ بوائے کے لیے پر پاٹھک، لاؤڈ اسپیکر کے لیے بول بڑھاؤ، ایروپلین کے لیے اڑناؤ وغیرہ الفاظ تجویز کیے تھے لیکن انجمن نے ان کے لیے قدیم طالب علم، آواز رساں اور ہوائی جہاز وغیرہ استعمال کرنے کی سفارش کی۔''**

مولوی وحیدالدین سلیم نے اصطلاح سازی کے جو اصول مرتب کیے تھے ان سے سب سے زیادہ استفادہ کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ تالیف وترجمہ نے کیا اور متعدد موضوعات پر اصطلاحات کے مختلف مجموعے اور رسالے شائع کیے۔ پاکستان اردو اکادمی اور پنجاب یونی ورسٹی کے ادارہ تالیف وترجمہ میں اپنی خدمات انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اصطلاح سازی کے

گیارہ رہنما اصول متعین کیے۔ ہر انگریزی یا مغربی لفظ کے بین الاقوامی ہونے کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے اردو زبان ہی سے وضع کردہ اصطلاح کو رائج کرنے کی تجویز پیش کی۔ انھوں نے قوسین میں اردو اصطلاح کی وضاحت کرنے کی بھی سفارش کی۔ پاکستان اردو اکادمی نے بالعموم سائنسی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنے کا کام کیا۔ زرعی یونی ورسٹی، فیصل آباد نے زراعت کے موضوعات پر تقریباً چالیس ہزار اصطلاحات وضع کیں۔ مجلس ترقی ادب، لاہور نے مختلف علوم کی اصطلاحات کو اردو میں منتقل کرنے کا کام سرانجام دیا۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان نے اصطلاحات سازی کے ابتدائی کام میں عام طور سے مولوی وحیدالدین سلیم ہی کے رہنما اصولوں کو اپنایا اور کئی اصطلاحی کتابیں شائع کیں۔ یہاں اصطلاح سازوں نے انگریزی اصطلاحات کہیں کہیں قبول بھی کیں اور کہیں مشکل اصطلاحات کو آسانی سے مروج اردو میں ڈھالنے کی غرض سے تخلیقی صلاحیتوں سے بھی کام کیا جو نہایت برجستگی سے استعمال ہوتی ہیں۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

الفا شعاعیں	Alpha rays
سنگم	Junction
پھوار	Drizzle
پرُسکون موسم	Settled weather

ان تمام اداروں اور اردو زبان کے قابل علما و فضلا نے نہایت محنت اور جانفشانی کے ساتھ اردو زبان کے سرمایہ الفاظ میں وافر مقدار میں اضافہ کیا جس کی بدولت اردو زبان آج ایک ثروت مند زبان مانی جاتی ہے لیکن وضع اصطلاحات کے سلسلے میں سب سے اہم نام مولوی وحیدالدین سلیم ہی کا ہے جنھوں نے اصطلاحات وضع کرنے کے ایسے اصول مرتب کیے جو آگے بڑھتے ہوئے کارواں کے لیے رہنما بن گئے۔

11.7 خلاصہ

یہ اکائی دو حصوں پر مشتمل ہے یعنی لغت نویسی اور اصطلاح سازی۔ اس کے تحت پہلے ہم نے لغت کی تعریف، لغت کے اجزائے ترکیبی، لغت کی اہمیت اور اردو میں لغت نویسی کے آغاز وارتقا کا مطالعہ کیا۔ لغت میں الفاظ کے معنی درج ہوتے ہیں۔ لغت میں معنی کے علاوہ الفاظ کا تلفظ بھی بتایا جاتا ہے اور ان الفاظ کے ماخذ یا اصل کی بھی نشان دہی کی جاتی ہے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ کی قواعدی نوعیت بھی واضح کی جاتی ہے کہ یہ لفظ اسم ہے، فعل ہے یا صفت ہے وغیرہ۔

اردو میں لغت نویسی کا آغاز نصاب ناموں سے ہوا۔ نصاب ناموں سے قبل عرب سیاحوں کے سفر ناموں اور بعض فارسی لغات میں ہندوستانی الفاظ کی تشریح ملتی ہے۔ قدیم نصاب نامے گجری اور دکنی زبان میں لکھے گئے۔ اس کے بعد لغت نویسی کا سلسلہ شروع ہوا اور اردو سے انگریزی، انگریزی سے اردو لغات تیار کی گئیں۔ اس کے علاوہ متعدد اردو سے اردو لغات بھی مرتب کی گئیں۔ اردو لغات کی تالیف میں مستشرقین نے بھی اہم حصہ لیا۔ لغت نویسی کے بعد اصطلاح سازی پر گفتگو کی گئی۔ ہر زبان کو ایک دوسرے سے لسانی، ادبی وتہذیبی رشتہ بنائے رکھنے کے لیے الفاظ کے لین دین کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ کا یہی لین دین لغت نویسی کا سبب بنا۔ لغت ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں زبان کے الفاظ کے معنی، تلفظ، اصل و ماخذ اور قواعدی اشارے بھی دیے

جاتے ہیں۔ اردو زبان ایک مخلوط زبان ہے لہذا اردو لغات میں بھی ان تمام چیزوں کے اندراج سے زبان کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اصطلاح سازی یا لفظ سازی نے اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ کو بڑھا کر اسے مالا مال کر دیا۔ اصطلاح یا نئے الفاظ بنانا بھی ضرورت میں شامل ہے، چاہے وہ علمی ہو یا قانونی، سائنسی ہو یا تاریخی، تدریسی ہو یا عام اصطلاح۔ ان اصطلاحات اور وضع کیے ہوئے نئے یا جدید الفاظ کے معنی بھی لغت سے معلوم کیے جاتے ہیں۔ اصل یا ماخذ کے تحت اس لفظ کی اصل یعنی وہ کس زبان سے اردو میں مستعمل ہوا ہے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اب تو باضابطہ اصطلاحی لغات بھی تدوین کی جارہی ہیں۔ جیسے قانونی اصطلاحات کی لغت، سائنسی اصطلاحات کی لغت، صحافتی اصطلاحات کی لغت وغیرہ۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ لغت اور اصطلاح سازی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

11.8 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ اردو لغت نویسی کے اولین نقوش نصاب ناموں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2۔ اردو میں لغت نویسی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔

3۔ اصطلاح سازی کے مسائل واضح کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ لغت کی تعریف کیجیے اور اس کے اجزائے ترکیبی کی وضاحت کیجیے۔

2۔ اصطلاح کی تعریف کیجیے اور بتائیے کہ اصطلاح سازی سے کیا مراد ہے؟

3۔ اصطلاح سازی کی اہمیت بیان کیجیے۔

11.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ : ڈاکٹر مسعود ہاشمی

2۔ اردو لغت کا پس منظر : ڈاکٹر مسعود ہاشمی

3۔ حفظ اللسان معروف بہ خالق باری : مصنفہ: ضیاء الدین خسرو، مرتبہ: حافظ محمود شیرانی

4۔ وضع اصطلاحات : مولوی وحید الدین سلیم

5۔ اردو میں وضع اصطلاحات کا عمومی جائزہ : ڈاکٹر انور سدید

6۔ فرہنگ آصفیہ : مولفہ سید احمد دہلوی

7۔ وضع اصطلاحات کے عمومی مسائل : ڈاکٹر سلیم اختر

8۔ وضع اصطلاحات کے اصولی مباحث : شان الحق حقی

بلاک۔ IV

لسانیات اور دیگر علوم

سائنسی علوم ہوں یا عمرانی علوم، تمام علوم ایک دوسرے سے کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتے ہیں۔کوئی علم اپنے آپ میں مستقل اور مکمل اور دوسرے علوم سے بے گانہ اور آزاد نہیں رہ سکتا۔علم لسانیات بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں لسانیات کا بنیادی سروکار زبان اور اس کی ساخت و ماہیت کے تجزیے سے ہے لیکن اس کا تعلق دیگر سائنسی اور عمرانی علوم مثلاً سماجیات (Sociology)، تاریخ (History)، نفسیات (Psychology) اور کمپیوٹر سائنس سے بھی ہے۔ مذکورہ علوم کے علاوہ اور بھی متعدد علوم سے لسانیات کا رشتہ ہے لیکن اس بلاک میں صرف مندرجہ بالا چار علوم ہی سے لسانیات کے رشتے کی وضاحت کی گئی اور یہ دکھایا گیا ہے کہ لسانیات سے ان علوم کے رشتے کی نوعیت کیا ہے اور وہ کونسے میدان ہیں جہاں لسانیات کو ان علوم سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ بلاک چار اکائیوں پر مشتمل ہے جن کے عناوین درج ذیل ہیں:

اکائی 12: لسانیات اور سماجیات

اکائی 13: لسانیات اور تاریخ

اکائی 14: لسانیات اور نفسیات

اکائی 15: لسانیات اور کمپیوٹر سائنس

اکائی 12 لسانیات اور سماجیات

ساخت

12.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں سماجیات کی تعریف، سماجیات اور لسانیات کا تعلق، تنوع اور اسلوب زبان کی اقسام اور لسانی ثنویت کی

وضاحت کی گئی ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- لسانیات اور سماجیات کے تعلق کو جان سکیں
- زبان کے مختلف اسلوب کونسے ہیں بیان کر سکیں
- لسانی ثنویت پر اپنی رائے پیش کر سکیں
- سماج کے زبان پر اثر انداز ہونے کے عمل کی وضاحت کر سکیں اور
- سماجی لسانیات کی افادیت کو پیش کر سکیں۔

12.1 تمہید

زبان ایک سماجی عمل ہے یہ انسان کے اظہار وخیالات اور ابلاغ کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ کسی بھی قسم کی معلومات کو ارسال کرنے کا سب سے اہم وسیلہ ہے۔ زبان کے اظہار کے لیے بصری، صوتی اور سمعی صلاحیتیں استعمال ہوتی ہیں۔ زبان کے ذریعہ ہی ذہن، مزاج، ثقافت، نسلی رشتوں کی تاریخ، بشریات کے مسائل، مختلف تہذیبی عوامل، زبانوں کے خاندانوں کے انسانی معاشرے پر اثرات کو ہم جان سکتے ہیں۔ زبانوں کا تعلق انسانی زندگی اور معاشرہ اور تہذیب سے ہیں۔ زبانوں کا آپس میں رابطہ اور معاشرہ پر اس کے اثرات کے ساتھ اس میں رونما ہونے والے تغیرات کا سائنسی طور پر مطالعہ کرنا سماجی لسانیات کا عمل کہلاتا ہے۔

لسانیات اور سماجیات کے تعلق کو جان کر ہم اس زبانوں کے آفاقی نظام سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ جو تمام عالم میں تنوع اور تفریق کے باوجود کثرت میں وحدت کے نظریہ کو ثابت کرتا ہے اور انسانی سماج کو زبان کی ڈور سے باندھے رکھتا ہے۔ زبان اور سماج کس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور معاشرہ کس طرح اس عمل سے متاثر ہوتا ہے معاشرہ کے فرد ہونے کے ناطے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے۔

12.2 سماجی لسانیات کی تعریف اور دائرکار

سماجیات اور لسانیات کے امتزاج سے سماجی لسانیات کی ترکیب وضع کی گئی ہے۔ یہ لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں زبان کا مطالعہ سماج کے سیاق وسباق کے تحت کیا جاتا ہے۔ ہم اسے زبان کی سماجیات کہہ سکتے ہیں۔ لسانیات میں جہاں زبان کا گہرائی وگیرائی سے سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے وہیں سماجیات میں سماج بالخصوص عصری سماج کا جائزہ لیا جاتا ہے اور تجزیہ کرتے ہوئے اس کی فلاح و بہبود پر توجہ دی جاتی ہے۔ سماجی لسانیات، سماجیات اور لسانیات کے باہمی اشتراک سے عبارت ہوتی ہے۔

سماج کا ایک وسیع دائرہ کار رہتا ہے۔ اس کے اپنے مسائل اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ اس کی وسعت اور ہمہ گیریت کے پیش نظر لسانیات کے موضوع بھی تقسیم ہو جاتے ہیں اور سماجی لسانیات ان تمام کا احاطہ کرتی ہے۔

سماج فرد، افراد، سماجی طبقوں اور مختلف معاشی گروہوں کی سرگرمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سماج میں موجود افراد ایک یا کئی زبانوں پر مہارت رکھتے ہیں یا مختلف زبانوں کو بولنے یا سمجھنے پر قدرت رکھ سکتے ہیں تو ان کی یہ صلاحیت ان کی سماجی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زبان اور سماج کے تعلق کو سمجھنا، اس کی ترجمانی کا زبان پر سماج کے عوامل کی نشان دہی کرنا اور سماج پر زبان کے ثبت کردہ نقوش کا جائزہ لینا ہے۔ سماجی لسانیات (Correlational Sociolinguistics) کے تحت یہ زبان رویہ اور سماجی درجوں کے درمیان تعلقات کا مطالعہ کرتی ہے۔ جیسے ہجرت کرنے والے، مادری زبان سے دور، مادری زبان کا استعمال کرنے والے، دوسرے ملک میں رہنے والے، دوسری زبان کا استعمال کرنے والے، جنس کے تحت خواتین اور مردوں کی زبان کیوں کہ خواتین کی زبان آدمیوں کے مقابلہ میں Prestigious Forms یعنی حقیقی اعلیٰ درجہ کی حامل ہوتی ہے۔

سماجی لسانیات، ریاضیاتی اصولوں سے بھی استفادہ کرتی ہے۔ وہ استعمال شدہ زبان کا Data جمع کرتے ہوئے اعداد وشمار کی بنا پر زبان کی تبدیلی کی بنیادی وجوہات، داخلی طور پر مرتب اثرات ظاہری اسلوب کی تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے جو تاریخی طور پر ریکارڈ نہ ہو پایا ہو۔

زبان کی تاریخ کا مطالعہ (Diachronic Linguistics)۔

زبان کی موجودہ صورت حال کا مطالعہ (Synchronic Linguistics)۔

یہ بھی سماجی لسانیات کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔

12.3 لسانیات اور سماجیات

لسان، عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی زبان کے ہیں۔ یہ خیالات کے اظہار کا وہ وسیلہ ہے جو آواز کی مدد سے انسان کو ترسیل میں مدد فراہم کرتا ہے۔ یونانی میں علم لسانیات کے لیے لفظ فلولوجی استعمال کیا جاتا ہے جو دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ فیلو کے معنی محبت اور لوجی (logy) کے معنی لفظ، علم وغیرہ یعنی زبان کی محبت۔ اردو میں ایک منظّم اور مربوط انداز میں زبان کے سائنسی مطالعہ کو علم لسانیات کا نام دیا جاتا ہے۔ لسانیات زبان کی خدمت کے لیے وقف ہوتی ہے۔ یہ زبان یا مختلف زبانوں کی تاریخ، ارتقا، زبانوں کے رشتے، ان کے خاندان، ان کی صرفی ونحوی ساخت سے بحث کرتی ہے۔ زبانوں کا عصری مطالعہ کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کرتی ہے کہ کیسے ہر زبان اپنے حروف کا ایک جامع نظام رکھتی ہے اور ان حروف سے کیسے الفاظ بنتے ہیں اور ان الفاظ سے کس ترتیب میں جملے تیار ہوتے ہیں۔ ان جملوں سے مزین عبارت اور اقتباسات کس طرح زبان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لسانیات کے علم کی موجودہ دور میں اہمیت بڑھ گئی ہے۔ زبانوں کی ساخت اور ان کی اصوات میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث سماجی علوم یعنی بشریات، سماجیات، نفسیات وغیرہ میں مفید اور کارآمد نتائج حاصل کیے جارہے ہیں۔ لسانیات کا دائرہ کار وسیع ہے وہ زبان کی ماہیئت سے تعلق رکھنے والے سوالوں کا وضاحت سے جواب دیتی ہے۔ جیسے اسم کے تعلق سے قواعد کے اصولوں کے تحت یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ اسم ہے، یہ جاندار ہے یا بے جان ہے۔ اس کا تعلق فعل سے کیا ہے۔ فعل کونسا ہے ماضی سے اس کا تعلق ہے یا مستقبل سے۔ لسانیات اگلے مدارج طے کرتے ہوئے ان کی زندگی کے مختلف ادوار کی نشان دہی کرتی ہے ان کی حقیقت بیان

کرتی ہے۔

زبان کا مطالعہ اپنے وسیع دامن میں بہت سے علوم کو سمیٹ لیتا ہے اور لسانیات کے سائنسی طریقہ کار سے اخذ کردہ نتائج انسانی ذہن، مزاج ثقافت، نسلی رشتوں کے شجرے، زبانوں کی خاندانی تاریخ اور سماجی مسائل و انسانی ذہنی پے چیدگیوں کو بھی سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

ماہر لسانیات کے مطابق زبان ایک سماجی عمل ہے اور اس عمل کے تحت زبان دو سطحوں پر کارگر رہتی ہے۔ پہلی سطح پر ساخت بنانا دوسری سطح پر اس کا اطلاق کرنا چوں کہ زبان ہی انسان کے اظہار و خیالات اور ابلاغ کا سب سے اہم ذریعہ ہے جس کے لیے بصری، سمعی اور صوتی حس استعمال ہوتی ہیں۔ ماہرین لسانیات تحریر شدہ لفظ سے زیادہ ادا شدہ لفظ کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی لسانی اعتبار سے تحریری سے زیادہ تقریری زبان کو تسلیم شدہ مانا جاتا ہے کیوں کہ زبان کسی فرد کی ایجاد کردہ نہیں ہوتی ہے۔ مختلف تہذیبی عوامل رنگا رنگ قدرتی عناصر، مسلسل میل جول، رسوم و معاشرت، ایک دوسرے میں صدیوں جذب ہوتے رہتے تب کہیں رفتہ رفتہ کسی زبان کے خدوخال اجاگر ہوتے ہیں اور یہی زبان اس معاشرہ اور سماج کی ترجمانی کرتی ہے۔

سماجیات، سماج کا سائنسی مطالعہ ہے جو مختلف سماجی تعلقات و تہذیب سے متعلق موضوعات کی تجزیاتی تنقید کرتی ہے۔ انسانی رویوں اور رجحانات کا مطالعہ، سماجی پالیسی، فلاح و بہبود، قبولیت اور تبدیلیاں، ان تبدیلیوں کے اثرات وغیرہ کا سائنسی طریقہ کار سے تحقیق کرے اور اس کا اطلاق راست طور پر سماجی پالیسی اور فلاح و بہبود پر کریں۔ سماجیات ثانوی طور پر دیگر موضوعات پر بھی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ جیسے نظریات کی فہم اور سماجی طریقہ کار۔

لفظ Sociology لیٹن (Latin) اور یونانی زبانوں سے اخذ کردہ ہے۔ لیٹن لفظ Socious گریک لفظ logos یعنی knowledge، 1870ء میں فرنچ فرانسیسی مضمون نگار Emmanuel-Josephsieyes نے اپنے مخطوطے میں پہلی بار یہ لفظ استعمال کیا۔ فرانسیسی فلاسفر اگست کومٹے (August Comte) (1798-1857ء) نے سماج کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی اور اسے سماجی طبعیات کا نام دیا۔

سماجیات کی روایتی توجہ سماجی طبقہ واریت، سماجی طبقہ (Social Mobility)، مذہب، جمہوریت، قانون، جنس، سماجی ساخت، انفرادی ایجنسیاں، انسانی سرگرمیاں اور سیاسی نظام پر رہی ہے۔ اس نے اپنے دائرہ کار کو وسعت دیتے ہوئے صحت، میڈیکل، معیشت، فوج، تعلیم، سماجی ادارے اور دیگر سماجی سرگرمیوں کے کردار کا سائنسی مطالعہ کرتے ہوئے ترقی میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔

Macro Linguistics

اسے عام طور پر زبان کی سماجیات کہا جاتا ہے۔ یہ وسیع پیمانہ پر زبان اور سماجیات کے درمیان تعلق کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس قسم کے مطالعہ میں زبان کا Data کارآمد ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کہاں سے ہے؟ وہ دیہات میں ہے یا شہر میں ہے؟ عمر اور جنس، افراد خاندان، کس قسم کی رہائش گاہوں میں رہائش پذیر، تعلیم کا معیار، کام کی قسم، ہجرت کی ہے کیا؟ کہاں سے اور کب کی؟ زبان جو وہ اپنے گھر میں استعمال کرتے ہیں۔ انفرادی طور پر زبان کے استعمال کی تفصیلات اور مختلف زبانوں کے بولنے والے ذو لسان سماج کا مطالعہ۔

یہ سادہ سماجی لسانیات کہلاتی ہے۔ یہ تفصیلی طور پر فرد کے زبانی اظہار کا مطالعہ کرتی ہے۔ زیادہ زبانی Phenomena پر توجہ دیتی ہے۔

اسے ینگ اور پیرول کا جدلیاتی رشتہ قرار دیا گیا ہے۔ لانگ کا تصور سماج میں رچا بسا ہوتا ہے۔ یعنی اس سے کسی بھی سماج میں زبان کے تمام بولنے والے (غیر شعوری طور پر ہی) استفادہ کرتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی بھی زبان نہیں بول سکتا ہے۔ پیرول زبان کے جامع نظام کی محض انفرادی مثال ہے جو کسی فرد واحد کے تکلم یعنی بول چال میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ گویا لانگ زبان کا جامع تجریدی نظام ہے اور پیرول اس کی محدود انفرادی شکل جو زبان بولنے والے کے تکلم میں ظاہر ہوتی ہے۔ لانگ یعنی لسان کا قواعد وضوابط و روایات کا وہ جامع ذہنی تصور جس کی رو سے ہم کسی لسانی سماج میں ترسیل وابلاغ کا کام لیتے ہیں جب کہ کلام روزمرہ کا تکلم ہے یعنی زبان کا وہ استعمال جو زبان بولنے والا کوئی بھی فرد کرتا ہے۔ زبان چوں کہ تمام اقوام میں آفاقی طور پر موجود ہے مخصوص خصوصیات رکھتی ہے ان خصوصیات کا سائنسی اور گہرا مطالعہ لسانیات اور سماجیات کے اشتراک سے انجام دیا جاتا ہے۔

12.4 تنوع واسلوب زبان

تنوع یعنی قسم قسم کا ہونا۔ ایک ہی معاشرے میں رہنے بسنے کے باوجود زبان کی طرز جداگانہ ہونا۔ یہ مختلف سطحوں پر ہوسکتی ہے۔ مثلاً شہری دیہاتی یا گھر میں بولی جانے والی زبان۔ پروفیسر محمد حسن اس جانب توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ پورے ہندوستان میں تہذیب، زبان اور ادب کا دو سطحی نظام کا وجود تھا۔ ایک وہ جو بڑے مدنی (شہری) مرکز میں رہتے ہیں دوسرے جو قصبہ یا گاؤں میں رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بولی جانے والی زبان سے مدنی مرکز کی زبان مختلف ہوتی ہے لیکن اسے دوطرفہ اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ مثلاً اقبال، منٹو اور فیض پنجابی میں گفتگو کرتے مگر کلچر کی زبان تخلیقی طور پر اختیار کرتے تھے۔

اقتصادی وجوہات کی بنا پر قومی اور بین الاقوامی تجارت کے نئے مرکز گجرات اور دکن بن گئے تو بین الاقوامی تہذیب اور اس کی ادبی روایت گجرات میں گوجری اور دکن میں دکنی اردو کے نام سے شناخت کی جانے لگی۔

پروفیسر کوسمبھی کا قول اس تنوع اور زبان کے طرز کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے کہ سارے تہذیبی رشتے اصلاً تجارتی رشتے ہوتے ہیں۔ وہ سیاست کی باگ ڈور کو اقتصادیات کے ہاتھوں میں سمجھتے ہیں۔

عہد محمد شاہی میں تصنع اور بناوٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ شاعری تفریح کا ذریعہ تھی اور ایہام گوئی ان کے مزاج میں شامل ہوگئی تھی۔ مرہٹوں کے دہلی پر حملہ کے وقت ایک نواب کے واپس آنے پر امیر خاں انجام کا ذومعنی فقرہ ''نواب آئے ہمارے بھاگ آئے'' اس دور کے مزاج اور طرز کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایہام گوئی کے ردعمل کے طور پر تحریک اصلاح زبان شروع کی گئی جس کے تحت ''مین، سی، سوں، کیدھر، اودھر، یاں، واں'' لفظوں کی جگہ ''میں، سے، کدھر، ادھر، یہاں، وہاں'' کے لفظوں کو رائج کیا گیا۔

عربی کے لفظ صلوۃ، صوم ملائکہ کی جگہ زرتشتی لفظ نماز، روزہ اور فرشتے قدیم ایرانی اور زرتشتی، آریائی اور قدیم

ہندوستانی آریائی کی تہذیب اور مزاج کی ہم آہنگی اور مماثلت کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

12.4.1 بولیاں

دنیا کے ہر علاقہ میں انسانوں کا ایک سماج ہوتا ہے جس کا اپنا سماجی نظام ہوتا ہے اور ایک زبان ہوتی ہے۔ ہر دو علاقوں کے درمیان ایک مخلوط زبان پرورش پانے لگتی ہے۔ جس میں پڑوسی زبانوں کی خصوصیات شامل ہوتی ہیں۔ ہر لسانی علاقہ کا اگرچہ ایک مرکز ہوتا ہے جہاں زبان کا معیاری محاورہ ادا کیا جاتا ہے لیکن جیسے ہی یہ مرکز سے دور سرحدوں کی جانب بڑھنے لگتی ہے تو اس کے معیار میں رعایت اور ضوابط میں نرمی آنے لگتی ہے۔ پڑوسی زبانوں کی خصوصیات اور الفاظ کا میل شروع ہو جاتا ہے اور زبان کا گہرا رنگ ہلکا ہونے لگتا ہے۔ ایک لسانی علاقہ میں بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دو مختلف مقامات کے رہنے والوں کی زبان بالکل ایک نہیں ہوتی ہے۔

وسطی ہند آریائی زبان یعنی مغربی ہندی کے ذریعہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی پانچ شاخیں:
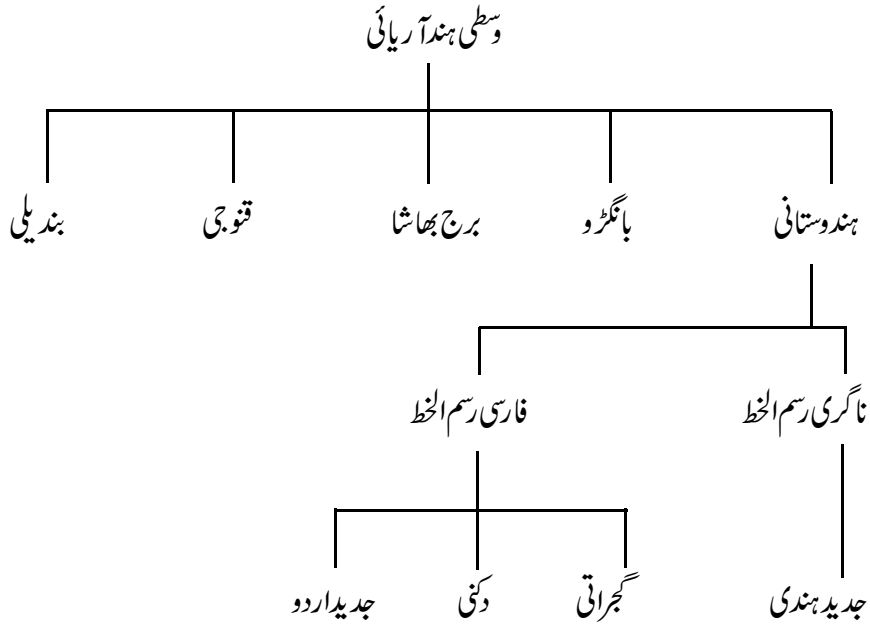
12.4.2 دفتری زبانیں

دفتری زبان سے مراد وہ زبان ہوتی ہے جسے حکومتی سطح پر ملک، ریاست یا علاقہ میں خاص قانونی مقام دیا گیا ہو۔ کسی ملک کی دفتری زبان وہ کہلاتی ہے جسے حکومت انتظامیہ، عدلیہ، مقنّنہ وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہو۔ واضح رہے کہ کسی ملک کے باشندے عموماً جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ دفتری زبان نہیں کہلاتی ہے۔ دنیا بھر میں موجود 178 ممالک میں سے ہر ملک کم از کم اپنی ایک دفتری زبان رکھتا ہے 101 ممالک کی ایک سے زائد دفتری زبانیں ہیں جن ممالک میں دفتری زبان اختیار نہیں کی جاتی وہاں حکومتی اداروں میں عموماً قومی زبان استعمال کی جاتی ہے انگریزی کو سب سے زیادہ دفتری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ 51 ممالک میں اسے دفتری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ عربی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانیں بھی دفتری زبانوں کے طور پر

بڑے پیمانے پر اختیار کی گئی ہے۔

آصف جاہی حکومت میں اردو کو دفتری زبان کا درجہ دینے کے لیے نئی ترکیبیں اور اصطلاحات وضع کی گئیں اور دفتری کارروائیوں کے لیے اردو کا کامیابی سے استعمال کیا گیا۔آصف سابع میر عثمان علی خان کے وزرات مالیات کے محکمہ جات کے نام خزانہ عامرہ، سکہ وشرح تبادلہ 3 موازنہ (بجٹ) صدر محاسبی و تنقیح، حسابات بیمہ فنڈ، اوزان و پیمانہ جات، دفتر دیوانی، ملکی و مالی، معدنیات و پیمائش العرضی، سررشتہ دارالطبع وصادر وغیرہ۔

ایک فرمان کی مثال جو دفتری زبان کی نمائندگی کرتا ہے:

''عدالت عالیہ کو لکھا جائے کہ تا وقت یہ کہ ہر پائیگاہ کا انتظام امیر پائیگاہ کے سپرد نہ ہو، تمام مقدمات صدرالمہام پائیگاہ کے نام سے چلنا چاہیے۔''

12.4.3 مذہبی زبانیں

مذہبی زبانیں سماج میں مقدس اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔جیسے ویدوں، گرنتھوں اور اپنشدوں کی زبان، عبرانی، عربی اور سنسکرت وغیرہ۔ سنسکرت کو مقدس درجہ دیتے ہوئے اور اسے پاک رکھنے کے لیے خواص کی زبان قرار دیتے ہوئے محدود کر دیا گیا۔ جب کہ دیگر زبانوں کا استعمال عام رہا اور وہ نئی سمتوں پر گامزن ہونے لگی۔

مذہبی زبانیں سماج پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔جیسے قرآن مجید کے ترجمے جو عربی جملے کی ساخت کو اردو کے لسانی مزاج کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور زبان میں ایک نیا اضافہ کرتے ہیں۔ مذہبی زبانیں زبان کو قوت فراہم کرتی ہیں، ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرتی ہیں۔اردو میں صوفیائے اکرام کی مذہبی تصنیفات اس کی اہم مثال ہیں۔

12.4.4 معیاری زبانیں

معیاری زبان اور فصیح زبان اس معیاری لہجہ یا لسانی نوع کو کہا جاتا ہے جسے عموماً مصنفین اپنی تصنیفات اور لٹریچر میں مقررین اپنی تقریروں میں استعمال کرتے ہیں اس زبان میں متعلقہ زبان کے قواعد صرف ونحو کو مکمل ملحوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔عموماً تمام کتابیں اور لٹریچر اسی معیاری زبان میں شائع کیے جاتے ہیں۔ معیاری زبان جس کے ادب کا بڑا ذخیرہ ہو اور قدامت بھی ہو اسے کلاسیکی زبان کا درجہ دیا جاتا ہے۔لفظ کلاسیک اردو میں ادب عالیہ یا اعلیٰ ترین درجہ کے ایک مروجہ معیار یا نمونہ کو کہتے ہیں۔

مختلف ممالک میں اس کی تعریفیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ دو ہزار سالوں کی قدامت رکھنے والی زبانوں کو بھارتی حکومت نے کلاسیکی زبان (Classic Language Status) کا درجہ دیا ہے۔

12.4.5 قومی زبانیں

قومی زبان مملکت کی پہلی زبان ہوتی ہے۔ایک یا دو زبانیں بھی پہلی زبان کے طور پر بولی جاتی ہے۔قانون ساز اداروں میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں اور سماجی اداروں میں اسے اہمیت دی جاتی ہے۔
قومی زبان کو مرکزی زبان بھی کہتے ہیں۔قومی زبان کسی بھی قوم کی شناختی زبان (Central Language) ہوتی ہے۔

12.4.6 بین الاقوامی زبانیں

عالمی زبان (World Language) ایک ایسی زبان ہوتی ہے جو بین الاقوامی سطح پر بولی جاتی ہے اور بہت سے لوگ اسے دوسری زبان کے طور پر اپناتے ہیں۔مثلاً انگریزی زبان جسے 430 ملین لوگ خالص مادری زبان کے طور پر بولتے ہیں اور 9.50 ملین لوگ بطور مادری یا دوسری زبان کے طور پر بولتے ہیں۔اسی طرح مختلف زبانیں ہوسکتی ہیں جیسے عربی، فرانسیسی، جرمنی، جاپانی وغیرہ۔یعنی ایک ایسی زبان جس کے ذریعہ مختلف ملکوں میں عموماً بات چیت کی جاسکے۔جو دنیا کے مختلف خطوں میں بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جاسکے۔

12.5 لسانی ثنویت

معاشرتی لسانیات میں لسانی ثنویت ایک اہم تصور ہے۔(Socio Linguistics) کی مدد سے معاشرے کے افراد میں ہونے والے تبادلہ خیالات، ان کے مابین روابط کی معاشرتی ساخت کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے۔ بنیادی طور پر لسانی ثنویت دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔معاشرہ میں اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے پائے جانے والے مختلف طبقات اس لسانی ثنویت میں اضافہ اور اس کو نمایاں کرنے کا سبب بنا کرتے ہیں۔وہ معاشرے جن میں شرح خواندگی زیادہ ہو جاتی ہے ان میں لسانی ثنویت کی کیفیت موجود ہوتے ہوئے بھی کسی بڑے انشقاق یا تفریق کا باعث نہیں بنتی ہے۔جس کی مثال انگریزی اور جاپانی زبانوں سے دی جاسکتی ہے۔جیسے روایتی زبان رسمی مقاصد اور تحریر و تقریر اور دفاتر میں استعمال کی جاتی ہے۔بول چال کی زبان گھر، گلی، محلّہ میں استعمال کی جاتی ہے۔ادب عالیہ کی زبان وہ مختلف رہے گی۔

12.5.1 مادری زبان

مادری زبان یا اول زبان یا نسلی زبان آبائی، پیدائشی زبان اسے کہا جاتا ہے جس کو انسان بچپن میں اپنے ماں باپ یا ہم جنسوں سے سیکھیں اور بہ طور زبان اول اختیار کرلے۔مادری زبان بولنے سے پہلے بچہ نہ تو حرف تہجی سے واقف ہوتا ہے اور نہ ہی وہ زبان کے اصول وقواعد سے آگاہ ہوتا ہے۔وہ صرف زبان کو سنتا اور سمجھتا ہے۔جملوں کی نقل کرتا ہے اور بولنا شروع کرتا ہے اور عام بول چال کی زبان سیکھ لیتا ہے۔زبان کی ساخت سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود وہ زبان کو بہتر طور پر استعمال کرنے لگتا

ہے۔ چوں کہ زبان تقریری ابلاغ(Spoken Communication) کا ذریعہ ہے۔

12.5.2 محاورے، ضرب الامثال

محاورے اور ضرب الامثال کسی بھی زبان میں نہ بدلنے والے مستقل رہنے والے جملے یا کہاوتیں ہیں۔ ان کا برمحل استعمال گفتگو میں دلچسپی اور روح پیدا کر دیتا ہے یہ صورت حال کو چند الفاظ میں بیان کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

محاورہ عربی زبان کے لفظ حورہ سے مشتق ہے جس کے معنی پھرنا یا گردش کرنا ہے دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مجموعہ جو حقیقی کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوں اور اہل زبان کے روزمرہ بول چال کے مطابق ہو۔ مصدر کی علامت ''نا'' اس کی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے۔

آڑے آنا	یعنی	سپر بن جانا، پناہ بہم پہنچانا۔
آسمان ٹوٹ پڑنا	یعنی	سخت مصیبت آن پڑنا۔
پانی پھرنا	یعنی	ضائع ہونا۔

ضرب الامثال

آپ کاج مہا کاج۔

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

بات لاکھ کی کرنی خاک کی۔

12.5.3 جملہ

جملہ وہ آزاد لسانی ہیئت ہوتی ہے جو کسی قواعدی تعمیر کے ذریعہ اس سے بڑی لسانی ہیئت کا حصہ نہ ہو۔ اپنے آپ میں مکمل ہو، ساتھ ہی یہ صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا ہے اس میں زبان و اسلوب کی مخصوص قواعدی ترتیب موجود ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ایک بامعنی لفظوں کا مجموعہ کہلاتا ہے۔ اس میں ترتیب شرط نہیں لیکن اصل زبان سے مطابقت لازمی ہے۔ مثال:

میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

یا

میں ایک بات جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

انجیل کے ترجمہ شدہ جملے

''اور ہمارے گناہ معاف کر کیوں کہ ہم بھی اپنے قرض دار کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔''

12.5.4 لہجہ

لسانیات میں لہجہ، بول چال کے اس طریقہ کو کہتے ہیں جو کسی شخص شہر،صوبہ، علاقہ یا ملک میں خاص پایا جاتا ہو۔ لہجہ کو انگریزی میں Accent کہتے ہیں۔ ایک ہی زبان کے بہت سے لہجہ ہوسکتے ہیں۔ وقت اور فاصلہ بھی نیا لہجہ پیدا کرنے کا ایک سبب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی زبان کے ساتھ جب ہم سایہ زبانیں بولی جاتی ہیں تو لہجہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ لہجہ میں آواز کا اتار چڑھاؤ، تلفظ کی ادائیگی، حروف علت اور حروف صحیح اور دباؤ (Stress) کا استعمال، قواعد، معنیات، ذخیرہ الفاظ وغیرہ لہجہ کو مختلف بناتے ہیں۔ کچھ لہجہ سماج میں اہمیت حاصل کر لیتے ہیں اور اعلیٰ و معیاری مانے جاتے ہیں۔ یہ اثر اس لیے ہوتا ہے کہ یہ لہجہ اور انداز امرا اور اعلیٰ طبقہ سے جڑا ہوتا ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ لہجے بھی تبدیلیوں سے گزرتے ہیں۔ باہمی اختلاط کے باوجود اپنی ایک مخصوص پہچان قائم کرتے ہیں۔

12.5.5 تکریم کنندہ

اعزازی نام جو عزت واحترام کے لیے دیا جائے۔ مثلاً بابائے قوم اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے کسی ملک، ریاست یا قوم کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا ہو۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی اور پاکستان میں محمد علی جناح کو بابائے قوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق کو اردو زبان کی خدمت پر بابائے اردو کہا جاتا ہے۔

کسی تنظیم یا ریاست کی جانب سے بھی اعزازی لقب فرد کی خدمت کے اعتراف میں اور ستائش کے لیے دیے جاتے ہیں۔ قدیم دور میں بادشاہ کی جانب سے امرا اور اعلیٰ عہدہ داروں کو خطاب عطا کرنا شاہی نظام کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ دہلی کے سلطان نے نظام الملک کو ''آصف جاہ'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ خطاب دیتے وقت منتخب کردہ فرد کی خصوصیت کے مطابق خطاب اور وصف کو جمع کیا جاتا تھا۔ بہادری کے حامل فرد کو شجاعت جنگ، علم وفضیلت کا مظاہرہ کرنے والے کو فضیلت جنگ، عظمت جنگ وغیرہ۔ خطاب یافتہ شخص کے پیشہ قبیلہ، طبقہ اور مذہب کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ مثلاً عرب جمعہ دار سپاہی پیشہ شخص کو سیف نواز جنگ، شمشیر جنگ، طبیب کے لیے فیض جنگ، لقمان الدولہ، پارسی طبقہ کے لیے سہراب جنگ، رستم جنگ وغیرہ اہل ہنود کو درجہ رائے رایان، راجہ راجمان، دھرم ونت، راجہ بہادر وغیرہ۔

عوام کی جانب سے بھی محبت واحترام میں القاب دیے جاتے ہیں جیسے حضرت فاطمہ الزہرا کے القاب افضل النساء، ام الائمہ، طاہرہ، مرضیہ، معصومہ، بتول، عذرا، ام الحسن ام الحسین وغیرہ۔

یہ القاب وخطابات سماجی رتبہ کا اظہار کرتے ہیں اور اس سماج کی زبان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

12.5.6 توریہ، کنایہ

کنایہ جس کے معنی کسی لفظ کو بول کر اس کے حقیقی معنی کے علاوہ دوسرے معنی مراد لینا۔ یعنی لفظ کے جو ظاہری معانی

ہے وہ غلط ہیں مگراس کے دوسرے معنی مراد لیے جائیں جو صحیح ہے۔اسے ابہام ایک لفظ کے دو معنی قریب اور بعید بولنے والا بعید کا معنی مراد لے اور مخاطب قریب تر سمجھے۔انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ آپ ؐ کی خدمت میں آ کر ایک شخص نے سواری طلب کی۔آپؐ نے فرمایا میں تم کو اونٹ کے بچہ پر سوار کروں گا۔اس شخص نے کہا یا رسولؐ میں اونٹ کے بچہ کا کیا کروں گا؟ آپؐ نے فرمایا جو اونٹ پیدا ہوتا ہے وہ اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ابہام یا کنایہ کے حوالہ سے ہم کسی زبان کی خاصیت اور اس کی تہذیب کو جان سکتے ہیں۔الفاظ کا کثیر ذخیرہ اور لفظوں کو استعمال کرنے کی مہارت بھی اس طریقہ کار میں ظاہر ہوتی ہے۔

12.6 خلاصہ

اس کائی میں ہم نے سماجی لسانیات کی تعریف کی ہے۔اس کے دائرہ کار کو سمجھا ہے۔لسانیات کیا ہے؟ جانا ہے۔ سماجیات کسے کہتے ہیں؟ اس بات سے واقفیت حاصل کی ہے۔ساتھ ہی لسانیات اور سماجیات کے درمیان تعلق کو سمجھا ہے۔سماجی لسانیات سے تعلق رکھنے والے مندرجہ ذیل اہم نکات کو اس اکائی میں پیش کیا گیا ہے۔

1۔ تنوع واسلوب زبان یعنی زبان کے مختلف طرز کس قسم کے ہوتے ہیں۔

2۔ بولیاں کیسے بنتی ہیں۔

3۔ دفتری زبان حکومت کے انتظامیہ کی زبان ہوتی ہے۔

4۔ مذہبی زبانیں زبان کو قوت فراہم کرتی ہیں۔

5۔ معیاری زبان کو ادبی تحریروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

6۔ قومی زبان مملکت کی پہلی زبان کے طور پر بولی جاتی ہے۔تعلیمی اداروں،قومی اداروں اور سماج میں اسے اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

7۔ معاشرے میں لسانی ثنویت موجود رہتی ہے۔

8۔ مادری زبان نسلی طور پر سیکھی جاتی ہے۔اس میں ابتدا میں زبان کے اصول وقواعد سے آگاہی نہیں ہوتی ہے۔

9۔ محاورے اور ضرب الامثال زبان کے مستقل جملے ہوتے ہیں۔

10۔ جملے بامعنی لفظوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔اس میں ترکیب اور اصل زبان سے مطابقت پائی جاتی ہے۔

11۔ کسی شہر،صوبہ،علاقہ یا ملک کے مخصوص بول چال کے طریقہ کو لہجہ کہتے ہیں۔

12۔ تکریم کنندہ خطابات اور القاب سماجی رتبہ اور زبان کی ترجمانی کرتے ہیں۔

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ سماجی لسانیات اور اس کے دائرکار پر روشنی ڈالیے۔

2۔ لسانیات اور سماجیات کے باہمی تعلق کو واضح کیجیے۔

3۔ تنوع اور اسلوب زبان کے تحت زبانوں کی وضاحت کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ سماجی لسانیات کی اہمیت پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

2۔ کن معیارات سے ہم سماجی لسانیات کا جائزہ لے سکتے ہیں؟

3۔ کسی دو عنوانات پر نوٹ لکھیے:

i۔ لسانی ثنویت

ii۔ محاورے ضرب الامثال

iii۔ توریہ، کنایہ

iv۔ بولیاں

12.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔ ہندوستانی لسانیات : ڈاکٹر محی الدین قادری زور

2۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

3۔ تشریحی لسانیات : ڈاکٹر سہیل بخاری

4۔ عام لسانیات : ڈاکٹر گیان چند جین

5۔ اردو میں لسانیات کے مباحث : عبدالغفور ساہی

6۔ Linguistics Sociology : Wikipedia
Socio Linguistics

اکائی 13 لسانیات اور تاریخ

ساخت

13.0 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مقصد لسانیات اور تاریخ کے درمیان رشتے کی وضاحت کرنا ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- لسانیات کے مفہوم اور دائرہ کار کی وضاحت کر سکیں
- لسانیات کی ماہیئت پر روشنی ڈال سکیں
- لسانیات کی مختلف شاخوں پر اظہار خیال کر سکیں
- تاریخ کی تعریف اور اس کی ماہیئت پر روشنی ڈال سکیں
- تاریخ نویسی کے آغاز کی نشاندہی کر سکیں
- تاریخ کے ماخذ کی وضاحت کر سکیں اور
- لسانیات اور تاریخ کے رشتے کا تجزیہ کر سکیں۔

13.1 تمہید

اس بلاک کی پہلی اکائی میں آپ نے لسانیات اور سماجیات کے رشتے کا تفصیلی مطالعہ کیا اور یہ دیکھا کہ یہ دونوں علوم کن مسائل میں ایک دوسرے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کوئی علم یا کوئی فن اپنے آپ میں

مکمل، خود مکتفی اور دوسرے علوم وفنون سے بے گانہ اور بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ہر علم کو عمل آرائی اور ترقی کے لیے دوسرے علوم پر کسی نہ کسی حد تک انحصار کرنا اور ان سے مدد حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ یہی بات لسانیات کے تعلق سے بھی کہی جا سکتی ہے کہ لسانیات بھی مکمل طور پر خود مکتفی علم نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اپنی مستقل حیثیت ضرور رکھتا ہے لیکن اپنے مقاصد اور افعال کی تکمیل کے لیے اسے دوسرے علوم سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اس اکائی میں ہم لسانیات اور علم تاریخ کے باہمی ربط و تعلق کا مطالعہ کریں گے اور یہ دیکھیں گے وہ کون سے امور ہیں جہاں دونوں ایک دوسرے کے مواد و معلومات سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

13.2 لسانیات

اس کتاب کی اکائی 1 میں ہم نے لسانیات کی تعریف اور تفاعل کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ یہاں تاریخ سے اس کے تعلق کے مطالعے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لسانیات کی تعریف، ماہیئت، احاطہ کار اور دوسرے پہلوؤں پر دوبارہ سرسری نظر ڈالی جائے۔

1716ء میں ڈیویز نے تقریباً علم زبان کے مفہوم میں Glossology کا لفظ استعمال کیا۔ چوں کہ قدیم زمانے میں لسانیات کا کوئی علاحدہ علم نہ تھا اس لیے لوگ اسے قواعد سے مماثل جانتے تھے۔ جب ہند یوروپی خاندان کی زبانوں کا تقابل کیا گیا تو اس موضوع سے متعلق کتابوں کا نام تقابلی قواعد رکھا گیا، جب یہ معلوم ہوا کہ علم زبان محض قواعد (صرف نحو) نہیں بلکہ صوتیات، معنیات وغیرہ کا بھی احاطہ کرتا ہے تو اس اصطلاح کو چھوڑ کر انیسویں صدی میں اسے Comparative Philology کہا گیا۔ Philo کے معنی ہیں ''محبت'' اور Logy کے معنی ''لفظ، علم''۔ فائلالوجی کے معنی ہیں ''زبان کی محبت''۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ سائنس میں تقابل تو ہوتا ہی ہے اس لیے Comparative کے لفظ کی کیا ضرورت ہے۔ تب اسے محض فائلالوجی کہا جانے لگا۔ 1841ء میں پرچرڈ نے اسے Glottology کہا۔

فائلالوجی کے لفظ پر اس لیے اعتراض تھا کہ اس کے ذیل میں ادب، اسلوب وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔ فرانس میں انیسویں صدی میں اس سے بہتر اصطلاح Linguistique استعمال کی گئی۔ فائلالوجی یونانی لفظ ہے، لنگوسٹک لاطینی۔ Lingua زبان کو کہتے ہیں۔ گویا لنگوسٹک کے معنی علم زبان ہوئے۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزی میں Linguistic کا لفظ آیا جو چند سال بعد جمع کے صیغے میں Linguistics کہلایا۔ اب یہی لفظ مستند ہو گیا ہے۔ اردو میں اسے لسانیات کہتے ہیں۔

لسانیات کی ہم یہ تعریف کر سکتے ہیں کہ لسانیات ''زبان کے سائنسی مطالعہ'' کا نام ہے۔ لیکن کیا لسانیات میں سائنسی مطالعہ ممکن ہے؟

سائنس میں صحیح اور قطعی اصولوں کی تلاش کی جاتی ہے۔ ان اصولوں کو تجربوں کے ذریعہ سے دکھایا، سنایا اور محسوس کرایا جاتا ہے کہ یہ صحیح ہیں۔ محض عقیدے کے طور پر کچھ تسلیم کرنے کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ سائنس میں قدیم اساتذہ کی سند کے بجائے چشم دید مشاہدے سے کام لیا جاتا ہے۔ سائنس صحیح ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل معروضی بھی ہوتی ہے۔

لسانیات میں کس حد تک تجربے، قطعیت اور معروضیت کی گنجائش ہے؟ اس کا سب سے اہم عنصر انسان ہے۔ جس کے پاس سوچنے اور محسوس کرنے والا ذہن ہے۔ اس انسان کے ذہن کی پیداوار زبان، کو کس طرح معروضی اعتبار سے دیکھا جائے؟

جدید لسانیات کوشش کرتی ہے کہ حتی الامکان زبان کا شخصی اور معنوی عنصر نظر انداز کر کے اس کی ہیئت ہی کا مطالعہ کیا جائے۔ اصوات، صرف اور نحو کو معنوی اور نفسیاتی قدروں سے الگ کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ سائنسی مطالعہ ہے۔ روایتی مطالعہ سائنسی نہیں انسانی (Humanistic) تھا۔ لیکن لسانیات کی تمام شاخیں سائنسی طریق کے تحت نہیں آتیں۔ کچھ میں انسانی عنصر زیادہ ہوتا ہے مثلاً معنیات میں، بولی جغرافیے میں۔

لسانی تجزیے کی ضرورت دو اعتبار سے پڑتی ہے۔ اپنی زبان کو سیکھنے سکھانے میں اور غیر زبان کو سیکھنے میں۔ اپنی زبان کو روایتی قواعد کی مدد سے سیکھنے سکھانے میں بڑا وقت اور محنت درکار ہوتی ہے ہر قاعدے میں مستثنیات ہوتے ہیں۔ یہ بڑا لمبا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ لسانیات اس الجھاوے کو تھوڑے سے اصولوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ بیرونی زبانوں کو روایتی قاعدوں سے سیکھنے میں بہت از بر کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد بھی بیرونی زبان صحیح طور پر بولنی یا لکھنی نہیں آتی لیکن جدید لسانیات کے قاعدوں سے یہ بہت جلد سیکھی جا سکتی ہے۔

لسانی مطالعے کی شاخیں۔ لسانیات کے مطالعے کو مختلف بنیادوں پر مختلف قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم عام (General) اور اطلاقی (Applied) کی ہے۔ دوسری اہم تر قسم زمانے کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔ اگر زبان کا مطالعہ کسی مخصوص نقطہ زماں میں کیا جائے تو اسے عصری لسانیات (Synchronic Linguistics) یا عصری مطالعہ کہتے ہیں۔ اگر یہ مطالعہ زمانے کے تسلسل میں کیا جائے تو اسے عصریاتی لسانیات (Diachronic Linguistics) یا عصریاتی مطالعہ کہتے ہیں۔

ایک زبان کا عصری مطالعہ بالعموم حال کے نقطے میں کیا جاتا ہے۔ ایک زبان کا ایک مخصوص نقطہ زماں میں مطالعہ کیا جائے تو اس کی ساخت ہی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اسے انگریزی میں Descriptive یا Structural لسانیات کہتے ہیں۔ اول الذکر کا مروجہ اردو ترجمہ توضیحی لسانیات کیا گیا ہے۔

عصریاتی مطالعے میں اگر ایک زبان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے یعنی اس میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں کی وضاحت کریں تو اسے تاریخی لسانیات کہتے ہیں۔ اگر ایک خاندان کی کئی زبانوں کا تقابل کیا جائے تو یہ تقابلی لسانیات کہلاتی ہے۔

لسانیات کی اہم شاخ توضیحی لسانیات ہے جس میں زبان کی ہیئت اور صوری خصوصیتوں سے بحث کی جاتی ہے۔ صوری حیثیت سے زبان (صوتیات اور قواعد) کا تجزیہ اور اس کی توضیح اس مطالعے کا اہم مقصد ہوتا ہے۔

تاریخی لسانیات کے مقابلے میں توضیحی لسانیات ہی زیادہ اہم ہے کیوں کہ یہ زبان کے ڈھانچے کو منکشف کرتی ہے۔ تاریخی لسانیات تبدیلی اور ارتقا کا مطالعہ کرتی ہے۔ آج کل دنیا کے تمام بڑے بڑے ماہرین زبان توضیحی لسانیات ہی سے سروکار رکھتے ہیں۔

ایک دوسری بنا پر لسانیات کو عام اور اطلاقی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ عام لسانیات، لسانیات کے نظریات پیش کرتی ہے۔ اس میں زبان کی ماہیت، زبان کے تجزیے کے اصول، مروجہ قواعد سے اس کے اختلافات، لسانیاتی مطالعے کے مختلف شعبوں کے اصول اور ان کا عام تعارف شامل ہوتا ہے۔ عام لسانیات کا عالم انسانی زبانوں کے آفاقی خواص کی تلاش کرتا ہے تا کہ زبانوں کے بارے میں مجموعی طور سے کچھ بیان کر سکے۔

اطلاقی لسانیات، عام لسانیات اور توضیحی لسانیات کا عملی پہلو ہے۔ اس کے ذیل میں اس قسم کے شعبے آتے ہیں بیرونی زبانوں کا سیکھنا، ترجمے کی مشین بنانا، کسی زبان یا بولی کا علاقائی جائزہ لینا، کسی زبان کا کوڈ تیار کرنا، کسی زبان کا خفیہ کوڈ دریافت کرنا، رسم الخط میں اصلاح کی تجاویز، Key Board میں حروف کی ترتیب وغیرہ۔

عام لسانیات میں توضیحی اور تاریخی لسانیات نیز مطالعہ زبان کے دوسرے تمام شعبوں کا تھوڑا تھوڑا سا تعارف پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس میں اصولی پہلو کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے، مثلاً صوتیات کے تعارف میں صوتیات کے اصول درج کر دیے جائیں گے۔ کسی ایک زبان کی صوتیات کا تجزیہ نہیں کیا جائے گا۔ یہی کیفیت صرف، نحو، معنیات، فن تحریر وغیرہ کے سلسلے میں ہوگی۔

توضیحی لسانیات کے احاطہ کار کا صحیح اندازہ اس کی شاخوں کی تفصیل سے ہوگا جو حسب ذیل ہیں:

(1) صوتیات (Phonetics):

اس میں اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ شاخ کسی ایک زبان تک محدود نہیں۔ اس میں تمام زبانوں کا مجموعی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ویسے کسی زبان یا بولی کی صوتیات پر بھی بحث کی جا سکتی ہے۔

(2) فونیمیات (Phonemics):

اس میں کسی ایک زبان کے صوتیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ صوتیات میں آوازوں کی زیادہ سے زیادہ نزاکتیں دریافت کی جاتی ہیں لیکن فونیمیات میں غیر ضروری نزاکتوں کو نظر انداز کر کے صرف انھیں اختلافات کا جائزہ لیا جاتا ہے جو معنی کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس طرح اصوات کی متعدد ذریات کی گروہ بندی کر کے انھیں کم سے کم صوتیوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ اس شاخ کو Phonology بھی کہتے ہیں۔

(3) مارفیمیات یا صرف (Marphology):

اس میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً ایک مادے میں سابقے اور لاحقے لگا کر نئے الفاظ کا اشتقاق کیوں کر ہوتا ہے۔

(4) نحو (Syntax):

اس کا موضوع کلام یعنی جملہ اور فقرہ ہے۔ صرف و نحو کو ملا کر زبان کی قواعد کہا جاتا ہے۔

(5) معنیات (Semantics):

اس میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

اگرچہ توضیحی لسانیات نے زبان کے مطالعے کی مندرجہ بالا پانچ شاخیں قرار دی ہیں لیکن توضیحی لسانیات میں پہلی چار شاخوں کا مطالعہ ہی کیا جاتا ہے۔ ان میں فونیمیات، صرف اور نحو کو مرکزی شاخیں قرار دیا جاتا ہے اور صوتیات اور معنیات کو نواحی۔ صوتیات میں چوں کہ ان موشگافیوں سے بحث کی جاتی ہے جو روزانہ ضروریات کے مصرف کی نہیں اس لیے اسے غیر اہم قرار دیا گیا ہے۔ معنیات کو یہ کہہ کر غیر ضروری قرار دے دیا جاتا ہے کہ یہ لسانیات کی شاخ نہیں اس کا مطالعہ لغت یا ادب میں کیا جانا چاہیے۔ توضیحی لسانیات کے علما کا اس بات پر شدت سے اصرار کرتے ہیں کہ لسانیات کو زبان کی ہیئت ہی سے سروکار ہے معنی سے نہیں۔

لسانیات کی کچھ اور شاخیں یہ ہیں:

(1) لسانی جغرافیہ یا بولی جغرافیہ:

اس کے ذیل میں مختلف زبانوں اور اس کی بولیوں کا علاقہ مقرر کیا جاتا ہے۔

(2) جائزے کے طریقے (Mield Methods):

اس کے ذیل میں بالعموم کسی ایسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہنوز تحریر نہیں کی گئی۔ اس شعبے کا کام ان اصولوں کو مرتب کرنا ہے جن کی مدد سے زبان کے صحیح نمونے اکٹھے کیے جاسکیں۔

(3) لسانی زمانیات (Glottochronology) یا (Lexico Statistics):

اس میں اعداد و شمار کی مدد سے کسی زبان کی عمر کا تعین کیا جاتا ہے۔

(4) لسانی عتقیات (Linguistic Paleentology):

اس میں قدیم زبانوں کی مدد سے قدیم تہذیبوں اور قبل تاریخ زمانے کی تاریخ معلوم کی جاتی ہے۔ گویا یہ اطلاقی لسانیات کی شاخ ہے۔

(5) تدوین اللغات (Lexicography یا Lexico Logy):

اس میں کسی زبان بالخصوص پچھڑی ہوئی زبان کے لغت بنانے کے اصول طے کیے جاتے ہیں۔

(6) اسلوبیات (Stylistics):

اسے یوروپی ماہرین لسانیات کی شاخ مانتے ہیں لیکن اکثر امریکی علما اسے لسانیات کے حصار میں شامل نہیں کرتے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ عبارت کو جذباتی اور شاعرانہ بنانے کے لیے کیا کیا طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ مختلف ادیبوں کے اسلوب کا صوتیاتی، مارفیمی اور ڈکشن وغیرہ کا تجزیہ کر کے ان کی مرغوب تکنیک کی باریکیوں کو واضح کیا جاتا ہے۔

(7) نفسیاتی لسانیات (Psycho-Linguistics):

نفسیاتی لسانیات کی اس تعریف کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ لسانی رویوں (Linguistic Behaviour) کو بہ خوبی سمجھا جاسکے۔ اس تعریف میں لسانی رویے کی اصطلاح ان تمام لسانی اظہار (Linguistic Expression) کے لیے استعمال کی گئی ہے جو انسان دوران گفتگو کرتا رہتا ہے۔ اس لسانی اظہار کے پیچھے ذہنی کارکردگی، احساسات و کیفیات اور قوت گویائی کا عمل شامل ہوتا ہے اس طرح لسانی رویے کی اصطلاح ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

13.3 تاریخ: تعریف و تعارف

متعدد علوم عمرانی کی طرح تاریخ بھی ایک اہم عمرانی علم ہے۔ اس کا بنیادی سروکار ماضی سے ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں جن میں زبان بھی ایک اہم شعبہ ہے۔ اس حوالے سے تاریخ کا بعض میدانوں میں لسانیات سے گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس رشتے کی مزید وضاحت سے قبل آیئے دیکھتے ہیں کہ تاریخ کیا ہے؟ خلیل الرب نے ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے شائع شدہ اپنی کتاب ''تدریس، تاریخ، نظریات، اصول اور طریقے'' میں تاریخ کی تعریف، ماہیئت اور تاریخی ماخذ کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ ذیل میں اسی کتاب کی معلومات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

تاریخ کی جامع تعریف دشوار ہے۔ زمانہ اور وقت کے ساتھ لفظ تاریخ کا استعمال مختلف معانی میں ہوتا رہا ہے اور ہر قابل ذکر عالم نے اپنی طرز فکر، انفرادی زاویہ نگاہ اور مقاصد کے پیش نظر اس کی تعریف و توجیہ کی ہے۔ دراصل اپنے ابتدائی اور اصلی معنی میں لفظ تاریخ بہت وسیع تھا۔ اسے مجموعہ معلومات تصور کیا گیا، علمیت کے اظہار کا ایک معتبر میدان سمجھا گیا۔ اس کا شمار شعبہ علم یا اکیڈیمک ڈسپلن میں کیا گیا۔

لیکن اس وسیع معنی کا اطلاق نصاب مدرسہ کے سارے مضامین اور علوم وفنون پر ہوسکتا تھا۔ اس لیے تاریخ کا استعمال اس مخصوص علم کے لیے کیا جانے لگا جس میں ماضی کے واقعات کو ان کے روابط کے ساتھ تسلسل کے تناظر میں پیش کیا جائے۔ شجر، حجر، حیوان و انسان غرض یہ کہ دنیا کی ہر شے اپنی تاریخ رکھتی ہے۔ مگر ان معنی میں تاریخ کا استعمال اضافت کے ساتھ ہوتا ہے مثلاً تاریخ حیاتیات، تاریخ علم ارضیات، تاریخ علم کیمیا، تاریخ تاج محل، تاریخ لال قلعہ دہلی وغیرہ۔

لفظ تاریخ کا ایک ابہام یہ بھی ہے کہ ماضی میں جو کچھ واقع ہو چکا ہے اس کے بیانات کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کے مطالعہ کے لیے بھی اسی لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ معنی کا یہ فرق اہم ہے۔ بنیادی طور پر مورخ اس خام مواد کی توجیہ وتشریح کرتا ہے جو ماضی کے انسانی تجربات کی شکل میں تاریخ کا جزو بن چکا ہے۔ اس عمل میں وہ جو کچھ کہتا ہے اسے بھی ہم تاریخ کا نام دیتے ہیں اس لیے ایک شعبہ علم کی حیثیت سے تاریخ کا جائزہ لیتے وقت ہمارے سامنے یہ معیار ہوتا ہے کہ کیا مورخ اپنے اکتساب یا تخلیق سے ہماری واقفیت اور جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے اس کی تفہیم میں اضافہ کرتا ہے یا نہیں کیوں کہ بالآخر مورخ کا دراصل یہی صحیح موقف ومنشا ہوتا ہے۔

جس طرح بہت سے علوم وفنون کا سرچشمہ سرزمین یونان ہے اسی طرح تاریخ کی ابتدا بھی یونان سے ہوئی۔ ہسٹری یعنی تاریخ یونانی لفظ ہسٹوریا (Historia) سے ماخوذ ہے جس کے معنی تحقیق یا جانچ کے ہیں۔ لسانی اعتبار سے یہ ایسے لفظ سے نسبت رکھتا ہے جس کے معنی بُننے کے ہیں جس طرح دھاگوں کی مدد سے کوئی نمونہ بُنا جاتا ہے اسی طرح یونانیوں کے نزدیک تاریخ کا مقصد یہ تھا کہ ماضی کی تحقیق کے ذریعہ اہم واقعات کو دھاگوں کی طرح استعمال کر کے ایک داستانی شکل تیار کی جائے۔ اس طرح کی تاریخی شکل کو ادبیات کا حصہ تصور کیا جاتا تھا اور یونانی دیویوں (Muses) میں سے ایک دیوی کلیو (Clio) کو اس کا سرپرست مانا جاتا تھا۔ تقریباً 500 قبل مسیح میں جو ہمارے ملک میں گوتم بدھ کا زمانہ تھا، ہیروڈوٹس (Herodotus) نامی ایک یونانی نے چند ممالک کی سیر کر کے وہاں کے حالات کو داستانی شکل میں قلم بند کیا۔ اسی لیے ہیروڈوٹس کو داستانی تاریخ کا بانی کہا جاتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی یہ کوشش بہت مقبول ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تھائی سی ڈائڈس (Thycididus) نے نصیحت آمیز تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ اس نے تاریخی واقعات کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں اس طرح ترتیب دیا کہ اس زمانے کے سیاسی حالات سے ان کا رشتہ قائم ہوسکے۔ تھائی سی ڈائڈس کا خیال تھا کہ تاریخ کی یہ شکل سیاست کا درس دینے میں مفید ثابت ہوگی۔

تاریخ نویسی کے ان دونوں پیش رووں کو نہ صرف اپنے زمانے میں مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ ان کی تقلید میں اسی نوع کی تاریخیں لکھنے کا سلسلہ برابر قائم رہا۔

فنی اعتبار سے موجودہ علمی (اکیڈیمک) تاریخ نویسی کی داغ بیل انیسویں صدی کے آغاز میں جرمن مورخین لیو

پولڈوان رینکے (Leopoldvon Ranke) اورنیبر (Neiber) نے ڈالی۔ پھران کے بعد آنے والوں نے رینکے اورنیبر کے اپنائے گئے اصولوں کوفروغ دیا۔ رینکے نے تاریخی واقعات کے انتخاب وترتیب میں صحت وصداقت پر زور دیا اوران کے بیانات میں ایسا معروضی طریقہ اختیار کیا جس میں اپنی پسند یا ناپسند، ذاتی رائے اور تاثرات کومطلق دخل نہ تھا۔ اس کا موقف تھا کہ اگرتاریخ کوئی معنی رکھتی ہے تو اس کا سراغ واقعات کی بے لوث اورصبر آزما تحقیق کے ذریعہ صرف ماہرین لگا سکتے ہیں جنھیں تاریخی علمیت کومعروضی طریقہ سے استعمال کرنے کی تربیت ملی ہو معروضیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ صرف انھیں واقعات کو پیش کیا جائے جن کا واقع ہونا دستاویزوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں واقعات کو پیش کرنے میں سختی سے صداقت کا خیال رکھنا تاریخ نویسی کا اعلیٰ ترین اصول ہے۔

تاریخ نویسی کے اس دور معروضیت میں مورخین کا موقف یہ تھا کہ وہ ماضی سے متعلق معلومات حاصل کریں اوراس موادکی چھان بین کرکے اسے تاریخی تسلسل میں ترتیب دیں اوراس کی توجیہ وتشریح کرنے کے بجائے خود تاریخی متن کواپنے اظہار کا موقع فراہم کریں۔ ان کے خیال میں تاریخی ماخذ میں مدفون صداقت اس بات کی منتظر رہتی ہے کہ اسے کھود کر روشنی میں لایا جائے۔ سائنٹفک مورخین کا اگرچہ یہ دعویٰ تھا کہ انھوں نے تاریخی صداقت کی تلاش کرلی ہے مگر انھوں نے انکسار سے کام لیتے ہوئے صداقت کے تعین میں اپنے ذاتی موقف اوررائے کے اظہار سے احتراز کیا۔ تحقیق کا یہ طریقہ عملی تاریخ کی فکری اساس فراہم کرتا ہے۔

بعد کے دور میں تاریخ کے میدان میں بھی تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ جومسائل سامنے آئے ان کا تجزیہ ہونے لگا اور بحثیں سامنے آئیں کہ تاریخ کا صحیح منصب کیا ہے اوروہ کیسے لکھی جائے۔ انھیں مباحث نے تاریخی تنقید کوجنم دیا اورنشاط ثانیہ کے مورخین نے اس موضوع پر اپنی ذہنی تابنا کی کا مظاہرہ کیا، دراصل تاریخی تنقید کا یہی رچا ہوا شعور تھا جس نے تاریخ کے سائنٹفک تصور کی بنیاد ڈالی جس کے تحت تاریخی واقعات کی اصلیت اورصداقت معلوم کرنے کے لیے تحقیق وجستجو کے سائنسی طریقے کام میں لائے جانے لگے۔

لیکن اس نوع کی تاریخی تخلیقات پر اعتراضات ہونے لگے اور ناقدین نے تھاسی ڈائی ڈس اورمشہور مورخ گبن کی کوشش کوپھر سے سراہنا شروع کیا۔ انھوں نے اس موقف سے ہی انکار کیا کہ تاریخ کے سائنسی تصور میں کوئی صحت کا پہلو بھی ہے اور ایسی تمام کوشش کی مذمت کی جس کے ذریعہ معروضی طرزفکر اورسائنسی استدلال کی آڑ لے کر تاریخ کی اخلاقی قوت اورقدر و قیمت کوڈھایا جائے۔

سائنسی طرز پر مرتب کی گئی تاریخوں پر ایک نقطہ نظر سے اعتراض ہونے لگا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نوع کی تاریخی تصانیف نے تحقیق اورگہرے مطالعے کے ذریعہ قابل قدر اورگراں مایہ تاریخی موادفراہم کردیا ہے جس کی مدد سے انسان کی ہمہ جہت توسیع و ترقی کے مطالعے اور جانچ کے نئے راستے اورگوشے کھل گئے ہیں، مگران تاریخوں میں بالعموم واقعات ومظاہر پرانفرادی حیثیت سے روشنی ڈالی گئی ہے اورکوئی ایسی منظم اورمسلمہ کوشش نہیں کی گئی کہ دیگر علوم کی طرح تاریخی مواد پراجتماعی نظر ڈال کر یہ معلوم کیا جائے کہ مختلف واقعات، حادثات اورمظاہر کس طرح ایک دوسرے سے منسلک اوروابستہ ہیں۔

اس طویل بحث کے پس منظر میں تاریخ کی آسان ترین تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ ماضی میں جوکچھ واقع ہو چکا ہے تاریخ

اس کی کہانی ہے۔اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ کے اوراق کو دہرانے کا مطلب ماضی کے اوراق کا دہرانا ہے۔اس اعتبار سے تاریخ کو ڈاکٹر رادھا کرشنن کے الفاظ میں قوم کا حافظ کہا جاسکتا ہے لیکن یہ تعریف تاریخ کو اس کے لغوی معنی سے آگے نہیں لے جاتی۔عصر حاضر کے دیو قامت مورخ ارنالڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) نے تاریخ کی جو تعریف کی ہے وہ زیادہ معنی خیز ہے''حرکت پذیر انسانی معاملات کی تحقیق کا نام تاریخ ہے۔'' تاریخ کی اس مجمل تعریف کو قدرے تفصیل کے ساتھ سر لیوس نیمیر (Sir Lewis Namier) کے الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے''تاریخ کا موضوع ہے انسانی معاملات، مصروف کار انسان، واقعہ شدہ باتیں، ان کے واقع ہونے کا انداز وطریقہ، زماں ومکاں پر ثبت ٹھوس واقعات اور وہ واقعات جس طرح انسانی خیالات اور جذبات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اسی بات کو اس طرح بھی پیش کیا گیا ہے کہ عمل اور ذہانت کے ذریعہ انسانی فطرت کے انکشاف کا نام تاریخ ہے۔اسی طرح یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ تاریخ خیالات کی ترقی اور تسلسل واقعات کی روداد ہے۔

تاریخ کے سماجی پہلو پر یہ زور صرف جدید مورخین تک محدود نہیں ہے۔مشہور عرب مورخ ابن خلدون نے 600 برس پہلے تاریخ کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ تاریخ انسانی معاشرہ یا عالمی تہذیب اور اس میں رونما ہونے والے تغیرات کی دستاویز ہے۔مثلاً غلامی، صحت پسندی، جماعتی اتحاد عمل، انقلابات، انسانوں کے ایک گروہ کی دوسرے گروہ کے خلاف بغاوتیں جس کے نتیجہ میں مختلف درجہ کی بادشاہوں اور ممالک کا وجود میں آنا اور انسانوں کے مختلف مشاغل اور پیشے خواہ وہ اپنی روزی کمانے کے لیے ہوں یا علوم وفنون سے متعلق۔ معاشرہ کی یہ تبدیلیاں انسانی فطرت کا تقاضا ہیں۔ میری۔ ایس۔ بارنس (M.S. Barnes) کے الفاظ میں تاریخ سے متعلق اس تفصیلی بحث کا خلاصہ یوں پیش کیا کا جاسکتا''وہ علم جسے ہم تاریخ کہتے ہیں، علت و معلول کے شعور، سماجی اکائی کے ادراک، احساس وقت اور سچے ریکارڈ کی افادیت پر مبنی ہے۔''

تاریخ صرف اقوام وملل کے عروج وزوال، جنگ وصلح، حملہ وپسپائی، فتح وشکست، تعمیر وتخریب، شہسواروں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز، شمشیر دسناں کی جھنکار، توپوں کی گھن گرج، عہد شجاعت کے کارناموں، مظلوم وفاقہ زدہ انسانوں کی آہ وبکا اور سیل وقت کی تاریک وادیوں میں تہذیب کے ابھرے ہوئے نقوش تک محدود نہیں ہے۔ یہ اپنی معنوی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے ہمارے پورے ماضی پر محیط ہے۔ چوں کہ کائنات وحیات کی ہر شے تاریخ کا موضوع ہے اور وہ زماں ومکاں کے حصار سے آزاد ہے اس لیے تاریخی مطالعہ کا نقطہ آغاز ابتدائے آفرینش اور دائرہ لامحدود ہے۔

سماجی ارتقا اور تہذیب وتمدن کی نشوونما کا جائزہ لینے کے علاوہ تاریخی مطالعہ کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اس سے فکر ونظر کے نئے دریچے کھلتے ہیں جن کی روشنی میں ماضی کے متنوع اور نئے نئے گوشے برابر سامنے آتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا لامحدود مطالعہ انسانی اختیار وامکان سے باہر ہے اسی لیے علمائے تاریخ نے نہ صرف مطالعہ کے اصول وضوابط وضع کیے بلکہ اپنے لیے مطالعہ کے میدان بھی متعین ومختص کیے ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کی انقلاب آفریں رفتار اور ترقی نے تاریخ کو نیا موڑ دیا ہے۔ تحقیق و انکشاف کے نئے امکانات روشن کیے ہیں جن کے نتیجہ میں مخصوص مطالعہ (Specialisation) کے رجحان نے نیا فروغ پایا ہے اور دوسرے علوم وفنون کی طرح تاریخ میں بھی نئی نئی شاخیں نکالی گئی ہیں۔

چوں کہ حال کو ماضی سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس لیے ہر علم و فن کے مطالعہ میں تاریخی پس منظر کی ایک کلیدی حیثیت ہوگئی۔ اس لیے علم کی حیثیت سے تاریخ کا مطالعہ ہمہ گیر ہے۔ فلسفی، مفکر، دانش ور، مذہبی پیشوا، سیاست داں، عالم، ادیب، ماہر لسانیات، سائنس داں، نقاد اور فن کار اپنے موضوع اور مقاصد کی رعایت اور ضرورت کے لحاظ سے اپنے خاص مطالعہ میں تاریخ کی مدد لیتے ہیں۔ جس سے انھیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ان کا مضمون فلسفہ اور تخیل کی کن جولان گاہوں اور ارتقا کی کن منزلوں سے گزرا ہے۔ اس کی نشو و نما کی کیا سمتیں اور رفتار رہی ہے۔ تحقیق و جستجو کی ذہنی اور مادی جد و جہد میں کیا دشواریاں پیش آئی ہیں، انھیں کیسے دور کیا گیا ہے۔ ان باتوں کا علم حال کے درپیش مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے اور مستقبل کے امکانات کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے۔

تاریخ کا مطالعہ اپنی واقفیت اور علمیت میں اضافہ کی غرض سے بھی کیا جاتا ہے۔ یہ مطالعہ ہمیں بیک وقت تمام ممالک اور تمام گزشتہ صدیوں کا ہم عصر بنا دیتا ہے۔ اس سے پائدار انسانی اقدار کا علم ہوتا ہے۔ وسیع المشربی اور انسان دوستی کے جذبات فروغ پاتے ہیں جو معاشرہ کے امن و استحکام میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یہاں کے علما، مفکرین اور فن کاروں نے مختلف علوم و فنون مثلاً فلسفہ، حکمت، ریاضی، علم نجوم، سیاسیات، اقتصادیات، مصوری سنگ تراشی، رقص، موسیقی اور صنعت و حرفت کے میدانوں میں فکر و نظر کی حیرت انگیز جولانیاں دکھائیں اور عالمی تہذیب کے سرمایہ میں گہراں قدر اضافے کیے، مگر فن تاریخ نویسی کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ ہندوستان کی سب سے پہلی تاریخی کتاب ''راج ترنگنی'' ہے جو کشمیر کی بارہویں صدی کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اس کا مصنف ایک کشمیری پنڈت کلہنا تھا مگر اس کے بعد بہ قول مشہور مورخ آر۔ سی مجومدار انیسویں صدی تک کسی غیر مسلم ہندوستانی مورخ نے ہندوستان پر باقاعدہ کوئی تاریخ نہیں لکھی۔

ایف۔ ای۔ کے (F.E. Keay) اور ڈاکٹر اے۔ ایس۔ الٹیکر نے اپنی کتاب میں شروع ویدک زمانے سے اپنشدوں کے دور اور برہمنی تعلیم سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے قدیم ہندوستان کی مشہور درس گاہوں تکشلا، نالندہ، وکرم شلا اور وارانسی وغیرہ میں مروج نصابات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان میں اتھروید اور اپنشدوں کے حوالے سے نغمات حمد، رزمیہ ترانوں، سور ماؤں کی تعریف و توصیف، کتھاؤں اور اتہاس پوران کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اس لٹریچر کو تاریخ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد تیرہویں صدی سے تاریخ نویسی کو فروغ ہوا۔ شاہی درباروں سے وابستہ وقائع نویس اور مورخین کے علاوہ علمائے تاریخ کا ایک لمبا سلسلہ ملتا ہے جنھوں نے اپنی متنوع تصنیفات سے تاریخی ادب بالخصوص عہد وسطی کی عصری تاریخ میں بیش بہا اضافے کیے۔

اپنے وسیع ترین معنی میں تاریخ ہمارے ماضی کا مطالعہ ہے۔ مگر یہ مطالعہ ماضی کے براہ راست مشاہدہ کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی کا علم قدیم حالات اور واقعات و حادثات سے متعلق ایسے نشانات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے جو کبھی اتفاق سے اور کبھی انسان کی دور اندیشی سے محفوظ رہ سکے اور زمانہ کی دست برد سے بھی بچ گئے۔ اس لیے عملی طور پر تاریخی تصورات کی تشکیل میں ان نشانات، ان کے مطالعہ میں استعمال شدہ طریقے اور مطالعہ کے نتائج کو دخل ہے۔ ماضی کے واقعات، حادثات، حالات اور ان کی نشو و نما سے متعلق کسی قسم کے بھی نشانات ہوں وہ سب تاریخی مطالعہ کا مواد فراہم کرتے ہیں۔

تاریخ کا اطلاق چوں کہ عام اصلاح میں تاریخ انسانی پر ہوتا ہے اس لیے مواد کے طور پر تاریخی مطالعہ کے لیے انھیں نشانات کو منتخب کیا جاتا ہے جنھیں انسان نے اپنی زندگی میں روئے زمین پر چھوڑا ہے۔ اس کے خیالات، جذبات، احساسات اور اعمال اور افعال سے وابستہ نشانات علمائے تاریخ کے مطالعہ کے ماخذ ہیں۔ یہ نشانات اتنی متنوع اور متعدد شکلوں میں ملتے ہیں کہ ان کا مکمل احاطہ اور شمار محال اور ان کی قطعی اصناف بندی دشوار ہے۔

تاریخی ماخذ کو موٹے طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1۔ روایات (Traditions)

2۔ باقیات یا آثار (Relics and Remains)

1۔ روایات سے مراد ایسے ماخذ ہیں جن سے یہ شہادت ملتی ہے کہ انسان نے شعوری ارادے سے اپنی بات آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

روایات تین طرح کی ہوسکتی ہیں:

i۔ زبانی روایات یا آثار عبارت ہیں ان باتوں سے جو زبان زد خاص و عام ہوں اور نسلاً بعد نسلاً ہم تک پہنچتی ہوں۔ مثلاً نیم تاریخی کہانیاں، مشاہیر کی داستانیں، عہد شجاعت کے قصے، اقوال، ضرب الامثال اور اشعار وغیرہ۔

ii۔ تحریری یا مطبوعہ روایت مثلاً نجی بیاضیں مکاتیب، کتبات، پرانے قوانین کے حقیقی متن وغیرہ۔

iii۔ متشکل روایات جن میں تصاویر، مجسمے، نقشہ جات اور خاکے وغیرہ شامل کیے جاسکتے ہیں۔

2۔ باقیات سے مراد وہ غیر شعوری آثار یا اشیا ہیں جو وقت اور انسان کی دست برو سے محفوظ رہ کر زبان، ادب، فنی اظہار، صنعت وحرفت کے نمونوں، قوانین اور رسم ورواج کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہیں۔

ماخذ کے مابین امتیاز کا ایک اور بھی طریقہ ہے۔ بنیادی (Primary) اور ماخوذ (Derived) بنیادی ماخذ وہ ہیں جنھیں اصل ماخذ یا کبھی کبھی صرف ماخذ کہا جاتا ہے وہ یا تو بلا واسطہ مادی باقیات کی شکل میں ملتے ہیں جیسے قدیم شہروں کے کھنڈر، قلعے، فصیلیں پل، خندقیں، عمارات، ستون اور دیگر آثار قدیمہ، سکے، اوزار، اسلحے، ظروف، ملبوسات، زیورات، تصاویر اور انسانی باقیات جیسے ممی اس قبیل میں شامل ہے یا ایسے بالواسطہ ماخذ ہیں جو اپنے زمانے کے حالات و واقعات سے متعلق تاثرات وخیالات کا اظہار مختلف شکلوں میں کرتے ہیں مثلاً نجی یادداشتیں، نوشتہ جات، مکاتیب، مشاہدین کی رپورٹیں، قوانین کے متن، فرامین، احکام شاہی، دستاویزات دساتیر، دفاتر کے ریکارڈ، عدالتی فیصلے، صلح نامے، اقرار نامے، سرکاری ہدایات اور کاروباری کاغذات وغیرہ۔ یہ ماخذ مضبوط اور نسبتاً زیادہ معتبر اور پائدار ہوتے ہیں۔ ماخوذ یا منقولہ ماخذ کی حیثیت ثانوی درجہ کی ہوتی ہے یہ کبھی تو اصل ماخذوں سے منقول ہوتے ہیں اور کبھی ان کی شکل نقل در نقل کی ہوتی ہے۔ ایسے ماخذ اصل ماخذ سے جتنے درجے دور اور بالواسطہ ہوتے ہیں اسی نسبت سے ان کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے کیوں کہ نقل کا سلسلہ اکثر حقیقی متن کو مسخ کر دیتا ہے۔

ماضی ہم سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے عام طور پر ماخذ کا اتلاف اسی تناسب سے بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عہد عتیق سے پہلے دھندلا پھر تاریک ہوتا جاتا ہے جسم انسانی کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے، ان کے متفرق اجزا اور دست کاری کے جو قدیم

نمونے روئے زمین کے دورافتادہ مقامات پر کھدائی کے بعد اب تک ملے ہیں اور دوسری باقیات سے ان کے جو روابط ملتے ہیں ان سے تاریخ انسانی کی انتہائی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر روایات جتنی کم یاب ہوتی ہیں ماضی کے بارے میں ہماری معلومات اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کا فقدان ہوجاتا ہے تو اسے زمانہ ماقبل تاریخ کہا جاتا ہے۔

زمانہ ماقبل تاریخ کی مدت کا تعین محال ہے موجودہ اندازے کے مطابق یہ لاکھوں سال پہلے کا ہے۔ تاریخی زمانہ یعنی وہ زمانہ کہ جب سے محفوظ روایات (Recorded Traditions) کی ابتدا ہوتی ہے زمانہ ماقبل تاریخ سے بہت مختصر ہے۔ قدیم ترین روایات کی مدت بہ مشکل چھ سات ہزار سال پہلے کی ہے اور اس زمانہ میں بھی حیات انسان کے اہم ترین خدوخال مبہم اور غیر مربوط شکل میں ملتے ہیں۔

13.4 لسانیات اور تاریخ

لسانیات اور تاریخ میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں علوم تحقیق میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ تاریخی لسانیات تاریخ سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت، تجارتی تعلقات وغیرہ فریقین کی زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی لسانیات بھی تاریخ کو شمع دکھاتی ہے۔ لسانیات کی ایک شاخ لسانی عتقیات (Linguistic Palaeontology) ہے جس میں قدیم زبانوں کی مدد سے قدیم تہذیبوں اور ماقبل تاریخ زمانے کی تاریخ معلوم کی جاتی ہے۔ یہاں علم آثار قدیمہ، تاریخ اور لسانیات ایک ہوجاتے ہیں۔

لسانی عتقیات سے زبانوں کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ایک صدی میں زبان کے ذخیرے میں کتنے فی صدی الفاظ بدل جاتے ہیں۔ دو قرابتدار زبانوں میں الفاظ کے اختلاف کی مقدار دیکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ کب ایک دوسرے سے جدا ہوئیں۔ اس سے ایک لسانی برادری کے ذیلی گروہ کے نقل مکانی کا زمانہ معلوم ہوسکتا ہے۔ یورپ اور ویلز کے جپسیوں کی زبان میں ہندوستانی الفاظ کی افراط اس بات کی شاہد ہے کہ یہ لوگ عہد قدیم میں ہندوستان سے جا کر مغرب میں آباد ہوگئے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور اپنی کتاب ہندوستانی لسانیات میں لکھتے ہیں:

> **"جپسیوں کے آباواجداد پہلی مرتبہ غالباً پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے نکلے اور یہ پہلا قافلہ ایران، ارمینیا اور بازنطینی سلطنت سے گزرتا ہوا یوروپ پہنچا۔ مشرقی یوروپ میں یہ لوگ بارہویں صدی عیسوی میں داخل ہوئے اور پھر وہاں سے مغربی یوروپ کا رخ کیا۔ جپسیوں کا ایک دوسرا گروہ ارمینیا میں ٹھہر گیا جہاں ان کی زبان درمیانی عہد کی ہند آریائی کے بالکل مشابہ رہی مگر ساتھ ہی ارمینی زبان سے متاثر ہوتی رہی۔ ہندوستان کی موجودہ ہند آریائی زبانوں اور جپسی بولیوں میں ماخذ و اشتقاق کے لحاظ سے نہایت قریبی تعلق ہے۔"   (ہندوستانی لسانیات، ص:66)**

تاریخ کا ایک اہم شعبہ آثار قدیمہ ہے جو اپنے آپ میں ایک مستقل شعبہ علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ آثار قدیمہ قدیم زبانوں کے نمونے محفوظ رکھتا ہے اور ماہر لسانیات ان قدیم کتبوں اور تحریروں کو پڑھ کر آثار قدیمہ کے چھپے ہوئے رازوں کو فاش کرتے ہیں۔ لسانی عتقیات میں آ کر علم آثار قدیمہ اور لسانیات ایک ہو جاتے ہیں۔ لسانیات اور بشریات بھی ایک دوسرے کے لیے معاون و مددگار رہوتی ہیں۔ بشریات کا موضوع انسان ہے۔ اس میں ماقبل تاریخ انسان اور موجودہ پس ماندہ انسانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ دونوں کے مطالعے کا ایک شعبہ پچھڑے قبائل کی زبانوں کا تجزیہ کرتا ہے۔

لسانی عتقیات (Linguistic Palaentology) لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے۔ اس کے معنی ہیں قدیم تاریخ کی کھوج کی وہ شاخ جس میں لسانیات سے مدد لی جائے۔ اس طرح یہ علم لسانیات سے زیادہ تاریخ کے حصار میں آتا ہے چوں کہ اس میں لسانیات ایک آلۂ کار اور تاریخ منزل مقصود ہے۔ اس مطالعے کی بنیاد ماہر لسانیات میکس مُلر نے ڈالی اور اصل ہند یوروپی زبان کی مدد سے آریوں کے اصلی وطن کے طے کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں دوسرے علما نے بھی لسانیات کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ لسانیات کی اس شاخ کے مفید اطلاق کے لیے چند دوسرے علوم سے واقفیت رکھنی بھی ضروری ہے۔ ان میں جغرافیہ سب سے اہم ہے اس کے علاوہ آثار قدیمہ، ارضیات اور بشریات (Anthropology) خاص ہیں۔

اس کا طریق کار یہ ہے کہ بازتشکیل اور تقابلی مطالعے کے طریقوں سے کسی زبان کے خاندان کے قدیم ترین الفاظ دریافت کیے جاتے ہیں۔ ان لفظوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیتے ہیں اور ان گروہوں کے مطالعے سے اس زبان کے اصلی وطن کی شناخت اور اس کی خصوصیات معلوم کی جاسکتی ہیں۔ دریاؤں، پہاڑوں، پھولوں، پیڑوں اور جانوروں کے ناموں سے نہ صرف یہ کہ اس زبان کے اصل مقام کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس لسانی گروہ کی مختلف مقامات پر ہجرت اور اس زبان کی مختلف شاخوں کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ مذہبی اور سماجی الفاظ سے اس قوم کے عقائد، رسوم اور معاشی حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

قدیم ترین الفاظ کا تعین کرتے وقت ذیل کے امر کا خیال رکھنا چاہیے۔

1۔ جس خاندان کے اصل روپ کی تشکیل کرنی ہو اس کی موجودہ زبانوں کے علاوہ پرانی شاخوں کے الفاظ بھی سامنے رکھنے چاہئیں مثلاً ہندحتی کے لیے حتی اور طخاری الفاظ کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ ہر قدیم لفظ قابل غور ہے۔

2۔ ایک لفظ قریبی شاخوں میں ملے تو یہ ضروری نہیں کہ یہ اصل زبان کا ہے لیکن اگر ایک لفظ دور کی شاخوں میں ملے اور اتنے قدیم زمانے میں ملے کہ ان دو شاخوں میں کوئی معاصرانہ ارتباط ممکن نہ تھا تو قوی امکان ہے کہ وہ اصل زبان کا ترکہ ہے مثلاً اگر کوئی لفظ سنسکرت اور آئیر لینڈ کی کلٹی زبان میں مشترک ہو تو خاصا امکان ہے کہ وہ قدیمی ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں ہر قسم کی احتیاط کی ضرورت ہے۔

3۔ دو زبانوں یا شاخوں میں ایک لفظ ملے لیکن صوت یا معنی میں سے کسی ایک میں اختلاف ہو تو اسے فوراً نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ صوتی اختلاف کی تاویل اگر صوتی قوانین سے ہو سکے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے ہم اتفاق جزوی مماثلت قرار دے کر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ معنی کے اختلاف کی جانب غیر لسانی علوم سے رہنمائی ہوگی۔ مثلاً فارسی میں ''مرغ'' کے معنی ہیں پرندہ۔ سنسکرت میں صوتی حیثیت سے اس کے ساتھ کا لفظ ''مرگ'' ہے جس کے معنی ''ہرن'' ہیں۔ اس اختلاف معانی کے

باوجود دونوں لفظ اصلاً ایک ہیں۔اس کے برعکس سو (hundred) اور صوتی اعتبار سے مختلف لیکن معنوی اعتبار سے یکساں ہیں۔ان دونوں کی اصل بھی ایک ہے۔

4۔ اگر ایک لفظ ایک بہت قدیمی شاخ میں ہے لیکن دوسری قدیمی شاخ میں نہیں تو اس کے برمعنی لازماً یہ نہیں کہ وہ سب کی مشترک مورث زبان میں نہ تھا۔تحقیق کر کے ہمیں فیصلہ کرنا چاہیے مثلاً سنسکرت، اوستا اور یونانی میں سے کوئی لفظ صرف ایک میں ملے تو زیادہ امکان تو یہی ہے کہ وہ مقامی پیداوار ہے لیکن تھوڑا سا امکان یہ بھی ہے کہ اصل میں رہا ہو۔ایک قدیم شاخ میں محفوظ رہ گیا بقیہ میں سے جاتا رہا۔

5۔ اگر کسی سلسلے کے کئی الفاظ ملتے ہوں لیکن ایک دو نہ ہوں تو امکان ہے کہ وہ بھی رہے ہوں گے لیکن اب ضائع ہو گئے مثلاً ناک، کان، منہ، آنکھ، ہاتھ وغیرہ کے لیے اگر کسی اصل زبان کے الفاظ کی تشکیل ہو سکے لیکن پاؤں کے معنی کا لفظ برآمد نہ ہو سکے تو گمان غالب یہ ہے کہ لفظ بھی رہا ہوگا لیکن اس تک ہماری رسائی نہ ہوسکی۔

اور قدیم الفاظ کے ملنے کے بعد ان سے نتیجہ اخذ کرتے وقت ذیل کی احتیاط مفید ہوگی:

(الف) ایک قدیم لفظ ملے لیکن اس کے لازمی متعلقات نہ ملیں تو شبہ ہوتا ہے مثلاً ''گھوڑا'' کا لفظ ہو لیکن ''سواری''، ''چال'' وغیرہ کے لفظ نہ ملیں یا ''آگ'' کا لفظ ہو اور ''جلنا'' کا لفظ نہ ہو تو دوسرے علوم کی مدد سے مزید غور کرنا چاہیے۔

(ب) ''پیڑ، پھول، جانوروں، ندیوں، پہاڑوں، موسموں'' وغیرہ کی بنا پر زبان کے بولنے والوں کا اصل وطن طے کرتے وقت غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ارضیات، علم الحیوانات، علم نباتات اور قدیم جغرافیے سے مدد لینی چاہیے۔وقت کے ساتھ ان میں بڑی تبدیلی ہوگئی ہے۔

(ج) تہذیبی اور مذہبی حالات کو دریافت کرتے وقت ان سے متعلق علوم پر بھی نظر رکھنی چاہیے مثلاً ''خدا'' یا دیوتا کے مفہوم کا لفظ اصل زبان میں ملے اور ہم اس سے واحد اور قادر مطلق خدا کا مفہوم نکال لیں تو صحیح نہ ہوگا کیوں کہ بہت قدیم انسان کو نادیدہ قادر مطلق کا تخیل نہیں ہوسکتا۔

مفرد الفاظ کے علاوہ قدیم زبانوں کے پھیلاؤ، علاقے، وجود اور عدم وجود سے بھی بہت سے تاریخی نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔لسانی تحقیقات کے ذریعے قدیم ہند یوروپی زبانوں کا مطالعہ کیا گیا اور آریوں کے قدیم وطن کے بارے میں علما نے کچھ نتیجے نکالے۔ان کی جانب اشارہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔اس ضمن میں پروفیسر عبدالقادر سروری اپنی تصنیف ''زبان اور علم زبان'' میں رقم طراز ہیں:

> **''ہندوستان کے علما کا یہ خیال ہے کہ آریا لوگ ہندوستان کے رہنے والے تھے اور ان کا ابتدائی مقام سرسوتی ندی کے دہانے کے قریب بتایا جاتا ہے۔یہیں سے وہ ہندوستان، ایران اور یوروپ میں پھیل گئے۔لیکن یہ خیال عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ پروفیسر میکس مُلر نے آریوں کا ابتدائی مقام پامیر بتایا تھا۔ ڈاکٹر لیتم نے اسکنڈی نیویا، کچھ جرمن علما نے شمالی جرمنی، ڈاکٹر پی۔گائلز نے ہنگری اور بعض علما نے پولینڈ یا فرات اور**

دجلہ کے بالائی حصص تجویز کیے تھے۔ کسی نے قطب شمالی کا خطہ ان کا وطن ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن آج کل ان نظریوں میں سے کوئی بھی نظریہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ پروفیسر شریڈر نے ہند یوروپی زبانوں کے پودوں، پھولوں اور جانوروں کے ناموں اور ہٹائیت کتبوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آریہ بحرخزر کے شمالی ساحلوں پر والگا ندی کے دہانے کے قریب چراگاہوں میں رہتے بستے تھے۔ یہ لوگ خانہ بدوش زندگی گزارتے اور جانوروں کا شکار اور گلہ بانی ان کا بڑا مشغلہ تھا۔ جیسے جیسے ان کی آبادی بڑھتی گئی کچھ قبیلے اپنے مویشیوں کو لے کر نئی چراگاہوں کی تلاش میں مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کی طرف چلے گئے۔ اس طرح مغرب میں یوروپ کی طرف چل کر وہاں کے اکثر ملکوں میں اور جنوب مشرق کی طرف ایران اور ہندوستان کی سرزمینوں میں آ کر آباد ہونے لگے۔ یہ سب اس قدر قدیم زمانے میں ہوا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے کوئی ذریعے اب موجود نہیں ہیں۔ صرف ان کی زبانوں سے تھوڑی بہت روشنی ان مقامات پر پڑتی ہے۔ جہاں جہاں سے یہ گزرے یا جہاں آباد ہوئے۔''

(زبان اور علم زبان، ص: 187)

آریوں کے وطن کی بحث میں علم لسانیات کی رہنمائی کے سلسلے میں گیان چند لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر سمپورنانند اور بعض دوسرے علما نے ہندوستان کو آریوں کا وطن قرار دیا لیکن لسانیات اس کی تردید کرتی ہے کیوں کہ ہند یوروپی زبانوں کا پھیلاؤ شمالی ہند، افغانستان اور ایران میں ہے اور اس کے بعد سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے لیکن قدیم عہد میں وسط ایشیا اور ترکی میں بھی کچھ ہند یوروپی یا ہندحتی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس کے آگے زبانیں یوروپ میں ملتی ہیں۔ قرین قیاس نہیں کہ اس وسیع و عریض قلم رو کا مرکز ایک پر ہند رہا ہو۔ ہند کے آریائی وطن نہ ہونے کے خلاف سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ ہندوستان کی سب سے قدیم تہذیب آریائی نہیں شمالی ہند کی قدیم ترین تہذیب وادی سندھ کی ہے۔ اس کی زبان اور اس کی تہذیب غیر آریائی ہے۔ پھر سارے ہند میں آریائی زبان نہیں بلکہ آریائی علاقے میں براہوی (بلوچستان) گونڈو وغیرہ دراوڑی زبانیں اور چھوٹا ناگپور میں منڈا زبانیں ملتی ہیں جو ہند آریائی سے کم ترقی یافتہ اور قدیم تر ہیں۔

(عام لسانیات، ص: 596-595)

اس طرح الفاظ کی بنا پر فیصلہ کیا گیا کہ قدیم ہند یوروپی زبانوں میں برف کا بہت ذکر ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسا گرم ملک تو آریاؤں کا وطن ہو ہی نہیں سکتا۔ گائلز نے طے کیا کہ قدیم آریہ گائے، بیل، بھیڑ، گھوڑے، کتے، بھیڑیے، سور، ریچھ، ہرن وغیرہ سے واقف تھے لیکن ہاتھی، گدھے، شیر، چیتے اور اونٹ سے واقف نہ تھے۔ پیڑوں میں وہ ولو (Willow)، برچ (Brich) اور (Beech) سے واقف تھے جن کی بنا پر گائلز نے بلقان کے اوپر آلپس (Alps) کے مغرب میں یعنی ہنگری کے لگ بھگ آریوں کا مرکز طے کیا۔

برانڈے ستائن نے معنیات کی مدد سے فیصلہ کیا کہ آریوں کا مقام یورال کے مشرق میں کرغیز کے میدانوں میں تھا۔ وہاں سے پہلے ایک شاخ ہندایران میں گئی اور بعد میں دوسری شاخ یوروپ میں کیوں کہ ان دونوں شاخوں کے الفاظ کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندایرانی شاخ کے الفاظ زیادہ قدیم ہیں مثلاً پتھر کے معنی میں سنسکرت میں لفظ ''گراون'' ہے جو سوم رس نچوڑنے کے کام آتا تھا۔ قدیم انگریزی میں یہ (Cweorn)، بعد کی انگریزی میں (Quern)، ڈچ میں (Kwern) اور میں (Kvaern) ہے۔ اصل ہند یوروپی میں یہ (Gwer) یا (Gweron) ہے۔ ظاہر ہے کہ سنسکرت لفظ یوروپی الفاظ کے مقابلے میں اصل ماخذ سے زیادہ مماثل اور اس لیے قدیم تر ہے۔ اس قسم کے دوسرے الفاظ سے بھی دونوں شاخوں کی قدامت کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔

13.5 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے دو اہم علوم لسانیات اور تاریخ کے باہمی رشتے کا مطالعہ کیا اور یہ دیکھا کہ دونوں علوم کس طرح اپنے مواد اور معلومات سے ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے لسانیات کا اجمالی تعارف کرایا گیا تا کہ تاریخ سے اس کے ربط و تعلق کا مطالعہ کرتے وقت اس کی تعریف، ماہیت اور احاطہ کار ہمارے ذہن میں رہے۔

لسانیات ایک مستقل علم ہے جس میں لسانی عمل کے مختلف پہلوؤں جیسے اصوات، ان کی تبدیلیوں، زبانوں کی ساخت، ان کی نوعیت، تبدیلیوں کی نوعیت، معنی وغیرہ کی چھان بین کی جاتی ہے اور زبان کی ساخت پر ان کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کی تحقیق اور ہر ایسے واقعے کے اسباب و علل کی عام طور پر چھان بین کی جاتی ہے جو زبان پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ بحیثیت مجموعی لسانیات یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ زبان کی نوعیت کیا ہے؟ خیال اور دوسرے اسی طرح کے مظاہر سے اس کا کیا تعلق ہے، زبانوں میں تبدیلی کے اسباب کیا ہیں؟ اور وہ قطعی عمل کیا ہے؟ جس کی وجہ سے ہم جنس زبانیں گروہوں میں بٹ جاتی ہیں۔ لسانیات کے ذریعے اس بات کی بھی کوشش کی جاتی ہے کہ دو زبانوں کے ہم جنس ہونے یا نہ ہونے کے سوال کو جانچنے کے اصول مدون کیے جائیں۔ علاوہ ازیں لسانیات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس امر کی چھان بین کی جائے کہ اجزائے کلام یعنی اسم، ضمیر، فعل وغیرہ میں فرق کی ابتدا کس طرح ہوئی؟ تصریف کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس طرح کے مسائل کے ساتھ ساتھ اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے مسائل جیسے زبان کا آغاز کس طرح ہوا؟ اور زبان اور نسل میں کیا تعلق ہوتا ہے؟ وغیرہ کی بھی کھوج کی جاتی ہے۔ زبان پر

اچھی طرح قابو حاصل کرنے کے لیے لسانیات سے جو مدد لی جاسکتی ہے، اس کی تشریح اور گمنام زبانوں، پرانے کتبوں اور ان کی تحریروں کی چھان بین بھی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ یہاں آ کر لسانیات کا رشتہ تاریخ سے جڑ جاتا ہے۔

تاریخ کو انگریزی میں History کہتے ہیں۔ اس کی اصل یونانی لفظ Historis ہے جس کے معنی تفتیس اور کھوج (انویسٹی گیشن) کے ذریعہ حاصل شدہ علم کے ہیں۔ تاریخ تحریری دستاویزات میں درج ماضی کے حالات کا مطالعہ ہے۔ تحریری ریکارڈز سے پہلے جو واقعات گزر چکے انھیں ماقبل تاریخ (Pre History) کہا جاتا ہے۔ تاریخ وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے جس میں ماضی کے واقعات اور ان واقعات کی یادداشت، دریافت، جمع کردہ ذخیرہ، تشکیل، پیشکش اور اطلاعات کی تعبیر شامل ہے۔ تاریخ سے مراد ایک خاص شعبہ علم ہے جو گزرے ہوئے واقعات کی ترتیب کی جانچ اور تجزیے کے لیے ایک بیانیہ تشکیل دیتا ہے اور معروضی طور پر ان اسباب ونتائج کا تعین کرتا ہے جن کے تحت یہ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

قدیم اثرات کے سبب تاریخ کی ماہیت کے بارے میں مختلف تصورات ملتے ہیں جو صدیوں سے بدلتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی بدلتے جارہے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے کا جدید انداز نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہے جو کسی مخصوص علاقے کے مطالعے کے علاوہ تاریخی تحقیق کے خاص عناوین یا موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

مورخ اپنے عہد کے سیاق میں لکھتے ہیں اور ماضی کی تعبیر وتشریح میں اپنے دور کے غالب افکار ورجحان کی پابندی کرتے ہیں۔ بعض اوقات اپنے سماج کو درس ونصیحت دینے کے مقصد سے بھی لکھتے ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ تمام تاریخ ہم عصر تاریخ ہے۔ صداقت پر مبنی ماضی کا بیانیے کی تشکیل تاریخ نویسی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ جس میں انسانی نسل سے متعلق گزرے ہوئے واقعات کی بازیافت اور تجزیہ شامل ہوتا ہے۔

لسانیات اور تاریخ میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں علوم تحقیق میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ تاریخی لسانیات تاریخ سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت، تجارتی تعلقات وغیرہ فریقین کی زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی لسانیات بھی تاریخ کو شمع دکھاتی ہے۔ یوروپ اور ویلز کے جپسیوں کی زبان میں ہندوستانی الفاظ کی افراط اس بات کی شاہد ہے کہ یہ لوگ عہد قدیم میں ہندوستان سے جا کر مغرب میں آباد ہو گئے تھے۔

تاریخ کا ایک اہم شعبہ آثار قدیمہ ہے جو اپنے آپ میں ایک مستقل شعبہ علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ آثار قدیمہ قدیم زبانوں کے نمونے محفوظ رکھتا ہے اور ماہر لسانیات ان قدیم کتبوں اور تحریروں کو پڑھ کر آثار قدیمہ کے چھپے ہوئے رازوں کو فاش کرتے ہیں۔ لسانی تحقیقات میں آ کر علم آثار قدیمہ اور لسانیات ایک ہو جاتے ہیں۔ مختلف ملکوں کی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے تاریخ کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جاسکتی ہیں۔ آریاؤں کا اصل وطن کون سا تھا۔ اس سوال جواب قدیم ترین ہند آریائی زبانوں کے بعض الفاظ سے معلوم ہوسکا۔ ماقبل تاریخ دور میں آریہ کس طرح مختلف گروہوں میں مختلف مقامات پر آباد ہوئے۔ وہاں سے کون کون سی شاخیں پھوٹیں یہ سب آریائی زبانوں کے باہمی تعلق اور ان کے شجرے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ لاطینی کا یونانی سے بعد کے دور میں وجود میں آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آریہ پہلے یونان میں بسے اور وہاں سے ایک ٹکڑی اٹلی میں گئی۔ یوروپ کے خانہ بدوش قبائل کی ہندوستانی آمیز زبان اس بات کا اشاریہ ہے کہ ان قبائل کے اجداد کسی زمانے میں ہندوستان سے یوروپ گئے۔

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ لسانیات سے کیا مراد ہے؟ معنی و مفہوم کو بیان کرتے ہوئے تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2۔ تاریخ کی تعریف کیجیے اور اس کی ماہیئت اور تفاعل کی وضاحت کیجیے۔

3۔ تاریخ اور لسانیات کے رشتے پر روشنی ڈالیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ تاریخ کے ماخذ پر روشنی ڈالیے۔

2۔ آریوں کے وطن کے متعلق علما کے اختلاف رائے کا جائزہ لیجیے۔

3۔ لسانیات کی شاخوں کا اجمالی تعارف کرائیے۔

13.7 سفارش کردہ کتابیں

1۔ اردو زبان کی تاریخ : ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

2۔ عام لسانیات : گیان چند جین

3۔ اردو لسانیات : ڈاکٹر شوکت سبزواری

4۔ ہندوستانی لسانیات : ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

5۔ تدریس تاریخ نظریات اصول اور طریقے : خلیل الرب

اکائی 14 لسانیات اور نفسیات

ساخت

14.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو نفسیاتی لسانیات (Psycholinguistics) سے واقف کرانا ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نفسیاتی لسانیات کی تعریف کر سکیں
- زبان سیکھنے کے عمل میں نفسیاتی لسانیات کی اہمیت کی وضاحت کر سکیں اور
- نقص تقریر (Speech disorder) کے اسباب کو سمجھا سکیں۔

14.1 تمہید

ممکن ہے کہ آپ نفسیاتی لسانیات سے بخوبی واقف نہ ہوں لیکن آپ نے زبان سیکھی ہے لہذا آپ ان تمام مراحل سے گزرے ہیں جن کی نشان دہی نفسیاتی لسانیات کرتی ہے۔ آپ نے یقیناً یہ سوچنے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی ہوگی کہ زبان سیکھنے کے عمل میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یا یہ کہ زبان سیکھتے وقت انسان کن مراحل سے گزرتا ہے یا یہ کہ نقص تقریر کے کیا کیا

اسباب ہیں اور وہ کون کون سے نفسیاتی گرہیں ہیں جو نقص تقریر کی وجہ بنتی ہیں یا دوران گفتگو انسان کن نفسیاتی مراحل سے گزرتا ہے۔

اب جب کہ آپ اردو زبان کا مطالعہ کررہے ہیں آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ نفسیاتی لسانیات کے عمومی اصطلاحوں سے واقف ہوں، ان اصطلاحوں کے جاننے اور سمجھنے سے آپ کو اردو زبان کو سمجھنے اور بالخصوص تدریس اردو میں مدد ملے گی۔

14.2 نفسیاتی لسانیات کی تعریف اوراس کا دائرہ عمل

انسان ہزاروں سال سے اپنی ذات اور اردگرد کے ماحول کا مشاہدہ کرتا آرہا ہے اوراس مشاہدے کی وضاحت وتشریح بھی کرتا ہے۔اس سلسلے میں زبان سیکھنے کا عمل اور نا قابل فہم گفتگو بھی اس کی توجہ کا مرکز رہے ہیں ماہرین لسانیات نے ان کی توضیح و تشریح کی بھی کوشش کی ہے۔ان کوششوں کے زیراثر بیسویں صدی میں ان تشریحات کولسانیات کی ایک اہم شاخ نفسیاتی لسانیات کی دست رس میں لایا گیااوراس طرح لسانیات کے اس اہم شاخ نفسیاتی لسانیات کی داغ بیل پڑی۔

نفسیاتی لسانیات کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ زبان کے ''نشوونما'' اور ''نقص گویائی'' پرنفسیات کے اطلاق کا دوسرا نام ہے۔یعنی زبان کی آموزش (Language Learning) اورنقص گویائی (Speech Disorder) نفسیاتی لسانی مطالعے کے اہم موضوعات ہیں۔ان موضوعات کے ساتھ ساتھ نفسیاتی لسانیات قوت فہم (Perception) کا بھی نفسیاتی جائزہ پیش کرتی ہے۔جیسا کہ آپ جانتے ہیں گفتگو میں قوت فہم کوکلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔کوئی بھی گفتگو بات کومکمل طور پر سمجھے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی اور کسی بھی بات کو بخوبی سمجھنے کے لیے قوت فہم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترسیل خیال یا گفتگو میں قوت فہم کوایک خاص اہمیت حاصل ہے۔نفسیاتی لسانیات قوت فہم کا بھی نفسیاتی جائزہ پیش کرتی ہے۔اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نفسیاتی لسانیات میں زبان کی آموزش (Language Learning)، نقص تقریر (Speech Disorder) اورقوت فہم (Perception) اہم موضوعات ہیں۔

اس تمہید کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفسیاتی لسانیات (Psycholinguistics) عمومی نفسیات کے پس منظر میں انسان کے لسانی رویوں (Linguistic Behaviour) کو سمجھنے اوراس کی وضاحت کرنے کی ایک کوشش کا نام ہے۔ نفسیاتی لسانیات کی اس تعریف کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ لسانی رویوں (Linguistic Behaviour) کو بہ خوبی سمجھا جاسکے۔اس تعریف میں لسانی رویے کی اصطلاح ان تمام لسانی اظہار (Linguistic Expression) کے لیے استعمال کی گئی ہے جو انسان دوران گفتگو کرتا رہتا ہے۔اس لسانی اظہار کے پیچھے ذہنی کارکردگی، احساسات وکیفیات اورقوت گویائی کا عمل شامل ہوتا ہے اس طرح لسانی رویے کی اصطلاح ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

14.3 زبان کی آموزش

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ایک بچے کے لیے پیدائش کے وقت سے حیاتیاتی (Biological) اورنفسیاتی

(Psycological) پختگی (Maturity) کی منزل تک پہنچنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ پیدائش کے وقت بچے کی عقل ناپختہ اس کے تاثرات (Responses) غیر ممیّز اوراس کی ترغیبات محض جسمانی ضروریات تک محدود ہوتے ہیں۔اس سے قبل کے وہ پختگی حاصل کرے سماجی طور طریقوں کو اپنائے اور نت نئی حرکتیں سیکھے اسے آموزش (Learning) کے ایک طویل دور سے گزرنا ہوتا ہے۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ بچے کی نشوونما آہستہ آہستہ ایک منظّم صورت اختیار کرلیتی ہے۔ بچے کی نشوونما کا انحصار حیاتیاتی پختگی پر ہوتا ہے۔مثال کے طور پر آپ جذباتی نشوونما کو لیجیے۔سب سے پہلے ایک غیر ترقی یافتہ (Undeveloped) بے چینی کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بے چینی کی پیچیدہ صورتیں یعنی ''غصہ'' اور ''خوف'' پانچ ماہ کی عمر سے پہلے ظاہر نہیں ہوتیں۔ تین ماہ کی عمر میں مسرت (Delight) کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس کی پیچیدہ صورتیں ایک سال بعد نظر آتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ وقت کے ساتھ ساتھ بچے کے غصے کے اظہار میں تدریجی ترقی ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سیکھتا ہے کہ کس بات پر غصہ ہو اور غصے کے اظہار کو کس طرح موثر بنائے۔ وہ یہ بھی سیکھتا ہے کہ کن موقعوں پر غصے کے اظہار کے بجائے غصے کو دبانا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بچے ایک منظّم طریقے سے نشوونما پاتے ہیں۔ حالاں کہ نشوونما میں ایک مخصوص نظم وضبط پایا جاتا ہے تاہم مختلف افراد میں اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ پیدائش کے وقت ہی نومولود بچوں کے طول وعرض میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق بچے کے نشوونما پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کی نشوونما کی رفتار ہر بچے میں مختلف ہوتی ہے۔ بچوں کے نشوونما پر اگر ہم بہ غور نظر ڈالیں تو اسے مختلف ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

چار سے دس مہینے کا بچہ

ایک اوسط درجے کا روایتی بچہ چار مہینے کے عمر میں سہارے کے ساتھ بیٹھنا شروع کرتا ہے۔ سات مہینے کی عمر میں بغیر کسی سہارے کے بیٹھنے لگتا ہے اور دس مہینے کی عمر میں گھٹنوں کے بل رینگنے لگتا ہے۔ یہ درجہ بندی اوسط درجے کی صورت کو پیش کرتے ہیں۔

سماجی تگ ودو میں چھ مہینے کا بچہ دوسروں کے ساتھ شامل ہونے لگتا ہے۔ جس کا اظہار یہ دوسروں کو چھونے، انھیں دیکھ کر غوں غاں کرنے یا کسی بچے کو دیکھ کر خفا ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔

ایک سال سے دو سال کا بچہ

ایک سال کی عمر کا بچہ کھلونوں سے کھیلنا چاہتا ہے اور کھلونوں کے لیے لڑتا ہے۔ اپنے مقابل کو غصے سے دیکھ سکتا ہے اور جسمانی زور آزمائش کرسکتا ہے۔ دو سال کی عمر تک بچوں میں دوسروں کے ساتھ مل کر کھیلنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بچوں کے نشوونما کے ان ادوار کی روشنی میں بچوں کے نشوونما کو مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ذہنی نشوونما

ذہنی نشوونما کی ابتدا پیدائش کے دن سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ بچوں میں سمجھنے

(Perception) کی صلاحیت بڑھتی جاتی ہے اور وہ بہ آسانی چیزوں کے درمیان فرق کرنے لگتا ہے۔

حرکی نشوونما (Kinetic Development)

حرکی نشوونما کی شروعات بھی پہلے دن سے ہی ہو جاتی ہے۔ پیدائش کے دن سے ہی بچہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن چار مہینے کی عمر سے پہلے وہ بیٹھنا نہیں شروع کرتا۔ سات مہینے کے بعد وہ بغیر کسی سہارے کے بیٹھتا ہے اور دس مہینے کی عمر میں گھٹنوں کے بل رینگنا شروع کرتا ہے۔ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حرکی نشوونما کا سیدھا تعلق جسمانی نشوونما سے ہے۔ جیسے جیسے اس کے جسمانی ساخت میں پختگی آتی جاتی ہے اس کے حرکی نشوونما میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

سماجی نشوونما

جیسا کہ آپ جانتے ہیں تین ماہ کی عمر سے بچے کی سماجی نشوونما کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس عمر سے وہ لوگوں کو دیکھ کر مسرت یا خفگی کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح وہ سماج کے طور طریقوں کو سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ چھ مہینے کی عمر تک سماجی تگ و دو کی اس کوشش میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دو سال کی عمر تک دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان تفصیلات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمر کی ہر منزل پر کردار کی تنظیم (Intergration of Personality) میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر منزل میں نئے کردار بھی نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ نشوونما کے اس نقشے میں کافی اتار چڑھاؤ کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہر نئی منزل پہلی منزل کے بہ نسبت زیادہ بلند ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ پختگی کی منزل تک پہنچنے تک جاری رہتا ہے۔

لسانی نشوونما

پیدائش کے وقت بچہ زبان یا اظہار خیال پر قابو نہیں رکھتا اور دوسروں کی توجہ کھینچنے کے لیے رونے کی آواز کا استعمال کرتا ہے۔ گویا رونا اس کے لیے ترسیل خیال کا ایک ذریعہ ہے۔ بچے کی زبانی صلاحیت کے نشوونما کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ماقبل بیان دور (The Period of Pre-Linguistic Development)

ماقبل بیان دور کی ابتدا بچے کی پیدائش کے دن سے ہو جاتی ہے اور تقریباً ایک سال کی عمر تک رہتی ہے کیوں کہ اس دور میں بچہ قوت لسانی کا استعمال نہیں کر پاتا۔ یعنی وہ لفظوں کی ادائیگی نہیں کر سکتا ہے۔ پیدائش کے وقت ''چھینکنے''، ''کھانسنے'' کی آواز کے علاوہ جو آواز بچہ نکال سکتا ہے وہ آواز ''رونے'' کی آواز ہے۔

تین مہینے کی عمر تک بچے میں کوکنے (Cooing) کی آواز نکالنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ''کی'' یا ''کو'' جیسی آواز نکالنے لگتا ہے۔ چھ مہینے کی عمر تک بچہ تکراری آواز (Babbling Sound) نکالنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر چھ مہینے کا بچہ ''بابابابا۔۔۔''، ''دادادادا'' جیسی آوازیں بہ آسانی نکال سکتا ہے۔ نو سے بارہ (9 سے 12) مہینے کی عمر تک اس تکراری آواز میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ اس کی کئی بہتر صورتیں نکالنے لگتا ہے۔ اس عمر میں لسانی نقل کی شروعات ہو جاتی اور وہ اپنے والدین کی آوازوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب والدین اور گھر کے دوسرے لوگ بچوں کے ساتھ ایک مخصوص انداز میں گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مخصوص انداز کو نفسیاتی لسانیات میں Motherese کہتے

ہیں۔ Motherese وہ انداز گفتگو ہے جو عام گفتگو کے انداز سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس میں بچوں کے انداز میں گفتگو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بچوں کی لسانی نشو ونما میں تکراری آوازوں (Babbling Sound) کا دور خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ آوازوں کی تکرار سے بچے اپنے اعضائے تکلم (Vocal Organs) پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے صحیح استعمال کا انداز سیکھتے ہیں۔ اس طرح یہ عمل انھیں آوازوں کی ادائیگی سیکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے کیوں کہ بچے ان آوازوں کی نقل کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ اپنی مادری زبان کی آوازوں کی صحیح ادائیگی کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ ماقبل بیان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور کوکنے (Cooing Period) کا دور ہے اس دور میں بچے ''کی''، ''کو'' جیسی آوازیں نکالنے لگتے ہیں جب کہ دوسرا دور تکرار آواز (Babbling Period) کا دور ہے۔ تکرار آواز کے اس دور میں عام زبان میں ہم غوغاں کا دور بھی کہتے ہیں۔ اس دور میں بچہ ''بابابابا''، ''دادادادا'' جیسی آوازوں کی تکرار کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں لسانی نشو ونما (Linguistic Development) میں تکرار آواز یا ''غوں غاں دور'' کی خاص اہمیت ہے کیوں کہ اس طرح بچہ آوازوں کی صحیح ادائیگی کا طریقہ سیکھتا ہے اور لسانی نشو ونما میں ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔

لسانی دور (The Period of Linguistic Development)

لسانی دور کی ابتدا بالعموم ایک سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے اور لسانی پختگی (Linguistic Maturity) تک جاری رہتی ہے۔ بچوں کے لسانی نشو ونما میں لسانی دور (Linguistic Period) کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

یک لفظی منزل (One Word Stage)

ایک سال سے ڈیڑھ سال کی عمر تک بچے لفظوں کو سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن بولتے وقت وہ صرف ایک لفظ سے ہی کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماہرین نے لسانی نشو ونما کی اس منزل کو ''یک لفظی منزل'' کا نام دیا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس دور میں بچوں کی سمجھنے کی صلاحیت اور بولنے کی صلاحیت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اس عمر کے بچے تقریباً سو لفظ کے معنی کو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان سارے الفاظ کو وہ بول نہیں پاتے ہیں۔ ایک سے ڈیڑھ سال کی عمر تک بچوں کا ایک لفظ ایک جملے کی اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً ''دودھ'' کا مفہوم ''مجھے دودھ چاہیے'' ہے یا پھر ''پانی'' کا مفہوم ''مجھے پانی چاہیے'' ہے۔ اس طرح بچے ایک لفظ کی مدد سے اپنے خیالات کا اظہار کر پاتے ہیں۔

یک لفظی منزل کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ بچے لفظوں کے دائرہ استعمال کو وسیع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بچے کے لیے جو لفظ گیند سے واقف ہے ہر گول چیز گیند ہو سکتی ہے۔ اس طرح وہ گیند اور سنترے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید بچوں کے ذخیرہ الفاظ کا محدود ہونا ہے۔ اپنے محدود ذخیرہ الفاظ کی وجہ سے بچے لفظوں کے دائرہ

استعمال کو وسیع کر دیتے ہیں تا کہ وہ اپنے خیالات کا استعمال کر سکیں۔ اس طرح بچوں کی زبان میں لفظوں کا معنوی دائرہ پھیل جاتا ہے۔

دولفظی منزل (Two-word Stage)

بچوں کے لسانی نشو ونما کی دوسری منزل دولفظی منزل ہوتی ہے۔ ڈیڑھ سال کی عمر کے بعد بچے رفتہ رفتہ دولفظی منزل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ڈیڑھ سال سے دو سال کے بچے خیالات کے اظہار کے لیے عام طور سے دولفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس منزل کو دولفظی منزل (Two-word stage) کہا جاتا ہے۔ اس عمر میں بچوں کا ذخیرہ الفاظ بڑھ جاتا ہے اور وہ دولفظی جملے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ان کے جملوں کی ساخت مندرجہ ذیل دولفظی جملوں کی طرح ہوتی ہے۔

امی دودھ

میں بھوک

بھائی اچھا

ماہرین نے ان دولفظی جملوں کے الفاظ کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے الفاظ کو Pivot Class Words کا نام دیا گیا ہے جب کہ دوسرے لفظ کو Open Class Words کہا جاتا ہے۔ اس طرح ''امی دودھ'' میں امی Pivot Class لفظ ہے جب کہ دودھ Open Class لفظ ہے۔ بچہ اپنے لسانی نشو ونما کی اس منزل پر لفظوں کے درمیان فرق کرنا سیکھ جاتا ہے۔ اس کی نظر میں بعض لفظوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ماہرین نے ان الفاظ کو Pivot Class کا نام دیا ہے۔

چومسکی (Chomsky) اور بعض دوسرے ماہرین نے بچوں کی زبان کے اس قواعد کا مطالعہ Universal Grammar کی روشنی میں کیا ہے جس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ زبان کی ساخت بنیادی طور پر ایک جیسی ہوتی ہے اور بچوں میں زبان سیکھنے کی خداداد صلاحیت اسے بہ آسانی زبان کی قواعد سے آشنا کر دیتی ہے۔

تیسری منزل: تارکی زبان (Telegraphic Speech)

لسانی نشو ونما کی تیسری منزل کو برقی زبان کا نام دیا گیا ہے۔ برقی زبان (Telegraphic Speech) کی اصطلاح زبان کے اس اسلوب کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ Telegram یا تار میں لفظوں کی تعداد کو کم رکھنے کے لیے غیر ضروری الفاظ سے گریز کیا جاتا ہے تا کہ مفہوم کی ادائیگی کم سے کم لفظوں میں ہو سکے۔

لسانی نشو ونما کی تیسری منزل پر بچے کی زبان تار کی زبان سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ یعنی اس عمر میں بچہ دولفظوں جملوں سے آگے بڑھتا ہے اور ایسے جملے استعمال کرنے لگتا ہے جس میں غیر ضروری الفاظ کم سے کم ہوں۔ دوسرے لفظوں میں کم سے کم الفاظ میں بچہ اپنے خیالات کا اظہار شروع کرتا ہے۔ اس کے ذخیرہ الفاظ میں کمی کی وجہ سے جملے قواعد کے اصول پر پورے نہیں اترتے مگر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے اس انداز کو تار کی زبان سے مشابہت دی جاتی ہے۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ بچے کی لسانی نشو ونما کو تین منزلوں (Stages) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بچوں کے لسانی نشو ونما کی یہ تین منزلیں ماقبل بیان دور (The Period of Pre-Linguistic Development) سے مختلف

ہوتی ہیں کیوں کہ اس لسانی دور میں بچہ لفظوں کی ادائیگی سیکھ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم لوگوں نے دیکھا اس دور کی پہلی منزل کو یک لفظی منزل (One word stage) کہتے ہیں اس منزل تک پہنچتے پہنچتے بچہ اپنے خیالات کی ترجمانی ایک لفظ کی مدد سے کرنے لگتا ہے۔ اس دور کی دوسری منزل دولفظی منزل (Two word stage) ہے جہاں بچوں کے لفظی سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ایک لفظ کی جگہ دولفظوں میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ اس دور کی تیسری منزل تک پہنچتے پہنچتے بچوں کی لسانی نشوونما میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور بچہ ایک خاص انداز کی زبان بولنے لگتا ہے جسے عام طور پر تار زبان یا Telegraphic Language کہتے ہیں۔ اس طرح اپنی زندگی کے دس بارہ سال تک پہنچتے پہنچتے بچے میں لسانی پختگی آجاتی ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار معیاری زبان میں کرنے لگتا ہے۔ بچے معیاری زبان کی لسانی پختگی تک پہنچنے میں وقت لیتے ہیں اور ان میں یہ لسانی تبدیلی رفتہ رفتہ ہوتی ہے۔ اس تبدیلی کے دوران بچوں کے سرمائے الفاظ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور بچے نئے نئے لفظ کو سیکھ کر استعمال کرنے لگتے ہیں۔ سرمایہ الفاظ کے سارے الفاظ کے ساتھ ساتھ لسانی ساخت پر بھی اثر پڑتا ہے اور بچے پیچیدہ ساخت کے جملے بولنے لگتے ہیں۔ یہ لسانی تبدیلیاں بچوں کی لسانی پختگی کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ بچوں میں زبان کی نشوونما کا طور تو جسمانی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر بچے میں زبان سیکھنے کی رفتار میں انفرادی فرق پایا جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گھر کے تحریک انگیز (Stimulating) ماحول میں بچے زیادہ تیزی کے ساتھ بولنا سیکھتے ہیں۔ ان کی بہ نسبت گھر کے تناؤ والے ماحول میں بچوں کی زبان کی نشوونما اتنی سرعت کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں دو سال کی عمر میں ذخیرہ الفاظ کا فرق صفر سے لے کر کئی سو الفاظ تک ہوتا ہے۔ ایک تحریک انگیز ماحول (Encouraging) میں بچے کو انعام، ستائش، محبت اور خصوصاً شفقت ملتی ہے اور یہ شفقت بچوں کو معیاری زبان سیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ چھوٹا بچہ اگر کسی کی شفقت کھو بیٹھے تو اس سے اس کی خودداری مجروح ہوتی ہے اور وہ اس شفقت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کی یہ کوشش اسے معیاری زبان سیکھنے کو مجبور کرتی ہے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیکھنے کے عمل میں صلہ یا ستائش کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ستائش کی خواہش بچے کی آموزش یا سیکھنے کی خواہش (Learning desire) کو تیز کر دیتا ہے۔

14.4 اصول آموزش اور طریقہ تعلیم

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان سیکھنے کے عمل میں بچہ (Learning Process) جسمانی نشوونما کے ساتھ بڑی حد تک نفسیاتی عوامل سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیکھنے کا عمل وہ عمل ہے جس کے ذریعے کسی فعل وعمل (Action) کی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی کسی مخصوص صورت حال کا سامنا ہونے پر جو ردعمل پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سیکھنے کے عمل (Learning Process) میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ تبدیلی فرد میں پیدا ہونے والی عارضی کیفیات کے باعث نہ ہو۔ اگر آپ اس تعریف کو غور سے دیکھیں تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس تعریف کے کئی مفہوم ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس تعریف کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ سیکھنے کے عمل کی وجہ سے انسان میں ہونے والی تبدیلی ضروری نہیں ہے کہ پسندیدہ نوعیت کی ہو۔ مثال کے طور پر الفاظ کا غلط استعمال وہ تبدیلی ہے جو پسندیدہ نوعیت کی نہیں ہے۔ اس تبدیلی کی بنا پر بچے کی ستائش

اورتعریف کی خواہش پوری نہیں ہوتی اور بچہ اس ستائش کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے سیکھنے کے عمل سے گریز کرتا ہے اوراس طرح بچے میں الفاظ کا غلط استعمال کم ہو جاتا ہے۔

اس تعریف کی دوسری خاص بات یہ ہے کہ سیکھنے کے عمل سے رونما ہونے والی تبدیلی اکثر باقاعدہ طور پر سیکھنے سے پیدا ہوتی ہے تاہم اس کی زیادہ تر صورتیں بغیر کسی منصوبہ بندی اور رہنمائی کے پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی سیکھنے کا ہر عمل منصوبہ بند (Planned) نہیں ہوتا اوراس عمل میں ضروری نہیں کہ کسی کی رہنمائی شامل ہو۔ بچہ اپنی نشوونما کے دوران بہت نئی ایسی باتیں بھی سیکھتا ہے جوصرف مشاہدہ (Observation) پر مبنی ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ صرف مشاہدے سے بہت سی نئی باتیں سیکھ جاتا ہے۔اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آموزش یاسیکھنے کی عمل میں کسی احساس یا آگہی کا شامل ہونا ضروری نہیں اورمزید یہ کہ سیکھنے کا عمل یا آموزش کو کئی خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ماہرین نے مختلف مطالعوں اور تجربات کی روشنی میں سیکھنے کے عمل یا آموزش کی کئی قسموں کی نشان دہی کی ہے۔آیئے اب ہم ان قسموں پر ایک نظر ڈالیں۔

سیکھنے کے عمل کی قسمیں

جیسا کہ آپ نے دیکھا سیکھنے کے عمل میں فرق کی بنیاد پر ماہرین نے سیکھنے کے عمل کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے۔اس تقسیم کی بنیادی وجہ وہ تجربات (Experiments) ہیں جو ماہرین نے سیکھنے کے عمل کی باریکیوں کو بہ خوبی سمجھنے کے لیے وقتاً فوقتاً کیے ہیں یوں تو یہ تجربات (Experiments) جانوروں پر کیے گئے لیکن ان کی اہمیت انسانوں کے سیکھنے کے عمل پر بھی یکساں طور پر ہوتی ہے۔ سیکھنے کے عمل پر مختلف تجربات کی روشنی میں جو نظریات (Theories) سامنے آئے ہیں انھیں دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔
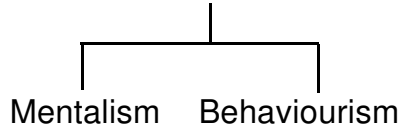
Behaviourism

پہلے خانے میں نظریات کے ان قسموں کو شامل کیا جاتا ہے جن کا تعلق Behaviourist نظریہ فکر سے ہے۔اس نظریہ فکر میں برتاؤ (Behaviour) یا ردعمل (Response) کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ہر تحریک (Stimuli) کسی ردعمل (Response) کا سبب بنتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس نظریہ کو Stimulus-Response نظریہ بھی کہتے ہیں مثال کے طور پر کوئی بچہ کسی کھلونے کو دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو اس عمل میں ''کھلونا'' بچے کے لیے ایک Stimulus ہے اور ہاتھ بڑھانے کا عمل اس کا ردعمل یا Response ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نقطہ فکر میں Stimulus اور Response کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور Stimulus اور Response کی مدد سے دیکھنے کے عمل کو تیز کیا جاتا ہے۔ Behaviourism کے اس نظریہ آموزش (Learning Theories) کو مزید دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(i) Classical Conditioning، (ii) Instrumental Conditioning۔ آیئے اب ہم Classical Conditioning اور Instrumental Conditioning کے اس فرق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

Classical Conditioning

مشہور ماہر نفسیات پاؤلو (pavlov) نے اس قسم کے کلاسیکل کنڈ شننگ کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ اس نظریہ کے تحت کسی فرد یا کسی جانور کے سامنے دو Stimuli پیش کیے جاتے ہیں ان دونوں Stimuli کے درمیان وقفہ بہت کم ہوتا ہے۔ اس تحریک یا Stimulus کے زیر اثر جاندار میں کوئی نہ کوئی ردعمل (Rsponse) ہوتا ہے۔ پیش کیے جانے والے Stimulus میں سے ایک Stimulus Response کی تسکین کے لیے موزوں ثابت ہوتا ہے۔ اس پورے عمل میں پہلے Stimulus کو دوسرے Stimulus کے ساتھ بار بار پیش کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے دوسرا Stimulus بھی وہی ردعمل (Response) پیش کرنے لگتا ہے جو پہلا Stimulus پیش کرتا تھا۔

Pavlov نے یہ تجربہ ایک کتے پر کیا۔ کتا کھانے (First Stimulus) کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگتا ہے۔ رال ٹپکانے کا عمل کتے کا Response ہے۔ Pavlov نے اس تجربہ میں کھانے کے ساتھ ساتھ گھنٹی بجانی (Second Stimulus) شروع کی۔ گھنٹی بجانے کے اس عمل کو Pavlov کچھ عرصہ تک دہراتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد کتا گھنٹی کی آواز پر (Second Stimulus) پر رال ٹپکانے لگا۔ اس طرح کتے نے گھنٹی کی آواز پر رال ٹپکانے کا عمل سیکھ لیا۔ سیکھنے کے اس عمل کے ابتدائی مرحلوں میں کتا کسی بھی گھنٹی کی آواز پر رال ٹپکا سکتا ہے لیکن اگر یہ عمل کچھ عرصہ تک جاری رہے تو Response میں تخصیص پیدا ہو جاتی ہے اور کتا صحیح گھنٹی اور دوسری گھنٹیوں میں فرق کرنا سیکھ لیتا ہے۔

اس پورے تجربے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سیکھنے کے عمل میں Response سے تسکین (Satisfaction) کا ملنا نہایت ضروری ہے مثلاً رال ٹپکانے کا عمل غذا یا کھانے سے وابستہ ہے کتا گھنٹی کی آواز پر رال ٹپکانا اس لیے سیکھ جاتا ہے کہ اس سے اس کو تسکین ملتی ہے۔ اس تجربے سے اگر بار بار گھنٹی بجائی جائے اور غذا نہ پیش کی جائے تو ردعمل یا Response رفتہ رفتہ غائب ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس پورے عمل میں Response کی صورت میں تسکین کا ملنا نہایت ضروری ہے۔ تسکین کے نہیں ملنے کی صورت میں Response ایک قسم کے Frustration میں بدل جاتا ہے جو سیکھنے کے عمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سیکھنے کے عمل میں احساس ناکامی یا Frustration نہایت مضر ثابت ہوتا ہے اور سیکھنے کے عمل میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔ اگر کسی بچے کو شدید نوعیت کی سزا دی جائے یا اس کی ضرورت کی تکمیل نہ کی جائے یا اسے شفقت سے محروم کر دیا جائے تو اس تشویش (Anxiety) اور تشویش کی تمام جسمانی علامتیں (نبض کی رفتار میں اضافہ وغیرہ) پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے بچہ سزا دینے والے والدین کی صورت یا آواز سے گھبرانے لگتا ہے۔ یہ کیفیت سیکھنے کے عمل میں رکاوٹ بنتی ہے لہذا ضروری ہے کہ سیکھنے کے عمل کے وقت گرم جوشی وخلوص کی فضا تیار کی جائے تاکہ سیکھنے والے کے کردار کے خوش گوار اور غیر تشویش والے عناصر کو تقویت مل سکے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ سیکھنے کے عمل کے دوران عصابی تشویش کو غیر تشویش صورت حال میں تبدیل کرنا نہایت ضروری ہے۔

Instrumental Conditioning

سیکھنے کے عمل کی اس قسم میں فرد کو اس وقت تقویت پہنچائی جاتی ہے جب وہ کسی دیے ہوئے Stimulus کے تئیں مطلوبہ ردعمل Response پیش کرتا ہے۔ یہ تقویت کسی بھی طرح کی تعریف یا صلہ (Reward) کی شکل میں سیکھنے والے تک پہنچائی جاتی ہے۔ اس طرح اس Stimulus کی موجودگی میں مطلوبہ Response کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ Instrumental Conditioning کسی حد تک Classical Conditioning سے مختلف ہے کیوں کہ یہاں پر صحیح Response پر انعام دیا جاتا ہے۔ یہ انعام سیکھنے کے عمل کو تیز کرتا ہے۔

Instrumental Conditioning کے ایک تجربے میں چوہے کو کھانے کا ٹکڑا تب ملتا تھا جب وہ مطلوبہ لیور کو دبائے۔ جب یہ عمل دہرایا جاتا رہا تو چوہے نے بہ آسانی لیور کو دبانے کا طریقہ سیکھ لیا۔ اس تجربے کی روشنی میں ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ سیکھنے کے عمل میں صلے (Reward) کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ماہرین کی نظر میں صلہ منفی (Negative) یا مثبت (Positive) ہوسکتا ہے۔ منفی صلہ (Negative Reward) سزا کی وہ صورت ہے جو کسی غلط Response کی صورت میں سیکھنے والے کو پہنچائی جاتی ہے اس طرح کوئی بھی ایسی شے سزا بن سکتی ہے جو متعلقہ فرد یا جانور کے لیے ضرر رساں ہو۔ اس منفی صلہ کی وجہ سے متعلقہ فرد یا جانور یہ سمجھ جاتا ہے کہ اس کا Response مطلوبہ Response نہیں ہے۔ اس کے برعکس مثبت صلہ (Positive Reward) تقویت پہنچانے والے انعام کی صورت میں دیا جاتا ہے مثلاً بچے کو مسکرا کر اس وقت دیکھا جاتا ہے جب وہ کوئی پیاری سی بات کہے اس عمل میں مسکرا کر دیکھا جانا وہ مثبت صلہ (Positive Reward) ہے جو بچے کے مطلوبہ Response (پیاری سی بات کہنا) کی وجہ سے اسے ملتا ہے جب یہ عمل دہرایا جاتا ہے تو سیکھنے والا مطلوبہ Response کی اہمیت کو سمجھ جاتا ہے اور مطلوبہ Response کو دہرانے لگتا ہے۔ Instrumental Conditioning کے لیے چار شرطیں ضروری ہیں۔ یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

i سیکھنے والے میں تحریک (Drive) کی موجودگی جو ردعمل (Response) کو حرکت میں لا سکے۔

ii ایک واضح Stimulus جو بار بار متعلقہ فرد یا جانور کے سامنے پیش کیا جا سکے اور جس سے مطلوبہ Response پیدا ہو سکے۔

iii فرد میں مطلوبہ Response پیش کرنے کی صلاحیت کی موجودگی۔

iv منفی مثبت صلہ جو مطلوبہ Response کی صورت میں سیکھنے والے کو تقویت کی صورت میں دی جاتی ہے۔

اگر ہم بہ غور دیکھیں تو یہ نظریہ آموزش Theory of Learning کلاسیکی Conditioning کی ہی طرح اہم ہے۔ گھریلو ماحول میں سماجی طور طریقے سیکھنے میں بڑی حد تک Instrumental Conditioning کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ صاف ستھرا رہنا، کھانے کے وقت کا انتظار کرنا، فیصلے کرنا، جسمانی جارحیت پر روک لگانا یہ سب تجربے کے ذریعے حاصل ہونے والے کردار ہیں جو Instrumental Conditioning کے رہین منت ہیں۔ ان کے نتیجے میں خاطر خواہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ ان صورتوں میں اگر مطلوبہ Response پیش نہ کیا جائے تو سزا ملتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچہ ناقص عادتوں یا ناقص طور طریقے کو سیکھنے سے گریز کرتا ہے۔

اگر ہم Instrumental Conditioning کی کمیوں پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس نظریہ آموزش میں کچھ کمیاں ہیں۔ مثلاً منفی صلہ Negative Reward کا استعمال بعض اوقات جذباتی بندشیں (Inhibilition) پیدا کر دیتا ہے اور اس سے بچے کی سماجی و جذباتی نشو ونما مسخ ہو سکتی ہے۔

سیکھنے کے عمل میں فرق صلے کی مقدار (Quantity) پر بھی منحصر ہے۔ آموزش کی ہر کوشش کے ساتھ خاصہ اچھا صلہ حاصل ہو یا اس کی مقدار خاصی کثیر ہو تو مطلوبہ Response کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے ذہن نشین ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے معدوم ہونے کی رفتار بہت کم ہو جاتی ہے۔ صلہ اولین (Primary Reward) بھی ہوسکتا ہے اور ثانوی (Secondary Reward) بھی۔ اولین صلہ بنیادی طور پر تشفی بخش ہوتا ہے مثال کے طور پر بھوک کی صورت میں غذا اولین صلہ ہے۔ ثانوی صلہ اس لیے قابل قدر بن جاتا ہے کہ وہ کسی طرح اولین صلہ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دولت، شہرت، عزت، نام نمود ثانوی صلے ہیں۔ کیوں کہ یہ بہت سے اولین صلے سے منسلک ہیں۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آموزش کے لیے مناسب صلے کا استعمال کیا جائے تو یہ آموزش بہ ذریعہ سزا کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتی ہے۔ سزا کے ذریعے کسی ردعمل یا Response کو عارضی طور پر نہیں روکا جاسکتا ہے خصوصاً اس صورت میں جب منفی صلہ یا سزا بہت شدید نہ ہو۔ معمولی درجے کے منفی صلہ یا سزا کے ذریعے جس Response کو روکا جاتا ہے وہ پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ بہت ہلکی سزا کبھی کبھی نئے Response کو سیکھنے اور پھر انھیں دیکھنے کے لیے تقوی بھی بن جاتی ہے۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اگر سزا بہت سخت ہو تو جس Response کے لیے سزا دی گئی ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے Response سے گریز کیا جانے لگے۔ تجربات اور مطالعوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو Response احساس نامرادی کو کم کرتے ہیں ان کو تقویت ملتی ہے اس لیے کہ احساس نامرادی اور احساس ناکامی سے پیدا ہونے والے تناؤ اور تشویش میں کمی ایک خوش گوار صورت حال ہے۔ اس صورت حال کے تحت متعلقہ Response تقویت پاکر عادت بن جاتا ہے۔ یہ عادت ان حالات میں بھی برقرار رہتی ہے جو اولین تقویت پہنچانے والے حالات سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔

Mentalims

دوسرے خانے میں ان نظریات آموزش کو یکجا کیا گیا ہے جن کا تعلق Mentalism کے نظریہ سے ہے۔ زبان اور زبان کی تعلیم کے متعلق جن جدید نظریات نے ذہنوں کو متاثر کیا ہے ان نظریات میں سے ایک اہم نظریہ Mentalism کا نظریہ بھی ہے۔ اس میدان میں نوم چومسکی Behaviourism کے نظریہ کا سخت مخالف ہے چومسکی اور اس کے دوستوں کا ماننا ہے کہ زبان سیکھنے کی صلاحیت انسان میں خداداد ہوتی ہے اور وہ زبان صرف اسی وجہ سے سیکھتا ہے کہ اس میں زبان سیکھنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے چومسکی کلاسیکی Conditioning کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر زبان کے سیکھنے کے عمل میں S---R کی اتنی اہمیت ہے تو بندر یا کسی بھی دوسرے جانور کو زبان سکھائی جاسکتی ہے جب کہ ایسا نہیں ہوتا۔ تمام کوششوں کے باوجود ہم کسی جانور کو زبان نہیں سکھا سکتے۔ یہ خداداد صلاحیت صرف انسانوں میں ہوتی اور جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ گویا چومسکی کا ماننا ہے کہ اس خداداد صلاحیت کی وجہ سے انسان بہ آسانی زبان سیکھ جاتا ہے۔ اپنے نظریہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ انسان کی زبان سیکھنے کی صلاحیت کو Language Acquisition Device کا نام دیتا ہے۔ Language

L A D یا Acquisition Device وہ صلاحیت ہے جو بچوں کے لسانی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔اس کی مزید وضاحت کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچہ جن جملوں کو سنتا ہے ان جملوں سے کہیں زیادہ جملے وہ استعمال کرنے لگتا ہے۔اس کی وجہ اس کے ذہن میں موجود وہ قواعدی اصول ہیں جو اسے نت نئے جملے بولنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔اس کی وضاحت کے لیے ہم مندرجہ ذیل خاکہ کی مدد لے سکتے ہیں:

Input - L.A.D = Output

اس خاکے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بچے کا Output بچے کے لسانی Input سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی بچہ صرف دس جملے سنتا ہے تو وہ صرف ان دس جملوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ جملے استعمال کرنے لگتا ہے .L.A.D جملے تخلیق کرنے کے صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے چومسکی نے تخلیقی قواعد یا Transformational Generative Grammar کا خاکہ پیش کیا۔اس قواعد کی مدد سے انسان کی لسانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ روز نت نئے جملے تخلیق کرنے لگتا ہے۔

چومسکی کی ہی طرح پیاجے (Piaget) اور وگوتسکی (Vygotski) جیسے ماہرین نفسیات نے بھی حصول زبان سے متعلق اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ان کے مطابق حصول زبان ایک ذہنی تعمیر (Mental Construct) ہے۔ان ماہرین کے خیال میں ان نظریات کے اہم نکتے درجے ذیل ہیں:

i اس نظریہ کے مطابق Congitive زمرے میں عدم توازن پیدا ہونے کی وجہ سے حصول زبان کا عمل چلتا ہے۔جس طرح پیاسا پانی کے لیے اور بھوکا کھانے کے لیے بے چین ہوتا ہے اسی طرح انسان حصول زبان کے لیے بے چین رہتا ہے۔

ii اس عمل میں زبردست ذاتی تحریک (Instrumental Motivation) ہوتی ہے جس کی وجہ سے بچے زبان سیکھنے کے عمل میں مصروف رہتے ہیں۔

iii بچہ اپنی ضرورت کے مطابق زبان کو قبول کرتا ہے۔قبول کرنے کا یہ عمل ایک غیر شعوری عمل (Non Conscious Process) ہے۔یعنی بچہ غیر شعوری طور پر زبان سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔

iv زبان ایک نظام (System) ہے۔لہذا زبان کو اس کے نظام کے تحت ہی سیکھا جا سکتا ہے۔

v زبان سیکھنے کے عمل میں (Repetition) کا عمل ضروری اور لازمی عمل نہیں ہے۔

vi زبان سیکھنے کے عمل میں بچہ مشاہدے سے کام لیتا ہے۔

14.4.1 طریقہ تعلیم اور لسانی آموزش

تعلیم ایک ایسا پیچیدہ عمل ہے جس کی ایک ایسی جامع تعریف ممکن ہے جس سے عام لوگ مطمئن ہو سکیں۔مختلف لوگ اپنی اپنے دلچسپیوں کے مطابق اس کا مفہوم سمجھتے ہیں۔اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم کے معنی کتنے متنوع اور گوناگوں ہیں۔ تعلیم محض ایک انفرادی معاملہ نہیں ہے جس کا تعلق صرف فرد کی ذات تک محدود ہو بلکہ اس سے سماجی، معاشی اور سیاسی

مسائل شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کا دائرہ وسیع تر ہے۔ تعلیم کے مخصوص مفہوم پر غور کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ سماج کوئی اٹوٹ اکائی نہیں ہے بلکہ وہ مختلف طبقوں یا گروہوں میں بٹا ہوتا ہے۔ سماج کوئی سا بھی ہو وہاں ایسی بھی چیزیں ہوتی ہیں جو سماج کے مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے باہمی مفادات ٹکراتے ہیں۔ ایک کے فائدے سے دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ جس طبقہ یا گروہ کے ہاتھ میں معاشی اور سیاسی طاقت ہوتی ہے وہی طبقہ سارے سماج پر حاوی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ملک کا نظام تعلیم صرف انھیں اصولوں کی عکاسی کرتا ہے جو طاقتور سماج کے اصول ہوتے ہیں۔

تعلیم کی تعریف خواہ کچھ بھی ہو اس کے مفہوم میں دو چیزیں لازمی طور پر ملتی ہیں۔

(1) مواد تعلیم جسے سیکھا جائے (Teaching Material)

(2) متعلم جس میں سیکھنے کی صلاحیت ہو (Learner)

متعلم (Learner)

جیسا کہ آپ نے پہلے دیکھا تھا انسان میں پیدائشی طور پر بعض امکانی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت ہی وہ سیکھنے اور سمجھنے کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ اس کی یہ کوشش اسے متعلم بناتی ہے۔ اس کوشش میں قدرتی اور سماجی ماحول جس کی اسے ضرورت ہے یا جن میں اس کی دلچسپی ہے اس طرح وہ تعلیم حاصل کرنے لگتا ہے۔ ماہرین نفسیاتی لسانیات کا خیال ہے کہ بچے زندگی کے طور طریقے خود بہ خود ٹھیک اس طرح سیکھ لیتے ہیں جس طرح ایک پرندہ اڑنا یا ایک آبی پرندہ تیرنا سیکھ لیتا ہے۔ مثل مشہور ہے ''مچھلی کے جائے کن تیرائے''۔ خلاصہ یہ کہ بچہ بحیثیت ایک ''متعلم'' کے اپنے فکر و عمل اور ماحول سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی میں استعمال میں لا کر اپنی شخصیت میں رنگ و روپ بھرتا ہے۔ بعض ماہرین نے اسے خود ارادیت سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ماحول مختلف افراد پر مختلف اثرات ڈالتے ہیں۔

مواد تعلیم (Teaching Material)

مواد تعلیم کی اصطلاح ان درسی کتابوں (Teaching Materials) کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو تعلیم کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ تعلیم کی اعلیٰ منزل کے لیے موزوں درسی مواد مہیا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ رسمی تعلیم (Formal Education) میں مواد تعلیم کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور کسی بھی طرح رسمی تعلیم مواد تعلیم (Teaching Material) کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

تعلیم بحیثیت عمل مسلسل

بعض ماہرین نے تعلیم کو عمل مسلسل کا نام دیا ہے پیدائش سے لے کر موت تک تعلیم کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ انسان اپنے تجربے کے ذریعے سیکھتا ہے اور اپنی ضروریات کے مطابق انھیں ڈھالتا ہے۔ اس طرح انسان اور اس کا ماحول دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کوشش سے وہ علم حاصل کرتا ہے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تجربات بجائے خود تعلیمی حیثیت رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ عمل مسلسل کی حیثیت رسمی تعلیم (Formal Education) کے مقابلہ میں وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ تعلیم بحیثیت عمل مسلسل پوری زندگی اور زندگی کی تمام تر سرگرمیاں تعلیم کا حقیقی سرچشمہ ہیں۔ اسی تعلیم میں متعلم خود ایک فعال شریک کار کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے اور دوران تعلیم اپنے تجربوں کو بروئے کار لاتا ہے اور نت نئی صورتوں کا سامنا کرتے وقت نئے تجربے حاصل کرتا ہے۔

14.5 نفسیاتی لسانیات اور تعلیم

نفسیاتی لسانیات کی تحقیقات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ایک ہی عمر کے اور ایک ہی ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کے مابین سیکھنے کی صلاحیت میں قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا بچوں کی تعلیم میں ان باتوں کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ نفسیات کے دو تصورات کا تعلیمی میدان میں عملاً بہت استعمال ہوا ہے۔ ان تصورات میں ''جبلت'' اور ''ذہانت'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ابتدا میں انھیں نا قابل تغیر تصورات سمجھا جاتا تھا شروع میں ایک عام خیال یہ تھا کہ یہ تصورات ہر فرد کو پیدائشی طور پر ورثہ میں ملتے ہیں۔ مثلاً جارحیت کی جبلت کی وجہ سے آدمی لڑنے جھگڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بہر کیف ماہرین تعلیم نے اس سلسلے میں یہ سجھاؤ دیا کہ تعلیمی پروگرام مرتب کرتے وقت ان جبلتوں کا خیال رکھا جائے اور ایسے مشاغل کا اہتمام کیا جائے جن میں ان جبلتوں کے نکاس اور اظہار کا موقعہ ہو مثلاً کھیل، ورزش اور دوسرے جسمانی مشاغل کا اہتمام کیا جائے تاکہ طلبہ کی مذکورہ بالا جبلتیں آسودگی حاصل کر سکیں۔

اسی طرح ذہانت کے لحاظ سے طلبہ کو ''فطین'' سے لے کر ''فاتر العقل'' تک مختلف درجوں میں تقسیم کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ان اقسام میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ نصاب تعلیم ہونا چاہیے۔ مگر جدید نفسیاتی تحقیقات کی روشنی میں ''جبلت'' اور ''ذہانت'' کے تصورات میں خاصی ترمیم ہوگئی ہے۔ اب عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ وراثت اور ماحول فطرت اور تربیت کے درمیان تال میل (Interaction) ہوتا رہتا ہے اور اس طرح فرد کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اس خیال کی روشنی میں فرد کی تعلیم و تربیت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

سیکھنے یا حصول علم کے بارے میں کئی نظریے آپ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ ان نظریوں میں ایک اضافہ گیسٹالٹ (Gestalt) کا ''ہیئت مجموعی'' کا نظریہ ہے۔ گسٹالٹ کے اس نظریے کے مطابق زیر مطالعہ مواد کو بحیثیت ''کل'' پیش کیا جاتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق تمام اجزائے ترکیبی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کے چشمے اور لاٹھی کی تصویر سے ذہن میں گاندھی جی کی تصویر کا ابھر آنا اس کی عمدہ مثال ہے گویا جزو سے زیادہ کل کی اہمیت ہے۔ یہاں منفرد اجزا کے علم کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کے کل کے ادراک کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اجزا کے تعلق باہمی کو بھانپ کر کل کی معنویت کا ادراک حاصل کرنا ''آموزش'' یا سیکھنے کے عمل کی روح ہے۔ اس طریقہ تعلیم سے طالب علم جو کچھ سیکھتا ہے وہ دیرپا اور اس کے لیے معنی خیز ہوتا ہے۔

تعلیم کی منزلیں

متعلم کی ذہنی اور جسمانی پختگی کے پیش نظر تعلیم کی مختلف منزلیں متعین کی گئی ہیں۔ عام طور پر تعلیم کو تین منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہیں (1) ابتدائی تعلیم، (2) ثانوی تعلیم اور (3) اعلیٰ تعلیم۔

(1) ابتدائی تعلیم

اقوام متحدہ نے ابتدائی تعلیم کا حق بطور ایک انسانی حق کے تسلیم کیا ہے۔ مختلف ملک میں اس کی مدت مختلف ہے۔ جو کم سے کم چار سال اور زیادہ سے زیادہ آٹھ سال ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس دوران بچے ان تمام مہارتوں سے لیس ہو جائیں جو ملک کے شہری کے لیے پسندیدہ اور ضروری قرار دیے گئے ہیں۔

ہندستان میں ابتدائی تعلیم چھ سال کی عمر سے چودہ سال کی عمر تک دی جاتی ہے۔ بنیادی قومی تعلیم اس کی ایک شکل ہے۔ اس تعلیم کو بامعنی بنانے کے لیے نصابی مضامین کا رشتہ ہاتھ کے کام یعنی دست کاری اور حرفہ سے جوڑا جاتا ہے۔ دراصل یہ اسکیم گاندھی جی کی رہنمائی میں 1938ء میں منظر عام پر آئی۔ بعد میں ذاکر حسین نے اس اصول تعلیم کو مزید نکھارا اور آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے اسے قومی پالیسی کی حیثیت سے اختیار کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ترمیمیں کی گئیں۔

(2) ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم کے نصاب میں دو مقصد سامنے رکھے جاتے ہیں۔ یہ تعلیم متعلم کی کثیر تعداد کے لیے باضابطہ تعلیم کی آخری منزل ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس دوران اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور ان تمام کاموں میں حصہ لے سکیں جن میں اعلیٰ تکنیکی علم یا تحقیقی مہارت درکار نہیں ہوتی بہر کیف وہ طلبہ جو ثانوی منزل کو اعلیٰ تعلیم کی تیاری کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

(3) اعلیٰ تعلیم

اعلیٰ تعلیم کے میدان میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں سماج کے تمام طبقوں کو یکساں طور پر کیسے فراہم کی جائیں۔ اب تک اعلیٰ تعلیم کم و بیش صرف اعلیٰ طبقوں کا حاصل رہا ہے نچلے طبقے اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ نچلے طبقے کے لوگ اپنی معاشی صورت حال کی وجہ سے اپنے بچوں کو روزگار یا گھریلو مصروفیات میں لگا دیتے ہیں بعض مما لک اور خصوصاً ہندوستان میں اس کی طرف دھیان دیا جا رہا ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نفسیاتی لسانیات میں سیکھنے کے عمل کو آموزش (Learning) کی اصطلاح سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ آموزش کا عمل انسان میں زندگی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ذہنی نشو و نما کے لیے آموزش ضروری ہے کہ کیوں کہ اس کی وجہ سے حسی اور حرکی افعال میں ایک رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ مختصراً آموزش کی مندرجہ ذیل خصوصیات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے:

(1) اصلاح پذیری : آموزش کی وجہ سے انسان کے افعال میں اصلاح ہوتی ہے اور اس میں مختلف افعال کو بہتر طور پر

انجام دینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(2) محرک : آموزش کے لیے کسی نہ کسی محرک (Motives) کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک فرد کو کسی فعال کی افادیت کا احساس نہ ہو تو وہ اس کو سیکھنے کی طرف راغب نہیں ہوتا۔

(3) غایت : آموزش کے لیے کسی نہ کسی غرض وغایت کا ہونا ضروری ہے۔

(4) مطابقت : فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرتی ماحول سے مطابقت پیدا کرے اور یہی وجہ ہے کہ اس عمل کو آسان بنانے کے لیے آموزش کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

14.6 نقص تقریر

نقص تقریر نفسیاتی لسانیات (Psycholinguistics) کا ایک دوسرا اہم موضوع مطالعہ ہے۔ نفسیاتی لسانیات میں نقص تقریر کے لیے مختلف اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاحات ایک دوسرے کے مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن کچھ اصطلاحات ایسی بھی ہیں جو نقص تقریر کے مختلف پہلوؤں پر زور دیتی ہیں اور اپنے معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر فتور گوئی (Aphasia) نقص قوت تحریر (Dysgraphia) یا نقص تقریر (Dyslogia) اپنے معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نقص تقریر کی ان تمام اصطلاحات کو بڑی ہوشیاری سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ نفسیاتی لسانیات کے اس مطالعے کا مقصد لسانی اختلال (Linguistic Disorder) کے ان پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ہے جن کو طبی (Clinical) بیماریوں سے وابستہ کیا جاسکے اور بولنے کی صلاحیت اور ذہنی اختلال میں جو عمل شامل ہوتے ہیں ان کے درمیان ایک وسیع تعلق قائم کیا جاسکے۔ اس طرح ''نقص تقریر'' کی اصطلاح ہر قسم کے لسانی اختلال کے لیے استعمال ہوتی ہے خواہ اس کی وجہ عضویاتی ہو یا نفسیاتی۔

نقص تقریر (Speech Disorder) میں تحریر و گویائی دونوں طرح کے نقص شامل ہیں۔ لسانی طور پر مختلف افراد میں زبانی کا مواد اور طریقہ دونوں بگڑی ہوئی صورت میں پائے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تتلانا، ہکلانا، نارمل افراد کی بہ نسبت اعصابی مریضوں میں زیادہ عام ہے۔ گونگا پن یعنی بولنے کی صلاحیت کا مکمل فقدان، بولنے سے مکمل انکار، جنون کچھ شکلوں مثلاً اضمحال اور انتشار نفس میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس کیفیت ان مریضوں میں ملتی ہے جو بیش گوئی کے شکار ہوتے ہیں۔ اس نقص تقریر میں مریض ضرورت سے زیادہ بولتا ہے لیکن اس کی گفتگو اکثر بے ربط اور بے معنی ہوتی ہے۔ اس مرض کی بنیادی وجہ ہیجانی مسرت یا خیالات کی اڑان میں اضافہ ہے۔ خیالات کی اڑان میں اضافے کی وجہ سے مریض بیش گوئی کا شکار ہو جاتا ہے۔ نقص تقریر کی کئی اور دوسری شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مریض کا نئے اجنبی لفظ گڑھنا (Nelogism) یا ایک ہی جملے یا لفظ کی مسلسل تکرار اس کی چند دوسری قسمیں ہیں۔ اسی طرح جو کچھ کہا جائے اسے صدائے بازگشت (Echo) کی طرح دہرانا یا مختلف الفاظ کو ملانا بھی نقص تقریر میں شامل ہوتا ہے نقص تقریر کی بعض اہم قسمیں مندرجہ ذیل ہیں۔

فتورگویائی(Aphasia)

دماغ کے ایسے حصے پر جس کا تعلق تکلم ہے ضرر پہنچنے سے کسی فرد کے بولنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر فالج کے اثر سے یا دماغ کی کوئی رگ پھٹ جانے سے رقبہ تکلم متاثر ہوتا ہے۔ نفسیاتی لسانیات میں اس نقص تقریر کو فتور گویائی (Aphasia) کہتے ہیں۔ فتور گویائی یعنی Aphasia کی کئی ذیلی شکلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی فرد میں حبل صوتی میں خرابی آجانے کی وجہ سے جب قوت گویائی چلی جاتی ہے تو اسے انگریزی میں Aphonia کہتے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے فقدان صوت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح رقبہ تکلم پر ضرر کی وجہ سے اگر کوئی مریض الگ الگ لفظ تو بول سکے مگر ان کو ملا کر ایک جملے کی شکل میں ادا نہ کر سکے تو اسے Aphrasia کہا جاتا ہے اور اسی طرح اگر الفاظ کی ادائیگی کی صلاحیت بھی جاتی رہے تو اس کیفیت کے لیے Aphtongia کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

نقص قوت تحریر(Dysgraphia)

اس مرض میں دماغ کے کسی حصے کے مجروح ہو جانے یا اس میں کوئی نقص پیدا ہو جانے کی وجہ سے انسان میں الفاظ کو ترتیب سے لکھنے کی صلاحیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اس مرض کے لیے Dysgraphia کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

نقص نطق(Dyslalia)

یہ اصطلاح اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب کسی میں بولنے یا صحیح طریقے سے بولنے کی صلاحیت معدوم ہو جاتی ہے۔ انسان بولنے کی صلاحیت دوسروں کو سن کر حاصل کرتا ہے۔ لیکن سمعی قوت کے ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ بولنا سیکھ نہیں پاتا۔ اگر بہ غور دیکھیں تو نقص سمعی بعض معنوں میں نقص تکلم (Dysencia) سے مختلف ہے۔ کیوں کہ Dysencia میں دماغ کے کسی حصے کے مجروح ہو جانے کی وجہ سے بولنے کی صلاحیت معدوم ہو جاتی ہے۔

سمعی فتور شناخت(Audiotry Agnosia)

یہ ایک مرض ہے۔ اس مرض میں مبتلا افراد آوازوں کی شناخت کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ یعنی ان کے لیے آوازوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا اور وہ آوازوں کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔

14.7 خلاصہ

لسانیات کا نفسیات سے بھی خاص ربط پایا جاتا ہے جس کا تعلق زبان کے سیکھنے کے عمل سے ہے۔ اس رشتے کو نفسیاتی لسانیات (Psycho Linguistics) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نفسیات اور لسانیات کا درمیانی علم ہے۔ نفسیاتی لسانیات میں زبان کے عمل کے نفسیاتی پہلو پر تفصیل سے غور کیا جاتا ہے جس میں زبان کی آموزش (Language Learning) اور نقص گویائی (Aphasia) اہم ہیں۔

اس اکائی میں ہم نے زبان کی آموزش کے ضمن میں یہ دیکھا کہ بچوں میں جسمانی اور ذہنی نشو ونما عمر کے کس مرحلے میں کس سطح کی ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ہم نے بچے کی حرکی نشو ونما، سماجی نشو ونما اور لسانی نشو ونما کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں ۔لسانی نشو ونما کے سلسلے میں یہ دیکھا کہ بچہ عمر کی کس منزل میں ایک لفظ، دو لفظ اور ادھورے فقروں کے ذریعہ اظہار مطلب کرتا ہے۔سیکھنے کے عمل کی مختلف قسموں (Behaviourism) اور (Mentalism) اور ان کی مختلف مسائل سے واقفیت حاصل کی۔طریقہ تعلیم اور لسانی آموزش و نیز متعلم اور مواد تعلیم کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور تعلیم کی مختلف سطحوں، ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ پر نفسیاتی لسانیات کے اطلاق کا مطالعہ کیا اور فتور گویائی اور اس کی مختلف قسموں نقص تحریر، نقص نطق اور سمعی فتور شناخت کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

14.8 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ بچے میں زبان کی آموزش کی مختلف منزلوں کی وضاحت کیجیے۔

2۔ سیکھنے کے عمل کی مختلف قسموں پر روشنی ڈالیے۔

3۔ نفسیاتی لسانیات کی تعریف بیان کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ فتور گویائی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

2۔ نفسیاتی لسانیات اور تعلیم کے رشتے کی وضاحت کیجیے۔

3۔ اصول آموزش اور طریقہ تعلیم پر مختصراً بحث کیجیے۔

14.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ گیان چند جین : عام لسانیات

اکائی 15 لسانیات اور کمپیوٹر سائنس

ساخت

15.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو یہ بتایا جائے کہ زبان کے مطالعے میں کمپیوٹر بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کم وقت اور کم محنت کے ساتھ مطالعہ زبان کے لیے یہ بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- کمپیوٹر اور مطالعہ زبان کی وضاحت کر سکیں اور
- زبان کے مطالعے میں کمپیوٹر کے استعمال پر روشنی ڈال سکیں۔

15.1 تمہید

آپ یہ جانتے ہیں کہ لسانیات زبان کے سائنسی مطالعے کا علم ہے۔ توضیحی لسانیات زبان کی مختلف سطحوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ زبان کی پہلی سطح جس میں زبان کی تخالفی اور امتیازی آوازوں کی اکائیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے فونیمیات کہلاتی ہے۔ زبان کی سب سے چھوٹی اکائی کو فونیم کہتے ہیں۔ فونیم کیسے یکجا ہو کر لفظ کی تشکیل کرتے اس مطالعے کو مارفولوجی کہتے ہیں۔ تیسری سطح میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ الفاظ جملوں کی تشکیل کیسے کرتے ہیں، اسے زبان کا نحوی مطالعہ کہتے ہیں۔ الفاظ اور جملے معنی کی ترسیل

کیسے کرتے ہیں، اس کا مطالعہ معنیات کرتی ہے۔ زبان کے توضیحی مطالعے کا اطلاق ہم اسلوبیات، تدریس زبان، ترجمہ نگاری اور لغت نویسی میں کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں کمپیوٹر مطالعہ زبان کی مشق میں بہت کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔ اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کمپیوٹر مطالعہ زبان میں کس قدر کام آتا ہے۔

15.2 کمپیوٹیشنل لسانیات

کمپیوٹیشنل لسانیات، لسانیات کی ایک ذیلی شاخ ہے جس میں زبان کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ کے لیے کمپیوٹر سے مدد لی جاتی ہے۔ کمپیوٹیشنل متن (Computational Corpus) جو مشین کے پڑھنے کی شکل (Machine Readable form) میں کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل تجزیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کارآمد ثابت ہوتا ہے:

(i) کمپیوٹیشنل تعمیر متن

کمپیوٹیشنل متن ایک ایسے متن کی تعمیر کرتا ہے جسے زبان کا نمونہ کہا جاسکتا ہے، جس میں مختلف علوم کے متن کے نمونے کو مختلف فائلوں (Files) میں یکجا کیا جاتا ہے۔ زبانی زبان (Spoken language) بھی کمپیوٹیشنل متن کا حصہ ہوتی ہے۔ انگریزی میں British National Corpus (BNC)، 100 لاکھ الفاظ پر مشتمل کمپیوٹیشنل متن ہے جس کے 4124 حصے زبانی زبان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ باقی حصوں میں مختلف علوم سے مختلف متن کو یکجا کیا گیا ہے۔

(ii) الفاظ کا صرفی ونحوی تجزیہ

کمپیوٹیشنل متن کے الفاظ خودکار ترکیب صرفی (Automatic Grammatical Tagging) کی مدد سے اپنے اجزائے کلام (Parts of Speech) کی وضاحت کرنے لگتے ہیں۔ جافری لیچ نے Constituent Livelihood Automatic Word-tagging System (Claws) کے ذریعہ انگریزی زبان کے صرفی مطالعہ کو آسان کردیا ہے۔

(iii) الفاظ شماری

کمپیوٹیشنل متن سے الفاظ کے تواتر کی تفصیل، الفاظ شماری کے ذریعہ پیش کی جاتی ہے۔ الفاظ کے تواتر کی تفصیل تعداد کے لحاظ سے اوپر چڑھتی (Ascending) اور نیچے گرتی (descending) ہوئی ترتیب آسانی کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے۔ الفاظ کی ترتیب حروف تہجی (Alphabetical Order) کے مطابق بھی پیش کی جاتی ہے۔ کمپیوٹیشنل مواد کے کچھ حصے کی یا پورے متن کے الفاظ کی ترتیب تعداد کے لحاظ سے یا حروف تہجی کی ترتیب (Dictionary Order) کے مطابق کی جاسکتی ہے۔

(iv) الفاظ کا سیاق (Concordance)

الفاظ کے سیاق وسباق کے ذریعہ کسی متن میں کوئی ایک لفظ کن کن سیاق وسباق میں استعمال ہوا ہے اس کی مکمل تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔ انگریزی زبان کے مطالعے کے لیے Key word-in-contex (Kwic) کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس سافٹ ویر کے ذریعے چارلس ڈیکن کے ایک ناول 'A tale of two cities' میں ''غریب'' لفظ کا استعمال کن سیاق وسباق ہوا ہے اس کی تصویر کچھ اس طرح ہوگی:

taste it is that such	Poor	cattle always have in their mouths
of sparing the	Poor	child the inheritance of any part of
small property of my	Poor	father, whom I never saw-so long
desoate, while your	Poor	heart pined away, weep for it
Miss, if the	Poor	Lady had suffered si intensely
the love of my	Poor	mother hid his torture from me
stockings, and all his	Poor	tatters of clothes, had, in a long
faded away into a	Poor	weak stain. So sunken and
on yur way to the	Poor	wronged gentleman, and, with a
detachment from the	Poor	young Lady, by Lying a brawny hand

اس سافٹ ویر کی مدد سے انگریزی میں کئی مصنفوں کی لفظیات کا کنکارڈینس تیار ہو چکا ہے، ان میں شیکسپیر کی کنکارڈینس بہت مشہور ہے۔

(v) الفاظ کا جال (Word Net)

جارج میلر الفاظ کے جال کے بانی ہیں، الفاظ کا جال لفظوں کو ان کے معنیاتی عمودی درجہ بندی (Semantic Hierarchies) کے حوالے سے پیش کرتا ہے۔ الفاظ کے جال میں مختلف الفاظ کے رشتوں کی وضاحت ملتی ہے مثلاً مترادفات (Synonyms)، Hypernyms، Holonyms، Meronyms، متضاد (Antonyms) وغیرہ۔

کمپیوٹیشنل متن کا استعمال اب زبان کے صرفی، نحوی ومعنیاتی مطالعے میں کارآمد ثابت ہو رہا ہے، اس کے علاوہ تاریخی لسانیات، سماجی لسانیات، عمرانیات، تدریس زبان، مشینی ترجمہ، اسلوبیاتی مطالعہ وتدوین لغت میں بھی کمپیوٹیشنل متن کا استعمال ہو رہا ہے۔

ہندستانی زبانوں میں کمپیوٹیشنل متن کی تعمیر کی ابتدا Technological Development in Indian Language (TDIL) کے ذریعہ ہوئی۔ مختلف شیڈول زبانوں میں کمپیوٹیشنل متن تیار کیا گیا۔ اردو میں تیس لاکھ الفاظ پر

مشتمل کمپیوٹیشنل مواد تیار کیا جا چکا ہے۔اردو کمپیوٹیشنل متن کے مطالعہ کے لیے Software بھی تیار ہو رہا ہے مثلاً خود کار ترکیب صرفی (Automatic parsing) اور الفاظ تعداد شماری، اردو میں کمپیوٹیشنل متن اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہے۔

15.2.1 تدریس زبان اور کمپیوٹر

کمپیوٹیشنل متن کا بڑا حصہ تقریری زبان پر مشتمل ہوتا ہے۔تدریس زبان کی روایتی کتابوں میں مصنوعی مثالیں ہوتی ہیں اور زبان کی قواعد کی توضیح ملتی ہے، جو زبان کے عام استعمال کے لیے بہت مفید ثابت نہیں ہوتی ہے۔کمپیوٹیشنل متن کی مدد سے مرتب کردہ کتابوں میں زبان کے عام روزمرہ استعمال کی مثالیں بہت آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔طلبہ اس زبان کو آسانی سے سیکھ جاتے ہیں جن کا استعمال روزمرہ کی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔قواعدی نقطہ نظر سے لکھی گئی روایتی تدریسی کتابیں اس سماجی ضرورت کو پورا کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتی ہیں۔انگریزی تدریس کی روایتی کتابوں میں کمپیوٹیشنل متن کے تقریری زبان کے تقابلی مطالعے کے ذریعہ کینیڈی (1987ء)، مینٹ (Mindt:92) اور ہومس (Holmes) نے یہ ثابت کیا ہے کہ لفظیات اور جملے کی تراکیب جو روایتی تدریسی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، اس زبان سے بڑی حد تک مختلف ہوتی ہیں جو اہل زبان استعمال کرتے ہیں۔اس طرح کمپیوٹیشنل متن کے تقریری زبان کے حصے کی مدد سے مرتب کردہ کتابوں سے مبتدی کو زبان کے عام استعمال میں مدد ملے گی۔اس کے علاوہ کمپیوٹر معاون تدریسی کورس بھی زبان کے سیکھنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

اب درس و تدریس کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کافی مددگار ثابت ہو رہا ہے۔کمپیوٹر کی مدد سے حصول علم مفید کارگر اور بڑی حد تک سہل ہو گیا ہے۔تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی خاص بات یہ ہے کہ اس عمل میں طالب علم کو کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ دوطرفہ تفاعل میں مصروف کیا جاتا ہے۔بنیادی طور پر کمپیوٹر طریقہ تدریس کی امداد اشیا کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔نصاب کے اسباق اس طرح سے تیار کیے جاتے کہ تدریس کی امداد اشیا کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔نصاب کے اسباق اس طرح سے تیار کیے جاتے کہ تدریس کا بندوبست بہت آسان ہو جاتا ہے۔اسباق کی تدریس کے ساتھ جانچ (Testing) اور مشق (Exercise) کا کام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔یہی متن فاصلاتی تعلیم میں نشر و اشاعت کے کام بھی آتا ہے۔کمپیوٹر اسباق کے میوزیم کا کام کرتا جس سے ہر سبق کی رسائی بہت آسانی سے ہو جاتی ہے۔

15.2.2 کمپیوٹر کی مدد سے تدریس کے فوائد

1۔ روایتی کلاس روم لکچر اور کتاب کے ذریعہ حصول علم میں طلبہ کی مجہول (Passive) حیثیت ہوتی ہے۔اس کے برعکس کمپیوٹر کی مدد سے تدریس طلبہ کو فعال بناتی ہے۔اس کے اسباق ''خود رہنمائی'' کے اصول پر ڈیزائن کیے جاتے ہیں، جس کے ذریعہ طلبہ فعال اشتراک (Active Participation) کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔یہ طریقہ ہر مقاصد کے حصول اور مہارتوں کو مزید تقویت دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور یہ طریقہ طالب علم کے حصول علم میں خود مختار بنا دیتا ہے۔

2۔ طلبہ کے تفاعلی اشتراک کے عمل میں کمپیوٹر فوراً فیڈ بیک دیتا ہے۔کمپیوٹر طلبہ کے جوابات کے مطابق مختلف طریقوں یا مختلف

مواد کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ فیڈ بیک اصلاحی بھی ہوتا ہے۔

3۔ کمپیوٹر کے اسباق میں ڈرل/مشق کا استعمال ہوتا ہے جو طلبہ کی خامیوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے غلطی کے امکانات بڑی حد تک ختم ہو جاتے ہیں۔

4۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے ذریعہ طلبہ کو مختلف سوالات سے کوئی بھی سوال چننے کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جوابات کا ایک سلسلہ دیا جا سکتا ہے جہاں ایک جواب دوسرے سے زیادہ واضح ہوں۔ اس طرح طلبہ کو ہر انتخاب پر ایک فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔

5۔ کمپیوٹر طلبہ کی ترقی کی واضح تصویر رپورٹنگ سسٹم کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس سے طلبہ اپنی کمیوں کو جان لیتے ہیں۔

6۔ کمپیوٹر ملٹی میڈیا کا کام کرتا ہے جس میں سمعی و بصری سہولتوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ محرک تکنیکوں مثلاً چلتی پھرتی تصویروں اور خاکہ کشی کے استعمال سے تدریس کے کام کو آسان کر دیا جاتا ہے۔

7۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر طلبہ میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو تقویت ملتی ہے۔

8۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر خود رہنمائی کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے طلبہ میں خود رہنمائی و خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

15.2.3 اسلوبیاتی مطالعہ

اسلوبیات، ادب کے لسانیاتی مطالعے کا نام ہے جس میں زبان کے ادبی و تخلیقی استعمال کا مطالعہ لسانیات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اسلوبیاتی مطالعے میں لسانیاتی تجزیے کی مدد سے کسی فن پارے کی اسلوبیاتی خصوصیات کی نشان دہی کی جاتی ہے، جو اس فن پارے کی انفرادیت کا سبب ہوتی ہے۔ اسلوبیاتی تجزیے کی بنیاد پر کسی فن کار کے اسلوب کا تعین کیا جاتا ہے اور ایک فن کار کے اسلوب کو دوسرے فن کار کے اسلوب سے ممیّز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسلوبیات کے عالم عموماً کسی خاص متن یا کسی خاص فن کار کی زبان کے اسلوبیاتی مطالعے میں مصروف رہے ہیں۔ کمپیوٹیشنل متن کی مدد سے اب یہ مطالعہ زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ اب ایک بڑے متن کے الفاظ کے تجزیے کے ذریعے یہ جاننا آسان ہو گیا ہے کہ کسی صنف کی عمومی زبان کیا ہے مجموعی طور پر کسی صنف میں کس ساخت، تراکیب اور لفظیات کا استعمال ہوا ہے۔

کسی فن کار کی زبان کی ساخت، تراکیب اور لفظیات کا مطالعہ کمپیوٹیشنل متن کے ذریعہ آسان ہو گیا ہے۔ کسی فن کار کے اسلوب کی خصوصیت کا تعین زبان کے استعمال سے ہوتا ہے، یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فن کار کی کیا لفظیات ہیں۔ جملوں کی تراکیب کیسی ہے اور یہ استعمال عام زبان سے یا اسی صنف کے دوسرے فن کار سے کس طرح مختلف ہے۔ فن کار کے لفظیات کی ترتیب اب کمپیوٹیر کے ایک سافٹ ویر، Word frequency count الفاظ شماری کی مدد سے بہت آسان ہو گئی۔ اگر کلیات غالب کمپیوٹر میں Feed کر دیا جائے تو اس سافٹ ویر کی مدد سے پانچ منٹ میں غالب کے لفظیات کی فرہنگ آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ میر کی مندرجہ ذیل غزل کمپیوٹر میں داخل کر دیا جائے تو کمپیوٹر الفاظ شماری کی مدد سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا۔

غزل

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
میران نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اب	___	1	کہ	___	1
اپنی	___	1	کہا	___	1
اس	___	1			
اسی	___	1	کہیے	___	1
اضطراب	___	1	نے	___	2
ان	___	1	کیا	___	1
پنکھڑی	___	1	گلاب	___	1
یہ	___	1	لب	___	1
چھاتا	___	1	مستی	___	1
جو	___	1	میر	___	1
حالت	___	1	میں	___	1
حباب	___	1	میں	___	1
خراب	___	1	نازکی	___	1
در	___	1	نمائش	___	1
ساری	___	1	نیم باز	___	1
سراب	___	1	ہستی	___	1
سی	___	6	ہوں	___	1

6	___	ہے	1	___	شراب
1	___	یہ			

اسی طرح کسی شاعر کے دیوان/ دواوین کو کمپیوٹر میں داخل کرنے کے بعد اس کے لفظیات کی مکمل تفصیل ڈکشنری کی ترتیب میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ساتھ ہی یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کون سے الفاظ کتنی بار استعمال ہوئے ہیں۔

15.2.4 تدوین لغت

لغت کسی زبان کے الفاظ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہوتی ہے۔لسانی اعتبار سے لغت کسی زبان کی صوتی،صرفی،نحوی اور معنیاتی معلومات کا اہم وسیلہ ہوتی ہے۔کوئی لفظ کس طرح لکھا جائے،کس طرح بولا جائے،اس لفظ کے مروجہ اور قدیم معنی کیا ہیں،اس کا تعلق کس جزوکلام سے ہے،اس کی تصریفی شکلیں کون کون سی ہیں،اس کا ماخذ کیا ہے،اس کے مشتقات کیا کیا ہیں نیز اس کے مترادفات اور متضاد الفاظ کون کون سے ہیں۔یہ سب معلومات لغت میں پائی جاسکتی ہیں۔الفاظ کی نوعیت کے اعتبار سے لغات کی دو بڑی قسمیں ہوتی ہیں۔عمومی لغات (General Dictionary) میں الفاظ کے تلفظ،ماخذ، مشتقاق کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہے۔تحدیدی لغات (Restricted Dictionary) میں علمی و پیشہ ورانہ اصطلاحات،مترادفات،مرکبات،علاقائی لفظیات کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔

تدوین لغت میں کمپیوٹر کے استعمال سے بہت سی آسانیاں پیدا کردی ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔کمپیوٹیشنل متن کی تعمیر میں مختلف علوم کے متن کو کمپیوٹر میں داخل کردیا جاتا ہے۔اگر ہمیں عام لغت کی تدوین کرنی ہے تو اس متن کے الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق کمپیوٹر سافٹ ویر کے ذریعہ منٹوں میں کی جاسکتی ہے۔اگر ہمیں علم کیمیا کی لغت تیار کرنی ہے علم کیمیا سے متعلق متن کو کمپیوٹر میں داخل کرنے کے بعد کمپیوٹر سافٹ ویر کی مدد سے علم کیمیا کی فرہنگ آسانی سے تیار کی جاسکتی ہے۔

لغت نگاری (Lexicography) اطلاقی لسانیات کی اہم شاخ ہے۔آپ یہ جانتے ہیں کہ لغت کا بنیادی موضوع کسی زبان کا ذخیرہ الفاظ ہوتا ہے اور لغت میں ہر ایک لفظ کی ترتیب حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ہوتی ہے،تاریخی اعتبار سے کسی بھی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں تبدیلی ہوتی رہی ہے،کچھ الفاظ معدوم ہوجاتے ہیں اور کچھ الفاظ کا اضافہ ہر زمانے میں ہوتا رہتا ہے۔الفاظ کو لغت کی ترتیب میں یکجا کرنا ایک دشوار کام تھا،الفاظ کو جمع کر کے ان کے کارڈ بنائے جاتے تھے اور انھیں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ترتیب دیا جاتا تھا۔کمپیوٹر کی مدد سے یہ کام اب بہت ہی آسان ہوگیا۔خودکار حروف تہجی ترتیب سافٹ ویر کے ذریعہ یہ کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

لغت نگاری کا مقصد کسی زبان کے ذخیرہ الفاظ کو جامعیت کے ساتھ محفوظ کرنا اور اس پر مسلسل نظر ثانی کرنا کمپیوٹر کی مدد سے اب بہت سہل ہوگیا ہے۔

موضوع اور استعمال کے لحاظ سے انواع واقسام کے لغات پائے جاتے ہیں:

1۔ عمومی (General) لغت: اس میں ایک زبان کے تقریباً تمام الفاظ مشتقاق کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

2۔ بولی لغت: کسی علاقے سے متعلق لغت مثلاً لغات گجری یا دکنی لغت کسی طبقاتی بولی کی لغت مثلاً پارسی گجراتی کی لغت، کرخنداری کی لغت، لغات انساوغیرہ۔

3۔ کسی علم، فن یا پیشہ کی لغت مثلاً معیار کی لغت، کھیلوں کی لغت، ادبی اصلاحوں کی لغت۔

4۔ ایک مصنف کی لفظیات: اس میں ایک ہی مصنف کے استعمال کردہ الفاظ کی تدوین ہوتی ہے۔ مثلاً غالب، ملٹن، کبیر داس کے لفظیات کی لغت۔

اس کے علاوہ مترادفات لغت، کہاوتوں کی لغت، محاوروں کی لغت مندرجہ بالا تمام لغت کی تدوین میں کمپیوٹر کارآمد ہوتا ہے۔

15.3 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ زبان کے مطالعے میں کمپیوٹر کیسے استعمال ہوسکتا ہے۔ اس اکائی کے اہم نکات ہیں:

زبان کے توضیحی مطالعے کا اطلاق تدریس زبان، اسلوبیات اور تدوین لغت میں ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں کمپیوٹر کا استعمال مطالعہ زبان کی مشق کارگر ثابت ہوا ہے۔

کمپیوٹر تعمیر متن سے زبان کا توضیحی مطالعہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

کمپیوٹر تدریس زبان، اسلوبیات اور تدوین لغت میں بہت آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

15.4 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ کمپیوٹیشنل متن کی تعمیر کیسے ہوتی؟ زبان کے توضیحی مطالعے میں کمپیوٹر کیسے مددگار ثابت ہوتا ہے؟

2۔ کمپیوٹر کی مدد سے تدریس کے کیا فوائد ہیں؟

3۔ زبان کے مطالعے میں کمپیوٹر کے استعمال پر سیر حاصل گفتگو کیجیے۔

II مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ عصر حاضر میں کمپیوٹر کی اہمیت واضح کیجیے۔

2۔ تدوین لغت کے بارے میں اپنی معلومات فراہم کیجیے۔

3۔ تدوین زبان کے سلسلے میں کمپیوٹر کی اہمیت واضح کیجیے۔

15.5 سفارش کردہ کتابیں

1. Grisman, Ralph. 1986. Computational Linguistics: An Introduction Cambridge University Studies in Natural Language Processing. Cambridge University Press. Cambridge.
2. King, Margaret ed. 1983. Parsing Natural Language. Academic Press/ Harcourt Brace Jananovich: London.

بلاک۔V

اردو زبان کا ارتقا

یہ بلاک تاریخی اور تقابلی لسانیاتی جائزوں پر مشتمل ہے۔اس بلاک میں اردو زبان کے ارتقا اور اس کے مختلف مراحل کا جائزہ لیا گیا ہے جس کا تعلق تاریخی لسانیات سے ہے۔اس کے علاوہ اس بلاک میں اردو زبان اور ہندوستان کی مختلف بولیوں کے باہمی تعلق کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو تقابلی لسانیات کے دائرے میں آتا ہے۔تقابلی مطالعے کے سلسلے میں اردو زبان اور دیگر زبانوں کی مماثلتوں اور فرق واختلافات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے گویا ایک طرح سے اردو زبان سے ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔اس بلاک میں پہلے ہند آریائی کے ارتقا کے تحت اردو زبان کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے بعد اردو اور پنجابی، پھر اردو اور پالی، اردو اور نواح دہلی کی بولیوں اور اردو اور گجراتی زبان کے باہمی رشتے وتعلق کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے۔ان سارے مباحث کا نچوڑ یہ ہے کہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔ یہ بیرونی زبان نہیں بلکہ خالص ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستان کی دیگر بولیوں اور زبانوں سے اس کا گہرا رشتہ ہے۔اس باب میں پانچ اکائیاں ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

اکائی 16: ہند آریائی کا ارتقا

اکائی 17: اردو اور پنجابی

اکائی 18: اردو اور پالی

اکائی 19: اردو اور نواح دہلی کی بولیاں

اکائی 20: اردو اور گجراتی

اکائی 16 ہندآریائی کا ارتقا

ساخت

16.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو ہندآریائی کا ارتقا سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

- آریاؤں کے وطن کی نشان دہی کرسکیں
- ہندآریائی کے ارتقا کی تفصیل بیان کرسکیں
- ہندوستان میں آریاؤں کی آمد پر روشنی ڈال سکیں اور
- ہندآریائی کے مختلف ادوار کی وضاحت کرسکیں۔

16.1 تمہید

زبانوں کے ہندآریائی خاندان کا شمار اہم اور قدیم ترین زبانوں کے خاندانوں میں ہوتا ہے۔ ہندآریائی ہندوستان

میں آریاؤں کے ساتھ آئی۔ ہندوستان میں آریہ گروہوں میں متعدد بار آئے اور وہاں کے مقامی باشندے دراوڑیوں کو ڈھکیل کر آباد ہوتے رہے۔ دراوڑی جنوبی ہند میں آباد ہو گئے جب کہ آریہ نسل کے لوگ شمالی ہندوستان میں پھیل گئے اور وہیں ان کی زبان پھولنے اور پھلنے لگی۔ ماہرین لسانیات نے اس زبان کی ترقی کے تین مدارج بتائے ہیں جو اس طرح ہیں:

i قدیم ہند آریائی

ii وسطی ہند آریائی

iii جدید ہند آریائی

جدید ہند آریائی سے تعلق رکھنے والی کئی شاخیں ہیں جن میں سے ایک مغربی ہندی کی بھی شاخ ہے۔ اس شاخ کی پانچ بولیاں ہیں۔ کھڑی بولی اسی شاخ کی ایک بولی ہے جس پر اردو اور ہندی کی بنیادیں قائم ہیں۔

اس اکائی میں آریاؤں کا وطن، ہند آریائی کا ارتقا، ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اور ہند آریائی کے مختلف ادوار پر بحث کی گئی ہے۔

16.2 آریاؤں کا وطن

آریاؤں اور ان کے اصل وطن کا سلسلہ ہندوستان (پنجاب وکشمیر) سے شروع ہو کر ہندوکش، تبت، کا کیشیا، وسط ایشیاء، جنوبی روس، بحر یہ بالٹک کا ساحل، اسکنڈی نیویا، آسٹریلیا، ہنگری، شمالی جرمنی، پولینڈ اور سائبیریا اور خط نجد شمال پر ختم ہوتا ہے۔ آریاؤں کی قدیم کتابوں میں ان کے اصل وطن اور آمد کے سلسلہ میں کوئی مستند دلیل نہیں ملتی۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ آریا تبت سے آئے تھے۔ ہندوؤں کے مذہبی عقیدہ کے مطابق تبت کو انسان کا پہلا مسکن مانا جاتا ہے اس لیے آریاؤں کو بھی اسی علاقہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ سنسکرت کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ آریا قبائل ہندوستان ہی کی سرزمین سے اٹھے اور بعد میں ایران و یوروپ میں پھیل گئے۔ اس نظریہ کو پنڈت ہری اودھ نے اپنی کتاب ''ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس'' میں وضاحت سے بیان کیا کہ وہ اپنی رائے کی تائید میں سوامی دیانند، شری نرائن بھون راؤ پاؤ گی اور کئی یوروپی عالموں کی رائیں پیش کی ہیں لیکن ان نظریوں میں قباحت ہے کہ یہ تحقیق سے زیادہ عقیدہ کی پیداوار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہ قول میور سنسکرت کی جتنی قدیم کتابیں ہیں ان میں آریاؤں کے بدیسی ہونے کی طرف کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کہیں وضاحت کے ساتھ پیش نہیں کی گئی ہے کہ آریا اسی سرزمین سے اٹھے تھے۔ رگ وید میں یہاں کے دیسی قبائل اور آریوں کی لگاتار لڑائیوں کے بارے میں اشارے ملتے ہیں ان سے تو صاف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آریا قبائل شمال مغربی ہندوستان کے باشندوں سے لڑتے بھڑتے ہوئے ہندوستان کے میدانوں میں داخل ہوئے۔ ہندوستان کو آریاؤں کا اصلی وطن ماننے والے محققین کا یہ نظریہ استدلال کہ ہندوستان قدیم تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہے اس لیے ابتدائی زبان کی تلاش یہیں کرنی چاہیے، نہایت کمزور ہے۔ اس نظریے کے حامیوں کے ذہن سے وہ لسانی رشتہ یکسر محو ہو جاتے ہیں جو ہمیں ایک طرف ایران اور دوسری طرف یوروپ کی موجودہ زبانوں سے وابستہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نظریہ کے حامیوں میں اختلاف رائے بھی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آریا پنجاب میں دریائے سرسوتی کے کنارے بستے تھے، کچھ قندھار اور تبت کو آریوں کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔ پروفیسر کیتھ کا جس کی

گریرسن بھی تائید کرتا ہے خیال ہے کہ آریا قبائل کا اصل وطن ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر تھا۔گریرسن کا خیال ہے کہ رگ وید کے سب سے پہلے منتر آریوں کے داخلہ ہندوستان سے قبل لکھے جا چکے تھے۔یہ اس زبان میں لکھے گئے ہیں جو ہند آریائی زبانوں کی ماں تھی۔اسی طرح مجموعی طور پر جدید محققین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ آریوں کے وطن کی تلاش وسطی ایشیاء کے علاقوں ہی میں کرنا پڑے گا۔ڈاکٹر چٹرجی کا خیال ہے کہ قرون اولیٰ کی ہند یوروپی زبان وتمدن کا گہوارہ یورشیا کے وہ وسیع میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف پولینڈ اور جرمنی سے ملتا ہے اور دوسری طرف یورال پہاڑوں کے جنوب میں وسط ایشیاء کے الطائی اور تھین شان کے سلسلہ ہائے کوہ سے۔پروفیسر شریدر نے تعین مقام کرتے ہوئے دریائے والگا کے دہانے کو آریوں کا اصل وطن قرار دیا ہے۔ان کے خیال میں تاریخی دھند لکے میں آریا مغرب اور جنوب کی طرف پھیلنا شروع ہوئے جو گروہ مغرب میں داخل ہوتا ہے وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر تمام یوروپ میں پھیل جاتا ہے اور موجودہ آرمینن ''یونانی'' البینن، کیلٹک، جرمن، سلوانک اور تخارین زبانوں کو جنم دیتا ہے۔دوسرا گروہ جو جنوب مشرق کی سمت اختیار کرتا ہے بحیرہ کیپین کے شمال سے ہوتا ہوا موجودہ بدخشاں اور کوہ کند کے علاقے میں پہنچتا ہے جہاں وہ پھر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ایک شاخ مشرقی ایران میں داخل ہوتی ہے اور پھر دریائے کابل کی وادی کے راستے سے ہندوستان میں آ پہنچتی ہے۔''کیمبرج ہسٹری آف انڈیا'' میں پروفیسر Giles نے جغرافیائی اور تاریخی وجوہ کی بنا پر آریوں کی نقل وحرکت کے اس نظریہ کو مسترد کیا ہے۔وہ آریوں کے پھیلنے کا مرکز آسٹریا اور ہنگری بتاتے ہیں اور اس طرح ان کے خیال میں سب سے زیادہ فطری راستہ درہ دانیال اور ایشیائے کوچک میں سے ہوگا۔تاریخ میں بعد کو نقل مکان کی جتنی مثالیں ملتی ہیں ان میں یہی راستہ اختیار کیا گیا ہے۔بحرہ کیپسن کے شمال مشرق سے آریوں کا گزرنا اس لیے ناممکن قرار دیا گیا ہے کہ یہ نشیبی علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ عہد عتیق میں زیر آب تھا۔اس وقت بحیرہ کیپین اتنے وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا کہ اس کا سلسلہ جھیل ارال سے ملتا تھا۔اسی طرح جنوبی روس سے کاکیشیا کی جانب بھی نقل وحرکت ناممکن تھی۔پہاڑوں کے اس دشوار گزار سلسلہ کو یونانی قدرتی فصیل سمجھتے تھے۔آج بھی یہ سلسلہ صرف درۂ دانیال سے عبور کیا جا سکتا ہے۔

وسطی ایشیاء والے نظریہ کی تائید ان ریکارڈوں سے بھی ہوتی ہے جو سن 1906ء میں ایشیائے کوچک میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کا تعلق 1500 قبل مسیح سے ہے۔ان ریکارڈوں میں بعض دیوی دیوتاؤں کے نام مثلاً اندرا، ارونا، متیرا وغیرہ ملتے ہیں۔جنھیں مٹّی کے حکمران پوجتے تھے۔یہ نام سنسکرت کی مقدس کتابوں میں جوں کے توں پائے جاتے ہیں بالخصوص اعداد تو سنسکرت اعداد سے ملتے جلتے ہیں یہ امر مسلم ہو جاتا ہے کہ آریا کاکیشیا کے راستے سے ایشیاء کوچک اور مشرق کی طرف بڑھے ہوں گے۔

16.3 ہند آریائی کا ارتقا

ہندوستان میں ہندیوروپی زبانوں کا سلسلہ تقریباً 3500 ق م (قبل مسیح) سے ملتا ہے۔ہندیوروپی زبانیں ترقی کرتی ہوئی جب 2000 سال ق م میں اپنی دوسری منزل پر پہنچی ہیں تو ''ہند ایرانی'' کا نام دیا گیا تھا۔ہندیوروپی زبانوں میں ادب اور زبان دونوں حیثیتوں سے ہند ایرانی کو سب سے قدیم اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ہند ایرانی آگے بڑھتی گئی تو تین شکلیں اختیار کرتی ہیں۔اس زبان کا جو گروہ ایران میں مقیم رہا اس سے ایرانی زبان کا سلسلہ ملتا ہے۔کچھ لوگ کشمیر اور اس کے آس پاس تک پہنچ گئے

وہاں ''پشاچہ'' زبانوں کا سلسلہ پھیلا اور جب آریوں کا ایک گروہ بڑی تعداد میں اپنے لسانی ورثہ کے ساتھ ہندوستان میں آیا تو یہیں سے ہندآریائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان کی موجودہ زبانیں اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جن میں اردو بھی ایک ہے۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کا مطالعہ کرنے کے لیے آریائی کے ارتقا کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جس کا گہرا تعلق ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے ہے۔

علمائے لسانیات نے دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں کو مختلف لسانی خاندانوں میں منقسم کیا ہے۔ ان لسانی خاندانوں میں ''ہند یوروپی خاندان'' سب سے زیادہ اہم ہے کیوں کہ اس میں شامل زبانیں دنیا کے ایک بڑے علاقہ میں بولی جاتی ہیں اور ان میں سے بعض زبانیں ادبی حیثیت سے دنیا کی عظیم ترین زبانیں ہیں۔ ہند یوروپی خاندان کے کئی ذیلی خاندان ہیں۔ ہندآریائی ان میں سے ایک ہے جس کا ارتقا ہندوستان میں آریوں کی آمد کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

16.4 ہندوستان میں آریاؤں کی آمد

ہندوستان میں آریوں کی آمد ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آریہ ہندوستان میں پہلے پہل 1500 ق م میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک ان کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ ہندوستان میں آریوں کی آمد کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب آریہ وسط ایشیاء سے ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے تو ان کی زبان ''ہند یوروپی'' کی کوئی شکل رہی ہوگی لیکن جیسے جیسے مقام اور زمانے میں تبدیلی ہوتی گئی ان کی زبان بھی بدلتی گئی کیوں کہ لسانیات کا یہ اصول ہے کہ زبانیں وقت اور جگہ میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ جس وقت آریہ لوگ وسط ایشیاء سے چل کر ایران پہنچے تو ان کی زبان ''ہند یوروپی'' کی ایک قسم ''ہندایرانی'' میں تبدیل ہوگئی۔ مورخین کا کہنا ہے کہ 2000 ق م آریہ ایران میں موجود تھے اور ہندایرانی زبان بولتے تھے۔ ایران میں اپنے قیام کے بعد یہی آریہ 1500 ق م میں ہندوستان کے شمال مغربی سرحد پر نمودار ہوئے۔ اس وقت ان کی زبان اس پانچ سوسال کے عرصہ میں ''ہندایرانی'' سے ''ہندآریائی'' بن جاتی ہے جس کے ارتقا کی تین منزلیں ہیں:

i	قدیم ہندآریائی	500 ق م سے 1500 ق م تک
ii	وسطی ہندآریائی	500 ق م سے 1000 تک اور
iii	جدید ہندآریائی	1000 سے تا حال

16.5 قدیم ہندآریائی

ہندآریائی کا قدیم دور 1500 ق م سے قائم کیا جاتا ہے جب آریہ لوگ ہندآریائی زبان بولتے ہوئے شمال مغربی سرحد پر نمودار ہوتے ہیں اور 600 ق م تک یہی آریہ پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل جاتے ہیں۔ اس دور میں جس زبان کا ارتقا

شمالی ہندوستان میں ہوا، اسے سنسکرت کہتے ہیں جو ''ہند ایرانی'' شاخ سے الگ ہونے پر ہندوستان میں پیدا ہوئی جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ''ر'' اور ''ل'' دونوں آوازوں کے لیے صرف (ر) کی آواز مستعمل تھی۔ اس میں نفس بھ، دھ اور گھ قسم کی آوازوں کو (ہ) میں تبدیل کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ جوں جوں یہ آریہ مغرب سے مشرق کی طرف بڑھے ان کی زبان پر دیسی بولیوں کا بھی اثر پڑا جو وید کے مختلف بابوں سے واضح ہے۔ یہ اثر صرف تلفظ کی حد تک نہیں تھا بلکہ دیسی الفاظ کی آمیزش بھی ہونے لگی تھی۔ ملک کے دور دراز کے علاقوں میں پھیلنے اور غیر آریائی اقوام سے ربط وضبط بڑھنے کی وجہ سے آریہ زبانوں کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی۔ صرفی ونحوی اور معنوی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں بولی جانے لگیں۔ اجنبی ماحول کی خصوصیات سے متاثر ہوکر الفاظ کو توڑا اور مروڑا جانے لگا۔ حروف کا تلفظ بھی مختلف طریقے سے کیا جانے لگا۔ مشرقی ہندوستان کے صوبوں میں یہ تبدیلیاں تیزی سے رونما ہونے لگیں۔ علاقائی اختلافات کی بنیاد پر ان کی تین قسمیں رائج ہوجاتی ہیں:

i ادیچیہ شمال مغربی ہندوستان کی زبان

ii مدھیہ دیشہ کی زبان (مدھیہ دیش، انبالہ سے الہٰ آباد) اور

iii پراچیہ مشرقی ہندوستان کی زبان

شمال مغربی حصے کی بولی ادیچیہ ایک معیاری بولی کی حیثیت سے رائج ہوئی کیوں کہ وہ آریوں کی قدیم معیاری زبان سے قریب تر تھی۔ اس کا تلفظ اور لب ولہجہ بالکل آریائی تھا اور یہی بولی دوسروں کے لیے بھی قابل تقلید تھی۔ پراچیہ زبان کا رواج موجودہ اودھ، مشرقی یوپی اور مغربی بہار کے بعض حصوں میں تھا۔ یہاں کی زبان دیسی بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لہجہ کسی حد تک کھو چکی تھی۔ مغربی ہندوستان کے آریہ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ''اسوروں'' کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کی زبان کو ''براہمنہ'' میں ''اشدھ'' کہا گیا ہے۔ اس میں (ر) کی بولی (ل) میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ادیچیہ اور پراچیہ کے درمیان کی بولی مدھیہ دیشہ کہلاتی تھی۔ یہ بولی نہ تو ادیچیہ کی طرح بہت معیاری تھی اور نہ پراچیہ کی طرح بہت پست۔ ان تمام بولیوں میں جو غیر آریائی اثرات رونما ہو رہے تھے وہ بہت اہم ہیں۔ مثلاً ہند ایرانی میں کوز اور ہکار آوازیں مفقود ہیں جیسے ٹ، ڈ، تھ اور بھ وغیرہ۔ ان آوازوں کا ارتقا خالص مقامی بولیوں دراوڑی اور آسٹرک لسانی اثرات کے سبب ہوا۔ صوتی اثرات کے علاوہ مقامی زبانوں کے الفاظ بھی جیسے کھاٹ، پیٹ اور روٹی وغیرہ بھی ان تینوں بولیوں نے قبول کیے۔

قدیم ہند آریائی دور میں ان مقامی بولیوں کے علاوہ سنسکرت کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی۔ ملک کے جن جن حصوں میں آریہ پھیل گئے تھے وہاں کے مذہبی، علمی اور ادبی حلقوں میں یہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ہندوستان کے قدیم ناٹکوں میں برہمن اور اعلیٰ طبقے کے کردار سنسکرت بولتے ہوئے دکھائے گئے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ سنسکرت کا رواج خاص خاص طبقوں میں کافی عرصے تک رہا اور یہ بول چال کی زبان تھی۔ قدیم ہند آریائی دور میں سنسکرت کی دو ادبی شکلیں، ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت بھی تھیں۔ ویدک سنسکرت کی اصطلاح اس سنسکرت زبان کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس میں وید کی تخلیق ہوئی۔ ''رگ وید'' سب سے قدیم وید ہے۔ سام وید، یجر وید اور اتھر وید اس کے بعد کی تخلیق ہیں۔ لسانی اور تاریخی اعتبار سے رگ وید کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس میں خدا کی تعریف اور مظاہر قدرت کا بیان ہے۔ علما کا خیال ہے کہ اس کی تخلیق نہ تو ایک شخص نے کی اور نہ ہی یہ ایک مقام اور ایک دور میں لکھی گئی۔ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کا آخری حصہ گنگا کی وادی میں لکھا گیا۔ اس کی زبان کافی

حد تک اویستا (Avesta) کی زبان سے مشابہت رکھتی ہے جو ایران میں لکھی گئی۔

کلاسیکل سنسکرت ویدک سنسکرت کے بعد کا ارتقا ہے۔ علما کا خیال ہے کہ ویدک سنسکرت جب دھیرے دھیرے ادبی روپ اختیار کرنے لگی تو کلاسیکل سنسکرت کہلائی جس کی سب سے پہلی جھلک ہمیں آخری برہمنوں، اپنشدوں اور سوتروں میں ملتی ہے۔ ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت میں بھی بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان میں تلفظ کی تبدیلیاں اور قواعد کے فرق بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پانی ویدک سنسکرت کو مردہ اور کلاسیکل سنسکرت کو زندہ زبان بتاتا تھا۔ پانی کے بعد کاتیاین اور پاتانجلی نے بھی اس فرق کو برقرار رکھا۔ کلاسیکل سنسکرت نے وسط ہند آریائی زبانوں کے بہت سے پراکرت مادے اور بنیادی افعال بھی لیے ہیں۔ ان میں سے کچھ عنصر آریائی بھی ہیں۔ نحو، محاورہ اور روزمرہ کے لحاظ سے بھی یہ پراکرتوں سے مماثل ہوگئیں۔ 500 ق م تک پہنچتے پہنچتے سنسکرت زبان جمود کا شکار ہو کر دم توڑ دیتی ہے اور اس کی جگہ ایک سادہ اور فطری زبان لے لیتی ہے جسے ''پراکرت'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

16.6 وسطی ہند آریائی

آریاؤں کا عہد وسطی دور 500 ق م سے لے کر 1000ء تک قائم ہے۔ اس دور میں ہمیں زبانوں کے دو نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پراکرت اور اپ بھرنش۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ 500 ق م تک پہنچتے پہنچتے سنکرت زبان جمود کا شکار ہو کر دم توڑ دیتی ہے اور اس کی جگہ ایک عام بول چال کی زبان لے لیتی ہے جو تلفظ اور قواعد کے لحاظ سے آسان، سادہ اور فطری تھی جس کو ''پراکرت'' کے نام سے موسوم کیا گیا جس کا ارتقا شمالی ہندوستان میں 500 ق م کے بعد شروع ہوتا ہے۔

وسطی آریائی دور کی زبان کو خصوصیت کے لحاظ سے تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

1. پہلا دور 500 ق م سے 100ء تک
2. دوسرا دور 100ء سے 600ء تک
3. تیسرا دور 600ء سے 1000ء تک

(1) پہلا دور

اس دور کی زبانوں کو ''پہلی پراکرت'' کہا گیا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبان۔ لفظ پالی سنسکرت کے ''پنکتی'' سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہیں سیدھی لکیر یا سرحد۔ مجازاً مقدس متون۔ مذہب کی سیدھی لکیر۔ یہ قول پنڈت ہری اودھ ''پالی بدھ دھرم شاستر کی سطر کو کہتے ہیں۔ اس کے نام سے ثابت ہے کہ بدھ مت کی ابتدائی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئی ہوں گی۔ اسی پالی کو قدیم ماگدھی بھی کہتے ہیں جو بعد کی نئی ماگدھی سے مختلف تھی۔ اس وقت یہی بول چال کی زبان تھی۔ گوتم بدھ نے اسی بولی میں اپنے دھرم کی تبلیغ کی تھی۔ اشوک کے کتبوں کی تحریریں کھروشٹی اور براہمی رسم خط میں ملتی ہیں۔ شہباز گڑھی اور مان سیہرا کی تحریریں تو کھروشٹی میں ہیں اور باقی سب براہمی میں۔

(2)دوسرا دور

اس دور میں ارتقا پذیر ہونے والی پراکرتوں کو ''ادبی پراکرت'' یا ''دوسری پراکرت'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ علاقائی تقسیم کے لحاظ سے اس کی حسب ذیل پانچ قسمیں ہیں:

(i)شورسینی پراکرت

اس کا مرکزی علاقہ شورسین دیس تھا جس کا مرکز متھرا تھا۔ یہ علاقہ ایک طرح سے وہی علاقہ تھا جو قدیم ہندآریائی دور میں مدھیہ دیش کہا جاتا تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقوں میں اسی پراکرت کا رواج تھا جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔

(ii)ماگدھی پراکرت

مگدھ دیس یا جنوبی بہار کی پراکرت تھی۔ چوں کہ یہ آریائی تمدن کے مراکز سے کافی دور جا پڑی تھی اس لیے ایک غیر مہذب زبان سمجھی جاتی تھی۔ پالی سے اس کا گہرا تعلق بتایا جاتا ہے۔

(iii)اردھ ماگدھی پراکرت

شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی علاقے (بہار سے الہٰ آباد تک) میں اردھ ماگدھی پراکرت بولی جاتی تھی۔ پراچیہ کے تحت ماگدھی اور اردھ ماگدھی دونوں آجاتی تھیں جن میں اردھ ماگدھی کو فروغ رہا۔ اس کا رواج اس زمانے کے شاہی خاندانوں میں رہا جس کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر بھی اثر انداز ہوئیں۔ یہ اس وقت کی معیاری زبان تھی۔ گرنار، شہباز گڑھی اور مانسیہرا تک کی لاٹوں میں اس کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن مارکنڈے کے مطابق خود اردھ ماگدھی شورسینی اور ماگدھی کے میل سے بنی ہے۔

(iv)پشاچی پراکرت

یہ وہ پراکرت تھی جو کشمیر اور پنجاب کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ عوام میں یہ بھوت پریت کے نام سے مشہور تھی۔ گریرسن نے اس دور کی دو شکلیں قرار دی ہیں۔ ایک خالص اور دوسری مخلوط۔ پہلی کی سات اور دوسری کی چار شکلیں مانی گئی ہیں۔ کشوں کے عہد میں اس پراکرت کے فروغ ہوا۔ شاہی سرپرستی کے تحت گندھار کی بولی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے اس علاقہ میں رائج ہوگئی اور ٹکشلا کا دارالعلوم اس وقت علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا۔

(v)مہاراشٹری پراکرت

اس کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو آج مہاراشٹرا میں شامل ہیں۔ ادبی حیثیت اس زمانے میں مہاراشٹری پراکرت کو سب سے زیادہ عروج حاصل تھا۔ اس عہد کا بیشتر شعری ادب اسی میں ملتا ہے۔ موسیقی میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا جس کی وجہ یہ

تھی کہ مصوتوں کی کثرت کی وجہ سے اس میں لوچ تھا۔ آج بھی مہاراشٹرا کا سنگیت اتم مانا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لفظ مہاراشٹرا سے اکثر ملک ہندوستان مراد لی جانے لگی۔

(3) تیسرا دور

مذکورہ بالا پراکرتیں ادبی پراکرت کے نام سے مشہور ہیں اور جب کوئی زبان ادبی شکل اختیار کر لیتی ہے تو وہ عوامی بولی سے مختلف ہو جاتی ہے۔ چناں چہ جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کیا تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں اور عوام نے اسی پراکرت میں مختلف قسم کی صوتی اور قواعدی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ جس سے پراکرت کی ایک بگڑی ہوئی شکل نمودار ہوئی جو ''اپ بھرنش'' کہلائی۔ جس کے لفظی معنی ''بھرشت'' یا بگڑی زبان کے ہیں۔ اس طرح 600ء تک پراکرتوں کا وجود ختم ہو گیا اور ان علاقوں میں جہاں جہاں پراکرتیں پائی جاتی تھیں اپ بھرنشیں پیدا ہو گئیں۔ شروع شروع میں لفظ اپ بھرنش کسی خاص زبان کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ ان پڑھوں کی زبان کو اپ بھرنش کہا کرتے تھے۔ اپ بھرنش کی تصنیفات کا سلسلہ چھٹی صدی سے لے کر دسویں صدی تک ملتا ہے۔ ''پراکرت پنگل'' کی تصنیف اس بات کا ثبوت ہے کہ اپ بھرنش کی قدیم روایت کی جکڑ بند سے عرصہ تک ہمارے شعر و ادب کو چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ اپ بھرنش کو زندہ زبان پا کر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ یوروپ کی زبان تک نے اس کے اثرات قبول کیے لیکن راجپوتانہ، گجرات اور دوآبہ میں بولی جانے والی بولیوں پر اس کی چھاپ گہری پڑی۔ ماکنڈے نے اپ بھرنش کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(i) ناگر اپ بھرنش

یہ گجرات اور راجستھان کی قدیم بولیوں کی ادبی شکل تھی جس پر شورسینی کا اثر اس قدر پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ علمی طبقہ میں مقبول ہونے کی وجہ سے اس کو فوقیت حاصل تھی۔

(ii) براچڈ اپ بھرنش

یہ سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی اس سے نکلی ہے۔

(iii) اپ ناگر اپ بھرنش

یہ ناگر اور براچڈ کے میل سے بنی تھی اور اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب میں تھا۔

مسعود حسین خاں نے علاقائی تقسیم کے لحاظ سے اپ بھرنش کی پانچ قسمیں بتاتے ہوئے ہندوستان کی جدید زبانوں کا سلسلہ حسب ذیل اپ بھرنشوں سے ملایا ہے۔

(i) شورسینی اپ بھرنش

اس کا علاقہ وہی تھا جو شورسینی پراکرت کا تھا۔ شورسینی اپ بھرنش کے اختتام کے بعد اس علاقے سے کھڑی بولی کا ارتقا

عمل میں آیا جس کی دو نمائندہ زبانیں ہندی اور اردو میں ہیں۔شورسینی اپ بھرنش کے علاقے میں پنجابی اور اجستھانی زبانوں کا بھی ارتقاء ہوا۔گجراتی اور پہاڑی بولیاں بھی یہیں سے ارتقا پذیر ہوئیں۔

(ii)ماگدھی اپ بھرنش

اس کا علاقہ وہی تھا جو ماگدھی پراکرت کا تھا۔ ماگدھی اپ بھرنش کے بعد اس علاقے میں بنگالی، آسامی اور اڑیا زبانوں نے جنم لیا۔بہار کی کچھ بولیاں بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔

(iii)اردھ ماگدھی اپ بھرنش

شورسینی اور ماگدھی اپ بھرنش کے بیچ کا علاقہ اس کا علاقہ ہے۔اس علاقے میں اودھی وغیرہ کا ارتقاعمل میں آیا۔

(iv)مہاراشٹری اپ بھرنش

اس کا علاقہ وہی تھا جومہاراشٹری پراکرت کا تھا۔مراٹھی زبان کا ارتقااسی اپ بھرنش سے ہوا۔

(v)شمال مغربی علاقہ کی اپ بھرنش

اس کی دوقسمیں ہیں:

i براچڑاپ بھرنش : یہ سندھ کے علاقہ کی زبان سمجھی جاتی ہے۔سندھی زبان کا ارتقاءاسی زبان سے ہوا۔

ii کیکئی اپ بھرنش: یہ مغربی پنجاب کی زبان تھی۔لہنداا اس اپ بھرنش سے نکلی۔ چوں کہ براچڈ اور کیکئی اپ بھرنش شمال مغربی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہےاس لیےلہنداا اور سندھی میں حددرجہ مماثلت ہے۔

16.7 جدید ہندآریائی

جدید ہندآریائی دور کا آغاز 1000ء سے ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب شمال ہندوستان میں مختلف قسم کی سیاسی، تہذیبی اور لسانی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں جس کا اثر زبان پر پڑتا ہے اردو زبان تیزی کے ساتھ اپنا چولہ بدلتی ہے۔اس طرح 1000ء تک اپ بھرنش ختم ہو جاتی ہے اوران کی جگہ جدید ہندآریائی زبانیں لے لیتی ہیں اور یہی زبانیں معیاری بننے کے بعد ایک نمایاں شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ یہ بات کہنا مشکل ہے کہ ہندآریائی زبانیں کس سنہ سے شروع ہوئیں۔ایک اندازے کے مطابق 1000ء جدید ہندآریائی کے آغاز کا زمانہ مانا جاتا ہے۔اس وقت ہندوستان میں اہم سیاسی اور تہذیبی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔مسلمان حملہ آور تیزی سے ہندوستان میں اپنے قدم جمارہے تھے۔شمال ومشرق میں یہ لوگ دسویں صدی کے آخر حصہ میں آئے اوراس کے بعد سارے ملک میں پھیلتے گئے۔محمودغزنوی کی حکومت پنجاب میں تقریباً ڈیڑھ سوسال سے زیادہ قائم رہی۔ محمودغزنوی نے بارہویں صدی میں پرتھوی راج کوشکست دی، تیرہویں صدی کی ابتدا میں غلام خاندان کی بنیاد دہلی میں پڑی،

چودھویں صدی عیسوی میں خلجی حکومت دکن تک پھیل گئی اور تغلق حکومت کے خاتمہ پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انتشار اور بدامنی پھیلنے لگی۔ سولھویں صدی میں جب مغل سلطنت قائم ہوئی تو اس کے بعد ملک میں مضبوط اور مستحکم حکومت کی بنیاد پڑی۔ اس طرح یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی تشکیل کا زمانہ سیاسی لحاظ سے سخت الٹ پھیر کا زمانہ تھا۔ اسلامی تہذیب، معاشرت اور مسلمان فاتحین کی زبانوں کا اختلاط یہاں کی مقامی تہذیب وتمدن اور زبانوں سے ہونے لگا جس سے جدید ہند آریائی کے ارتقا میں کافی مدد ملی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب ''انڈو ایرین اینڈ ہندی'' میں لکھا ہے کہ ''اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل نہ کی ہوتیں تب بھی جدید ہند آریائی زبانیں پیدا ہوتیں لیکن انھیں جو سنجیدہ ادبی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اس میں ضرور دیر ہوتی۔'' پروفیسر مسعود حسین خان کے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان کی آمد ہوئی۔ انھوں نے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان کی آمد ہوئی۔ انھوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبان کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اسی لیے جب ہند آریائی سے مختلف قوموں کا ربط وتعلق بڑھتا گیا تو بہت سی زبانوں اور تہذیبوں کا امتزاج واضح نظر آنے لگا۔ ان میں الگ الگ لسانی خصوصیات ظاہر ہونے لگیں۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ان کے لسانی خصوصیات کے پیش نظر جدید ہند آریائی زبانوں کو مختلف علاقوں میں تقسیم کیا۔ یہاں ہم چٹرجی کی تقسیم السنہ کے مطابق جدید ہند آریائی زبانوں کا مختصر سا تعارف پیش کرتے ہیں۔

سندھی

یہ صوبہ سندھ کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سندھ میں عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے شامل ہیں۔ پاکستان میں سندھی، عربی رسم الخط میں ہندوستان میں دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔ سندھی میں صوفیانہ ادب کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جس پر عربی کا راست اثر پڑتا ہے۔

لہندا

یہ مغربی پنجابی کی زبان ہے۔ یہ اپنی قواعد اور فرہنگ دونوں اعتبار سے مشرقی پنجابی سے مختلف ہے۔ اس کا اپنا رسم الخط ہے جسے ''لہندا'' کہتے ہیں لیکن عموماً یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

پنجابی

مغرب میں یہ لہندا یا مغربی پنجابی، شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں بیکانیری بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مشرق میں اس کے حدود مغربی ہندی کی دو بولیوں یعنی کھڑی بولی اور ہریانی سے ملتے ہیں۔ پنجابی ہی کی ایک شاخ ڈوگری ہے جو جموں میں رائج ہے۔ سکھ مذہب کی وجہ سے پنجابی کو بہت ترقی ہوئی۔ انھوں نے اس کے لیے گرمکھی رسم الخط اختیار کیا۔ امرتسر ضلع گرداس پور کی پنجابی معیاری سمجھی جاتی ہے۔ پنجابی فارسی، گرمکھی اور دیوناگری تینوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

گجراتی

یہ گجرات، کاٹھیاواڑ اور کچھ کی زبان ہے۔ جدید گجراتی قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی بالخصوص برج بھاشا سے کافی متاثر ہے۔ اسماء اور افعال کے اعتبار سے یہ مغربی ہندی کی اتباع کرتی ہے جو دکنی کی بھی خصوصیت ہے۔

راجستھانی

یہ مدھیہ پردیش کی زبان ہے۔ یہ شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہے۔ اس میں قدیم ادب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ہندی کے ویرگاتھا کال کے کئی راسوں راجستھانی میں ملتے ہیں۔ راجستھان کی کئی بولیاں ہیں جن میں مارواڑی، جے پوری، میواتی اور مالوی قابل ذکر ہیں۔ راجستھان کی تہذیبی زبان ہندی ہے۔

مغربی ہندی

گریرسن نے مدھیہ پردیش کی زبان کو مغربی ہندی کا نام دیا ہے۔ جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔ مغربی ہندی کا براہ راست تعلق شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ اہم درج ذیل بولیاں ہیں:

1۔ کھڑی بولی یا ہندوستانی
2۔ ہریانوی
3۔ برج بھاشا
4۔ قنوجی
5۔ بندیلی

اردو کا سلسلہ بھی انھیں مغربی ہندی کی بولیوں سے ملتا ہے۔ اس لیے مغربی ہندی کی ان بولیوں کے بارے میں آگے تفصیل سے ذکر آئے گا۔

مشرقی ہندی

مشرقی ہندی میں ماگدھی، اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی بولیاں شامل ہیں۔ اودھی لکھنو، فیض آباد اور الہ آباد میں بولی جاتی ہے۔ اس کا ادب کسی زمانے میں بہت وقیع تھا۔ اس زمانے میں اس بولی کی حیثیت زبان کی تھی۔ اس میں جائسی کی پدماوت اور تلسی داس کی رام چرت مانس یعنی رامائن جیسے شاہکار ملتے ہیں۔ بگھیلی، بندیل کھنڈ کی بولی ہے۔ چھتیس گڑھی مشرقی مدھیہ پردیش میں چھتیس گڑھ کی بولی ہے۔ اس پر مراٹھی اور اڑیہ کا اثر ہے۔ مشرقی ہندی بولنے والوں کی تہذیبی زبان ہندی ہے۔ چھتیس گڑھی مشرقی مدھیہ پردیش میں چھتیس گڑھ کی بولی ہے۔ اس پر مراٹھی اور اڑیہ کا اثر ہے۔ مشرقی ہندی بولنے والوں کی تہذیبی زبان ہندی ہے۔ ماگدھی سے تعلق رکھنے والی زبانوں میں آسامی، بنگالی اور اڑیہ شامل ہیں۔ اڑیا ہندوستان کی اہم زبانوں میں شامل کی جاتی ہے جس میں مراٹھی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ آندھرا پردیش سے قربت کی وجہ سے تلگو الفاظ بھی داخل ہو گئے ہیں۔ اڑیا کی قواعد بنگالی سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ ماگدھی سے بہاری زبان کا بھی ارتقاء ہوا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کا خیال ہے کہ بہاری یہ

ذات خود کوئی زبان نہیں بلکہ یہ تین زبانوں یعنی میتھلی، مہگی اور بھوج پوری کا مجموعہ ہے۔ بہار میں تین رسم الخط رائج ہیں جس کی لکھائی، چھپائی دیوناگری میں ہوتی ہے۔ عام تحریروں میں کیتھی رسم الخط اپنایا جاتا ہے۔

بنگلہ ماگدھی اپ بھرنش کی خاص جانشین ہے۔ ادبی اعتبار سے ہندوستانی زبانوں میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ بنگلہ کا اڑیا پر بڑا اثر ہے۔ بنگلہ میں ''س'' کا تلفظ ''ش'' اور ''الف'' کو مختصر کرکے ''او'' سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس کی ادبی زبان سنسکرت سے بہت قریب ہے۔

16.8 جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی

جدید آریائی زبانوں کے دور کا آغاز 1000ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب شمالی ہند میں مختلف قسم کی سیاسی، تہذیبی اور لسانی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں اور ساتھ ہی مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے ایک نیا لسانیاتی نظام قائم ہوتا ہے جس کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اور زبان تیزی کے ساتھ اپنا چولہ بدلتی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ پورے چار سو سال تک پھلنے پھولنے کے بعد اپ بھرنشیں ایک ہزار تک ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ مختلف بولیاں لے لیتی ہیں جو بعد میں معیاری بننے کے بعد ایک نمایاں زبان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

1880ء میں سب سے پہلے مستشرق ہرنلے نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی ساخت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ہندوستان میں آریہ دو مختلف گروہوں میں آئے ہوں گے۔ آریوں کا دوسرا گروہ پہلے گروہ کے کافی عرصے کے بعد آیا ہوگا لیکن وہ ان سے ملتی جلتی آریائی زبانیں بولتا ہوگا۔ اس کے خیال میں آریوں کا دوسرا دَل پنجاب کے میدانوں کو پار کرتا ہوا گنگا کی وادی تک جا پہنچا ہوگا اور پہلے آریہ دَل کو مشرق اور مغرب کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ جب کہ گریرسن کا خیال ہے کہ نو وارد آریہ اپنا راستہ بند دیکھ کر پہلے آئے ہوئے آریوں کے چاروں طرف نیم دائرہ کی شکل میں پھیل گئے ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں آریوں کا ایک گروہ اندرونی کہلاتا ہے اور دوسرا گروہ بیرونی۔ اگر ہرنلے صحیح ہے تو نو وارد آریہ اندرونی کہلائیں گے اور اگر گریرسن صحیح تو پرانے آریہ اندرونی کہلائیں گے۔ اندرونی اور بیرونی تقسیم کا دھندلا سا عکس ''مہابھارت'' میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ پنچالوں اور کوروؤں کی لڑائی درحقیقت دو آبہ کے آریہ اور نو وارد آریوں کے درمیان سیاسی اقتدار کے لیے زور آزمائی تھی۔

گریرسن کی تقسیم زبان کے مطابق شمالی ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں دو گروہوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک اندرونی اور دوسری بیرونی۔ اندرونی زبانوں کا علاقہ مدھیہ دیش (مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب) کا علاقہ ہے۔ بیرونی گروہ کی زبانیں نیم دائرہ کی شکل میں مغربی پنجاب سے شروع ہو کر سندھ، مہاراشٹرا، وسطی ہندوستان، اڑیسہ، بہار، بنگال اور آسام تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ کی کڑی صرف گجرات میں ٹوٹتی ہے۔

(i) گریرسن کی گروہ بندی

گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل انداز میں کی ہے:

(i) بیرونی زبانیں : (الف) شمال مغربی شاخ۔ لہندا اور سندھی، (ب) جنوبی شاخ۔ مراٹھی، (ج) مشرقی

شاخ۔آسامی، بہاری، اڑیہ اور بنگالی۔

(ii) وسطی زبانیں : پوربی ہندی

(iii) اندرونی زبانیں : مغربی ہندی، پنجابی (مشرقی)، گجراتی، راجستھانی، بھیلی اور خاندیشی۔

(iv) اندرونی زبانیں : مشرقی پہاڑی، مغربی پہاڑی اور درمیانی پہاڑی۔

اندرونی اور بیرونی زبانوں کی یہ گروہ بندی گریرسن نے ہرنلے کے برعکس زبانوں کی ساخت اور ان کے کینڈوں پر غور کرنے کے بعد کی ہے۔اس کے بعض لسانی دلائل اس طرح ہیں:

(i) بیرونی زبانوں میں علامت ماضی /ل/ ہے لیکن اندرونی زبانوں میں مادے پر /الف/ کے اضافے سے ماضی مطلق بنتا ہے۔

(ii) اندرونی شاخ کی تمام زبانوں میں /س/ کا تلفظ صحیح ہوتا ہے جب کہ بیرونی زبانوں میں یہ عام طور پر /ش/ اور /ہ/ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

(iii) اندرونی زبانیں اپنی ساخت کے لحاظ سے تحلیلی ہیں جب کہ بیرونی زبانیں ترکیبی یا تالیفی۔

(iv) بیرونی زبانوں میں ضمائر متصل بھی استعمال ہوتے ہیں جب کہ اندرونی زبانوں میں ان کا وجود نہیں۔

(v) اندرونی زبانوں میں کسی دخیل کلمے میں دو مصوتوں کے درمیان /ت/ ہو تو وہ حذف ہو جاتا ہے۔بیرونی آوازوں میں /ت/ کی آواز برقرار رہتی ہے۔

گریرسن نے اپنی گروہ بندی کے سلسلے میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان سے کافی اختلاف کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں چٹر جی اور مزمدار پیش پیش ہیں۔مزمدار کا خیال ہے کہ ''گریرسن نے اپنے نظریے کی تائید میں فرہنگ اور صوتیات پر غیر معمولی زور دیا ہے جب کہ زبان کے کینڈے کو سمجھنے کے لیے ان سے کہیں زیادہ مدد اس کے صرفی اور نحوی قاعدوں سے ملتی ہے۔'' محققین نے لسانی دلائل کی روشنی میں گریرسن کے نظریے کا بطلان پیش کیا ہے۔

گریرسن نے جدید ہند آریائی کو شمال مغربی، جنوبی و مشرقی شاخ اور درمیانی زبان میں تقسیم کر کے بعد کے علما لسانیات کے لیے گروہ بندی کی راہ ہموار کر دی ہے۔اکثر علما لسانیات نے گروہ بندی کے سلسلے میں اندرونی بیرونی تقسیم سے تو اتفاق نہیں کیا ہے لیکن جغرافیائی بنیاد پر کی گئی گروہ بندی کی تقلید کی ہے۔

(ii) ڈاکٹر چٹر جی کی گروہ بندی

ڈاکٹر چٹر جی نے جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی اس طرح کی ہے:

(i) شمال مغربی زبانیں : لہندا اور سندھی۔

(ii) مدھیہ دیشی زبانیں : مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی اور پنجابی۔

(iii) مغربی زبانیں : مراٹھی۔

(iv) مشرقی زبانیں : بنگالی، بہاری، آسامی اور اڑیا۔

(v) شمالی زبانیں : نیپالی، دوسری پہاڑی زبانیں، گڑھوالی اور کمایونی۔
(vi) مخلوط زبانیں : مشرقی زبانیں۔

(iii) ڈاکٹر زور کی گروہ بندی

ڈاکٹر زور نے چٹرجی کی تقسیم میں کچھ ترمیم کرکے اس طرح گروہ بندی کی ہے:

(i) شمالی مغربی : مغربی پنجابی یا لہندا، مشرقی پنجابی، سندھی، چینی بولیاں، یوروپ اور ایشیاء کی دو شاخیں۔
(ii) جنوبی مغربی : (الف) راجستھانی زمرہ : مالوی، میواتی اور جے پوری۔
(ب) پہاڑی زمرہ : نیپالی، گڑھوالی، کماؤنی، منڈیالی اور سرموری۔
(iii) وسطی : مغربی ہندی
(i) شمالی مغربی زبانیں : لہندا اور سندھی۔
(ii) درمیانی زبانیں : (الف) مدھیہ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں پنجابی، رجستھانی، گجراتی اور پہاڑی بولیاں ہیں۔
(ب) بیرونی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں۔ پوری ہندی۔
(iii) شمالی مغربی زبانیں : لہندا اور سندھی۔
(iv) مشرقی زبانیں : پہاڑی، بنگالی، اڑیا اور آسامی۔
(v) جنوبی زبان : مراٹھی۔

جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی کی اجمالی تاریخ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گریرسن کی تقسیم سے عمومی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ استفادہ کرنے والے علمائے لسانیات نے اس گروہ بندی کی کوتاہیوں کی طرف اشارے بھی کیے ہیں لیکن انھوں نے اپنی تحقیقات کے لیے اس کے حوالوں کو بھی ضروری سمجھا ہے۔

16.9 مغربی ہندی اور اس کی بولیاں

شمالی ہند میں جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا 1000ء کے بعد ہوتا ہے جو اپ بھرنشوں کے اختتام کا بھی زمانہ ہے۔ جب اپ بھرنشوں کا وجود ختم ہوگیا تو 1000ء کے بعد سے ان علاقوں میں مختلف بولیوں کا وجود ہند آریائی زبانوں مثلاً اردو اور ہندی وغیرہ کے ارتقاء سے پہلے قائم ہو چکا تھا اور یہ زبانیں بعد میں انہی بعض بولیوں سے پیدا ہوئیں۔ یہ بولیاں دہلی اور اس کے قرب و جوار سے لے کر یوپی اور بہار تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ماہرین لسانیات نے ان بولیوں کا بغائر مطالعہ کیا اور ان کی لسانی بنیادوں پر درجہ بندی کی ہے۔ گریرسن ایک ایسا مستشرق گزرا ہے جس نے ہندوستانی زبانوں اور بولیوں کے بارے میں باریک اختلافات کا تجزیہ کرکے ان تمام بولیوں کو دو گروہوں میں منقسم کیا ہے۔ ایک مغربی ہندی اور دوسری مشرقی ہندی۔

مغربی ہندی

مغربی ہندی کی اصطلاح گریرسن نے ان بولیوں کے لیے استعمال کی ہے جو دہلی اورنواح دہلی اورمغربی یوپی کی بولیاں ہیں۔ان بولیوں کے حدودتقریباً وہی ہیں جوقدیم ہندآریائی دور میں مدھیہ پردیش کے یاوسطی ہندآریائی دور میں شورسینی پراکرت اورشورسینی اپ بھرنش کے تھے۔ان بولیوں کے شمال مغرب میں پنجابی،جنوب اورجنوب مشرق میں مراٹھی زبان کے علاقے ہیں۔اگرہم ہندآریائی زبانوں کی اندرونی اور بیرونی تقسیم کو مدنظر رکھیں تو مغربی ہندی کوہم خالص اندرونی زبان کہیں گے۔چوں کہ یہ مدھیہ پردیش کے علاقہ کی زبان ہے۔لہٰذا اسے ہندآریائی زبانوں کی بہترین نمائندہ زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔مغربی ہندی کےتحت گریرسن نے پانچ بولیوں کوشامل کیا ہے:

1۔ ہریانی،بانگڑو یاجاٹو

2۔ کھڑی بولی یاہندوستانی

3۔ برج بھاشا

4۔ قنوجی اور

5۔ بندیلی

مغربی ہندی کی بعض بولیوں میں کچھ ایسی صوتی،حرفی اورنحوی خصوصیات پائی جاتی ہیں جوانھیں دوسری بولیوں سے ممیّز کرتی ہیں۔ان خصوصیات میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مغربی ہندی کی تمام بولیوں کی قواعدکاعام رجحان تفصیلی ہے جو کھڑی بولی میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔لسانی اعتبار سے مغربی ہندی کی بولیوں کودوگروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلے گروہ میں کھڑی بولی اور ہریانی ہیں جن کے اسماء،صفات اورافعال''اَ''مصوتے پرختم ہوتے ہیں مثلاً میرا،گھوڑا، گیاوغیرہ۔

دوسرے گروہ میں برج بھاشا،قنوجی اور بندیلی ہیں جن کے اسماء،صفات اورافعال''اوٗ''مصوتے پرختم ہوتے ہیں مثلاً میرو،تیرو،گھوڑووغیرہ۔غالب کامصرع ہے:

ع میرا اسلام کہیو اگرنامہ بر ملے

ع بجا کہتے ہو،سچ کہتے ہو،پھرکہیو کہ ہاں کیوں ہو

(1)ہریانی

اس بولی کاتعلق دہلی کے شمالی اضلاع کرنال،رہتک اورحصار وغیرہ سے ہے۔دہلی میں یہ زبان''جاٹو'' کے نام سے مشہور ہے کیوں کہ آس پاس کے علاقے میں جاٹوں کی آبادی کثرت سے ہے۔گریرسن ہریانی کوکھڑی بولی کی ایک شاخ مانتے ہیں۔محمود شیرانی کا خیال ہے کہ ہریانی پرانی اردو کی ایک شکل ہے۔لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ہریانی ایک بولی ہے جواپنا الگ وجود رکھتی ہے۔دہلی کی زبان پرایک طرف کھڑی بولی کے اثرات ہیں تو دوسری طرف ہریانی بھی اسے متاثر کرتی رہی ہے کیوں کہ دہلی برج اور ہریانی کے سنگم پر واقع ہے۔ڈاکٹرمسعود حسین خاں نے دلائل کے ساتھ اردو پر ہریانی کے اثرات کی

وضاحت کی ہے۔

سیاسی اعتبار سے ہریانی کا علاقہ کافی اتھل پتھل کا رہا ہے جس کا اثر زبان پر بھی پڑا۔اس پر کھڑی، برج اور میواتی کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں اس لیے زبان کا معیار ایک عرصہ تک قائم نہ ہوسکا۔ کرتا اور کہتا کے ساتھ ساتھ کردا اور لہندا بھی مستعمل ہے اور پنجابی کی طرح /ڑ/ پر/ ڈ/ کو ترجیح دی گئی ہے مثلاً اساڑھ کے بجائے اساڈھ، بڑھنا کے بجائے بڈھنا، بھیڑ کے بجائے بھیڈ وغیرہ۔ ملا وجہی کی ''سب رس'' اور ''قطب مشتری'' میں چھوڑ کو چھوڈ، پڑھے کو پڈھا اور بڑے کو بڈا لکھا ہے جو بعینہٖ ہمیں ہریانی کے قدیم مصنف شیخ عبدی کے ''فقہ ہندی'' میں ملتے ہیں۔ اسم کی جمع بناتے وقت اس میں ''اں'' کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً کتاباں، لوگاں، عارفاں اور غریباں وغیرہ۔ ماضی مطلق بناتے وقت فعل میں ''یا'' کا اضافہ مثلاً چلیا، کریا، لکھیا وغیرہ۔ مصوتوں کو طویل بنا دیتے ہیں مثلاً راکھ (رکھ)، لاگا (لگا) وغیرہ۔ مصوتوں کو انفیانے کا عام رجحان ہے کونچ (کوچ)، توں (تو) وغیرہ۔ ہریانی میں ہکار آوازوں کو سہل بنا دیا جاتا ہے مثلاً بی (بھی)، مج (مجھ) اور کچ (کچھ) وغیرہ۔ ہریانی میں فعلیہ شکل آئے کر، جائے کر اور کھائے کر وغیرہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہریانی میں ''نے'' کا استعمال علامت فاعل اور مفعول دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ ''نے'' کے علاوہ ''کو'' کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً بالک نے دودھ پیا تھا (بچے نے دودھ پیا تھا) اور من نے کتاب پڑھنی ہے (مجھے کتاب پڑھنی ہے) وغیرہ۔ ہریانی میں ضمائر میں تم، ہم، تم، توں، اس، اُن، بو، جن، میرا اور تیرا وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔

(2) کھڑی بولی

مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کی طرح کھڑی بولی بھی نواح دہلی کی ایک ممتاز بولی ہے۔ یہ دہلی کے شمال مشرق میں جمنا پار کرنے کے بعد ملتی ہے۔ مغربی یوپی کے بیشتر اضلاع مثلاً میرٹھ، مظفرنگر، رام پور، مرادآباد اور بجنور اس بولی کے علاقے ہیں۔ میرٹھ، مظفرنگر اور سہارنپور کی کھڑی بولی مستند سمجھی جاتی ہے۔ باوجود یہ کہ ان جگہوں پر بھی لہجوں کا فرق آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ مظفرنگر کی طرف بڑھیں تو تشدید کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔

ان علاقوں کی کھڑی بولی کی سب سے بڑی خصوصیت افعال کی یہ صورت ہے کہ ''میں مارتا ہوں'' کے ساتھ میں ماروں ہوں، وہ مارے ہے، تو مارے ہے بھی ملتا ہے۔ اسماء کی جمع کھڑی میں ''اں'' لگا کر بنائی جاتی ہے مثلاً کتاباں، لوگاں وغیرہ۔ کھڑی بولی میں درمیانی ''ہ'' گرا دی جاتی ہے اور نفسی آوازیں اپنی ہیئت کھو دیتی ہیں۔ کاں (کہاں)، نئیں (نہیں) وغیرہ۔ مصوتوں کو انفیانے کا عام رجحان ہے مثلاً فاطماں، کونچ اور برسانت وغیرہ۔ مشدد کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ مثلاً کلّ، حرّ، ہتّی اور بتّی وغیرہ۔ کھڑی بولی میں مصوتوں کو مختصر اور مختصر کو طویل مصوتوں سے بدل دیا جاتا ہے مثلاً تلاب (تالاب)، کال (کل)، ماٹی (مٹی)، جناوار (جانور) وغیرہ۔ کھڑی میں انفیت کو حذف بھی کر دیا جاتا ہے مثلاً ما (ماں)، نید (نیند) وغیرہ۔ کھڑی ''ڑ'' اور ''ڑھ'' پر ''ڈ'' اور ''ڈھ'' کو ترجیح دیتی ہے۔ مثلاً بڈا، بڈھا، بڈھے وغیرہ۔ ضمائر کی مج، منج، تج، ہمنا، ہمن، تم، تمنا کی شکلیں ملتی ہیں۔ ساکن کو متحرک کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے مثلاً شَکَل، رَحَم وغیرہ۔ ''نے'' کا بے قاعدہ طور پر استعمال کھڑی میں ملتا ہے یعنی فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں آتا ہے مثلاً بندر نے اس نے دیکھ لیا (بندر نے اس کو دیکھ لیا) وغیرہ۔ کا، کی، کو، اس وغیرہ کی شکلیں کھڑی کے علاقوں میں جوں کی توں آج بھی موجود ہیں۔

کھڑی بولی کا ادبی روپ پندرہویں صدی سے قبل تقریباً صفر کے برابر ہے۔اس کے باوجود کھڑی بولی کے پٹ اپ بھرنشوں کی قدیم تصانیف میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ مسلمانوں کی آمد سے قبل میرٹھ اوراس کے مضافات میں بولی اور برتی جاتی تھی۔اس کی مقبولیت ہمہ گیر تھی۔اردو کا خمیر کھڑی بولی سے ہی تیار ہوا ہے اور گریرسن نے تو کھڑی بولی کے ادبی روپ کو ہی ''اردو'' کہا ہے۔بعض سیاسی اور تہذیبی اسباب کی بنا پر یہ بولی اپنے علاقے سے نکل کر دور دراز کے خطوں تک پہنچی۔ دراالسلطنت کی منتقلی کے ساتھ جو بولی شمال سے دکن پہنچی یہی کھڑی بولی تھی۔گریرسن اور دوسرے محققین نے اس کی مقبولیت کی وجہ سے اس کا نام ''ہندوستانی'' رکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا ''ہندوستانی'' نام بہت پہلے پڑ چکا تھا۔ملا وجہی نے اپنی کتاب ''سب رس'' میں اس زبان کو ''ہندوستانی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔کھڑی بولی کا ادبی روپ ''ادبی ہندوستانی'' بھی کہی جاتی ہے اور یہی ادبی ہندوستانی ''اردو'' کہلاتی ہے۔

(3)بندیلی

بندیلی، بندیل کھنڈ کے علاقے میں بولی جاتی ہے اوراس میں ہمیر پور، باندہ، جالون اور جھانسی کے اضلاع اور سنٹرل انڈیا کی اکثر سابق ریاستیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ بندیلی مین پوری،شمالی آگرہ اور ایٹہ تک کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ اس کے مشرق میں پوربی ہندی کی بگھیلی بولی ہے۔شمال اور شمال مغرب میں یہ قنوج اور برج بھاشا سے گھری ہے۔اس کے جنوب مغرب میں راجستھان کی بولیاں ہیں اور جنوب میں اس کے حدود مراٹھی سے ملتے ہیں۔ بندیلی بولی میں غیر معمولی یکسانیت پائی جاتی ہے۔اس میں ادب کا بھی دقیق سرمایہ ملتا ہے۔آلہا اودل کے گیت پہلے پہل اسی بولی میں لکھے گئے۔اس کے علاوہ شاعر اور تنقید نگار کیشو داس اور پدماکر کا تعلق بھی اسی بولی سے ہے۔

بندیلی میں چند ایسی لسانی خصوصیات ہیں جو اسے دوسری بولیوں سے ممیّز کرتی ہیں۔اس میں حروف ''اے'' اور ''او'' چھوٹے ہو کر ااور اُو بن جاتے ہیں مثلاً بٹی سے بیٹا (بٹیّا نہیں) اور گھوڑے سے گھروا (گھوروا نہیں)۔ برج کی طرح /ڑ/ عموماً /ر/ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔مثلاً پرو (پڑو) اور دورکے (دوڑکے) وغیرہ۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں دوسری بولیوں کے طویل مصوتے بندیلی میں مختصر ہو جاتے ہیں اور دوہرے مصوتے اکہرے بن جاتے ہیں۔مثلاً پیسہ، کیسا اور تیرنا وغیرہ۔اس کے علاوہ درمیانی ''ہ'' ہمیشہ گرادی جاتی ہے۔مثلاً کئی (کہی)، وئی (وہی) اور رئی (رہی) وغیرہ۔

(4)قنوجی

قنوجی شہر کے نام پر اس کا قنوجی نام پڑا جو اپنی اصلی حالت میں ایٹہ،فرخ آباد،شاہ جہاں پور کے اضلاع میں پائی جاتی ہے۔ یہ کانپور اور ہردوئی تک پھیلی ہوئی ہے۔لیکن کانپور میں یہ بندیلی سے اور ہردوئی میں اودھی سے متاثر نظر آتی ہے۔شاہ جہاں پور کے شمال میں یہ پیلی بھیت تک بولی جاتی ہے۔ جہاں یہ برج بھاشا سے گھل مل جاتی ہے۔اس کے مغرب اور شمال مغرب میں برج بھاشا اور جنوب میں بندیلی ہے۔مشرق اور شمال مشرق میں یہ اودھی بولی سے گھری ہوئی ہے۔قنوجی برج بھاشا سے بہت قریب ہے۔ادبی لحاظ سے قنوجی نے زیادہ ترقی نہیں کی اسی لیے گریرسن اسے الگ بولی تسلیم کرنے سے گریز کرتا ہے۔قنوجی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دو حروف کے درمیان والی /ہ/ گرادی جاتی ہے۔مثلاً کئی او (کہی ہو)۔بعض اس کے الفاظ ''وا'' پر

بھی ختم ہوتے ہیں۔مثلاً گھوڑو(گھوڑا)اور گھروا(گھر)وغیرہ۔

(5) برج بھاشا

برج بھاشا کو مغربی ہندی کی سب سے اہم بولی کہا گیا ہے۔ مغربی ہندی کی بعض بولیوں کے برعکس برج بھاشا کو ایک عرصہ تک کافی اہمیت حاصل تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ عرصہ تک یہ ادب کی زبان تھی اور دوسری بولیوں کے ادبی نمونے اس کے بعد وجود میں آئے۔ بھگتی تحریک کا پرچار اسی زبان میں ہوا کیوں کہ اس تحریک کا مرکز متھرا تھا۔علاوہ ازیں راجدھانی کی دلی سے آگرہ منتقلی سے برج بھاشا کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی۔جس کے باعث اس کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی گئی۔اس بولی میں شاعری کی روایت بہت پختہ اور قدیم ہے۔عبدالرحیم خانخاناں، برج بھاشا کا شاعر تھا۔خود اکبر نے برج بھاشا میں شاعری کی ہے۔ نامدیو، گرونانک اور کبیر کے کلام میں بھی برج کے اثرات ہیں۔اس بولی کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ محمد حسین آزاد نے اردو کا ماخذ اسی بولی کو قرار دیا۔

جہاں تک برج بھاشا کے علاقے کا سوال ہے یہ بولی دہلی کے جنوب مشرق میں بولی جاتی ہے اور اس میں آگرہ، بھرت پور، دھولپور، گوالیا اور متھرا کے ساتھ ساتھ اس کی سرحدیں علی گڑھ، ایٹہ اور مین پوری سے بھی جاتی ہیں۔متھرا کی بولی معیاری مانی جاتی ہے جو کہ ہندو تہذیب وتمدن کا مرکز ہونے کے علاوہ سنسکرت زبان کا بھی گہوارہ رہا ہے۔

برج بھاشا کی چند ایسی لسانی خصوصیات ہیں جو اسے دوسری بولیوں سے ممیّز کرتی ہیں۔ برج کے اسماء، صفات اور افعال ''او'' مصوتے پر ختم ہوتے ہیں۔مثلاً تیرو، گھوڑو، مارو اور آئیو وغیرہ۔اسماء کی جمع بنانے کے لیے برج میں ''ن'' کا اضافہ کرتے ہیں۔مثلاً گھورن (گھوڑوں) وغیرہ۔واحد متکلم برج میں ''میں'' اور ''ہوں'' دونوں مستعمل ہیں۔مستقبل برج بھاشا میں ''گ'' اور ''ہ'' کی مختلف شکلوں سے بناتے ہیں جیسے چلی ہوں (چلوگی) وغیرہ۔ضمائر میں تیرو، تمھارو، تارو، تاہیں، توہی، تیراؤں اور مصرےوغیرہ ملتے ہیں۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ لسانی اعتبار سے مغربی ہندی ان بولیوں کا مجموعہ ہے جو شمالی ہند کے ایک بڑے حصے میں پھیلی ہوئی ہے۔جس میں دہلی، دہلی کے شمال مغرب اور جنوب مغربی خطے بیشتر مغربی یوپی ہیں۔ یہ بولیاں ان طاقتوں میں بولی جاتی ہیں جو سیاسی امتیاز سے بہت اہم رہے ہیں اور یہاں کے رہنے والوں نے بیشتر ادبی، تہذیبی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔

16.10 خلاصہ

اردو اور ہندی کا جس خاندان سے تعلق ہے وہ ہند یوروپی ہے۔ ہندوستان میں آکر یہ خاندان اپنے ارتقائی دور میں ایرانی سے گزر کر ہند آریائی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جسے ہم قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی میں تقسیم کرتے ہیں۔

قدیم ہند آریائی کا عہد 1500 ق م سے 500 ق م تک شمار کیا جاتا ہے۔اس دور میں ویدک اور سنسکرت زبانوں کا

رواج رہا۔آریاؤں کے مقامی لوگوں سے میل جول کے نتیجے میں سنسکرت زبان، مقامی زبانوں اور بولیوں سے متاثر ہوتی رہی۔ سنسکرت کے عالموں نے اس زبان کے معیاری الفاظ اور لب ولہجہ کو نئے سرے سے منظم کر کے اسے ''شدھ'' اور ''پاک'' کیا۔اسی لیے اسے سنسکرت کا نام دیا جس کے معنی ''پاک کیے ہوئے'' کے ہیں۔

وسطی ہند آریائی کا عہد 500 ق م سے 1000ء تک کا زمانہ ہے۔ جسے ماہرین نے اس کے ارتقائی خصوصیات کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں ''پالی'' عوام کی مقبول زبان رہی ہے جس میں جین مت اور بدھ مت کی تعلیمات ملتی ہیں۔دوسرا دور مسیحی سنہ کی ابتدا سے 500ء تک شمار کیا جاتا ہے۔اس دور میں پانچ پراکرت زبانوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ ان میں (1) مہاراشٹری، (2) شورسینی، (3) مگدھی، (4) اردھ مگدھی اور پشاچی شامل ہیں۔

تیسرا دور 500ء سے 1000ء پر محیط ہے۔یہ دور اپ بھرنش کا دور ہے۔ ہندوستان کی جدید زبانیں اپ بھرنش ہی سے پیدا ہوئیں۔اپ بھرنش سے تعلق رکھنے والی شورسینی اپ بھرنش کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔شورسینی اپ بھرنش میں چار اہم بولیاں آتی ہیں۔ان میں کھڑی بولی، راجستھانی، پنجابی اور گجراتی شامل ہیں۔

جدید ہند آریائی کے آغاز کا زمانہ 1000ء سے تاحال مانا جاتا ہے۔یہ زمانہ ہندوستان میں مختلف لسانی، تہذیبی اور سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ رہا ہے۔اس زمانے میں سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں اور ان کے میل جول سے ہندوستانی زبانوں میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ان کی الگ الگ لسانی خصوصیات کی وجہ سے سنیتی کمار چٹرجی نے جدید ہند آریائی زبانوں کو مختلف علاقوں میں تقسیم کیا ہے۔ان میں مغربی ہندی کو اردو کے ارتقا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں جو دوآبے کی شورسینی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہیں۔پہلی کھڑی بولی، دوسری ہریانوی، تیسری برج بھاشا، چوتھی قنوجی اور پانچویں بندیلی۔کھڑی بولی پر اردو کی بنیاد قائم ہے۔دیگر چار بولیوں کا اثر بھی کم وبیش اردو پر کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔

16.11 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ ہند آریائی کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

2۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد پر مدلل بحث کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ مغربی ہندی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ آریوں کے وطن کی نشان دہی کیجیے۔

3۔ وسطی ہند آریائی دور کی وضاحت کیجیے۔

16.12 سفارش کردہ کتابیں

1۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ : پروفیسر احتشام حسین
2۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو : پروفیسر مسعود حسین خان
3۔ ہندوستانی لسانیات : ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
5۔ ہند آریائی اور ہندی (ترجمہ عتیق احمد صدیقی) : سنیتی کمار چٹر جی

اکائی 17 اردو اور پنجابی

ساخت

17.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو اردو اور پنجابی کے رشتے سے واقف کرانا ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- پنجاب میں مسلمانوں کی آمد کے تاریخی پس منظر کی وضاحت کر سکیں
- پنجابی زبان کی اصل پر روشنی ڈال سکیں
- پنجابی اور لہندا کے فرق کو واضح کر سکیں
- پنجابی زبان کی خصوصیات کی وضاحت کر سکیں اور
- اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے کی وصاحت کر سکیں۔

17.1 تمہید

انسانی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی ان کے تہذیبی اور تمدنی اختلافات کے ساتھ زبانوں میں بڑا فرق ملتا ہے۔ جن کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کا شمار کرنا نہایت دشوار ہے لیکن تھوڑی سی کاوش کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے بعض زبانیں آپس میں کافی مماثلت رکھتی ہیں ان کو ایک خانے میں رکھا جا سکتا ہے اور اس طرح زبانوں کی گروہ بندی کا سلسلہ آسان ہو جاتا ہے۔ تاہم علمائے لسانیات زبانوں کی گروہ بندی کے سلسلے میں متفق نہیں۔ کچھ لوگوں نے زبانوں کی تقسیم ملکوں کے جغرافیائی حدود کی بنا پر کی تو کچھ لوگوں نے مذہب کو بنیاد بنا کر اس کی گروہ بندی کی۔ کچھ لوگوں نے عہد اور زمانے کے لحاظ سے اس کی گروہ بندی کی ہے لیکن زیادہ تر علمائے لسانیات نے زبانوں کی گروہ بندی ان کی ساخت یا بناوٹ کی بنا پر اور خاندانوں کی بنا پر کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ اردو اور پنجابی کے رشتے کو بھی ہم خاندان یا گروہ کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔

لفظ پنجابی کا اطلاق عام طور پر ان تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے لے کر ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہیں۔ گریرسن نے وضاحت کی تھی کہ لاہور کے مغرب میں بولی جانے والی زبان ساخت کے لحاظ سے اندرونی بولیوں سے مختلف ہے۔ وہ اس زبان کو مغربی پنجابی کا نام دیتا ہے۔ مغربی پنجابی اور مشرقی پنجابی میں امتیاز کرتے ہوئے ظاہر کیا گیا کہ دونوں میں کوئی امتیاز نہیں۔ پنجابی پورے پنجاب کی زبان بھی نہیں ہے۔ یہ مشرقی پنجاب، بیکانیر کے شمال اور جموں کے جنوبی اضلاع کی زبان ہے۔ مغرب میں یہ مغربی پنجابی، شمال اور شمال مشق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں باگر اور بیکانیر کی بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ اردو زبان پر پنجابی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اس اکائی میں ہم اردو اور پنجابی کی مماثلتوں پر مفصل بحث کرنے کے علاوہ ماہرین لسانیات کے نظریات سے بھی واقف ہوں گے۔

17.2 پنجابی زبان کا تعارف

پنجابی ہندوستان کی ایک قدیم زبان ہے۔ علاقہ پنجاب میں بولی جاتی ہے اور اسی نسبت سے پنجابی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ پنجابی کا سرمایہ ادب بڑا وسیع ہے اور ناقابل فراموش ہے۔ لہذا اس بات کی اہمیت مسلمہ ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد مقامی لوگوں سے ان کا پہلا سابقہ پنجاب کے علاقہ سے ہی پڑا۔ جہاں قدیم پنجابی ''عوامی زبان'' کی حیثیت سے رائج تھی۔

حضرت امیر خسرو اس کو ''لاہوری'' کے نام سے یاد کرتے ہیں جب کہ ابوالفضل اسے ''ملتانی'' کا نام دیتے ہیں۔ مغربی مورخین نے شمالاً اور جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی و مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا رکھا ہے۔ پنجابی کو وہ مغربی ہندی کے خاندان میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھ اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع واری سطح پر مقامی خصوصیت کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے اور یہ تقسیم ہر حال میں درست نہیں ہے۔

لفظ ''پنجابی'' کا اطلاق عام طور پر ان تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے لے کر ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہے۔ سب سے پہلے گیریرسن نے اس بات کو واضح کیا تھا کہ لاہور کے مغرب میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے اندرونی بولیوں سے مختلف ہے۔ وہ اس زبان کو مغربی پنجابی کا نام دیتا ہے اور اسے بیرونی زبانوں کی فہرست میں رکھتا ہے۔ اس طرح اس نے مغربی پنجابی اور مشرقی پنجابی میں امتیاز کیا ہے۔ یہ مشرقی پنجاب، بیکانیر کے شمال اور جموں کے جنوبی اضلاع کی زبان ہے۔ مغرب میں پنجابی، شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں باگر اور بیکانیر کی بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مشرق میں اس کے حدود کھڑی بولی اور ہریانی سے ملتے ہیں۔ پنجابی ہی کی ایک شاخ ڈوگری ہے جو جموں میں رائج ہے۔ سکھ مت کی وجہ سے پنجابی کو بہتر ترقی ہوئی۔ انھوں نے اس کے لیے گرمکھی رسم الخط اختیار کیا۔ امرتسر ضلع گرداس پور کی پنجابی معیاری سمجھی جاتی ہے۔ پنجابی شاہ مکھی (فارسی نستعلیق)، گرمکھی اور دیوناگری تینوں رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ پنجابی اور مغربی ہندی کی بولیوں کے درمیان حد بندی دریائے گھگھر سے کی جاسکتی ہے۔

17.3 پنجابی کے لغوی معنی

''پنجابی'' کا لفظ پنجاب سے ماخوذ ہے جو دو فارسی الفاظ پنج اور آب کا مرکب ہے۔ پنج کے معنی پانچ اور آب کے معنی پانی ہے۔ اس طرح پنجاب کے لفظی معنی پانچ پانیوں کے ہیں جس سے مراد دریائے سندھ کے پانچ مشرقی معاون دریا ہیں۔ اس علاقے کو یہ نام وسط ایشیا کے ترک و فارسی فاتحین نے دیا۔ یہ دراصل سنسکرت لفظ ''پنچ ندا'' کا فارسی ترجمہ ہے۔ جس کے معنی تھے پانچ ندیوں کا علاقہ۔ بعد کے زمانے میں اس علاقے کی زبان کا نام بھی پنجابی ہو گیا۔

موجودہ زمانے میں پنجابی زبان دو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ہندوستان میں گورمکھی رسم الخط جو لہندا سے ماخوذ ہے اور پاکستان میں شاہ مکھی رسم الخط میں جو فارسی نستعلیق خط سے ماخوذ ہے۔

پنجابی کی متعدد علاقائی بولیاں ہیں جن میں ماجھی (معیاری پنجابی)، شاہ پوری، مالوائی، دوآبی، پوادھی، جھنگوچھی (چنگوی)، جسگلی (رچنادی)، چنادری اہم ہیں۔

سرزمین پنجاب ایک قدیم ترین خطہ ہے جو زمانہ قدیم میں ابتدائی تہذیب کا عظیم الشان گہوارہ تھا۔ یہاں کئی تہذیبوں نے جنم لیا۔ پروان چڑھیں اور گردش زمانہ کے ہاتھوں تہس نہس ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ ان کے آثار کئی جگہوں سے دریافت ہوئے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ مٹی کی ان تہوں سے تاریکی کے دبیز پردے ہٹا کر زمانہ قبل تاریخ کے تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انہی آثار و شواہد کو پیش نظر رکھ کر تہذیبی ترقی کے مختلف ارتقائی مدارج کا زمانہ متعین کیا جاسکتا ہے۔

آثار قدیمہ سے برآمد شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اولین آدم نے اسی سرسبز و شاداب خطہ زمین کو اپنا مسکن بنایا۔ تاریخی اعتبار سے قدیم ترین معاشرت کے آثار خطہ پوٹھوار میں ملتے ہیں۔ راولپنڈی کے قریب دریائے سوات کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پتھر کے ایسے اوزار ملے ہیں جن کی تاریخ پانچ لاکھ سال سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ژیل یونی ورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر ڈاکٹر ڈیوڈ مل نے پوٹھوار کے علاقے سے دریافت شدہ نشانات کو ایک کروڑ سال پیش تر کا بتایا ہے۔ یہ قدیم حجری ثقافت کے آثار ہیں۔

پنجاب، برصغیر پاک و ہند کا وہ علاقہ ہے جس میں دریائے ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم بہتے ہیں۔ یہ سب دریا مٹھن کوٹ کے مقام پر دریائے سندھ میں آ کر گرتے ہیں جو پنجاب کی مغربی حدود بناتا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کا جو علاقہ شرقاً غرباً انبالہ سے اٹک تک اور شمالاً جنوباً اسلام آباد سے بہاول پور تک پھیلا ہوا ہے۔ پنجاب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پنجاب کی حدود مختلف ادوار میں مختلف رہی ہیں۔ کبھی تو اس کی حدیں ایک طرف سرہند تشریف سے درہ خیبر تک اور دوسری جانب کشمیر سے کراچی کے ساحل تک پھیل گئیں اور کبھی صرف لاہور کی عمل داری کو صوبہ پنجاب کہا جاتا رہا۔ آج کہ اس کا مغربی حصہ پاکستان کے موجودہ صوبہ پنجاب پر مشتمل ہے اور مشرقی حصہ ہندوستان کے تین صوبوں (ہماچل پردیش، ہریانہ، پنجابی صوبہ) میں منقسم ہو چکا ہے۔

قدیم زمانے سے یہاں مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگ آباد ہوتے رہے ہیں۔ ان میں آریا، یونانی، ایرانی، عرب، ترک اور منگول یکے بعد دیگرآئے۔ رفتہ رفتہ ان کی نسلیں آپس میں ملتی گئیں۔ پانچ دریاؤں کی یہ سرزمین جسے ہم آج کل پنجاب کہتے ہیں۔ مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے متعارف رہی۔ مثلاً ھپتہ ہندو، سپت سندھو، پنج دوآب، پنجاب تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل زرتشت مذہب کی مقدس کتاب ''اوستا'' (جو 560 ق م اور 330 ق م کے درمیان لکھی گئی) میں اس سرزمین کو ''ھپتہ ہندو (سات دریاؤں کی سرزمین) کہا گیا ہے۔ ''سپت سندھو'' کا ذکر آریاؤں کی متبرک کتاب ''رگ وید'' (جو 1000 ق م کے لگ بھگ مرتب ہوئی تھی) میں آیا ہے۔ ''سپت سندھو'' یا ''ھپتہ ہندو'' سے مراد سات دریاؤں (ستلج، بیاس، راوی، چناب، جہلم، سندھ، کابل) کی سرزمین ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے اس سرزمین کا نام پانچ دریاؤں کی نسبت سے ''پنجاب'' رکھ دیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نام اسے مسلمانوں نے دیا۔ لیکن حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ ''ایرانیوں نے اپنے اپنے وطن کے پانچ دریاؤں کی یاد میں پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقہ کا نام بھی پنجاب رکھ دیا۔ (پنجاب میں اردو، ص: 5)، (اردو کی منظوم داستانیں، ص: 30)، (تاریخ سندھ، ص: 1)

17.4 پنجابی کی ابتدا

پنجابی زبان کی ابتدا اور بناوٹ کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض محققین کی تحقیق کے مطابق پنجابی زبان، سنسکرت زبان کی وارث ہے۔ ان کے خیال کے مطابق جب ''چار ہزار سال قبل آریا یہاں وارد ہوئے تو ان کے ساتھ یہاں پر آریا تہذیب اور سنسکرت زبان پھیلتی گئی۔ جب سنسکرت بگڑی تو پراکرت بنی اور پراکرت سے اپ بھرنش اور اس سے پنجابی۔

پنجابی زبان اولاً پراکرت پھر اپ بھرنشوں کے توسط سے سنسکرت زبان سے نکلی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں چھٹی قبل مسیح سے سنسکرت سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں نشوونما پانے لگیں۔ ان بولیوں کو مجموعی طور پر پراکرت کہا جاتا ہے۔ ان پراکرتوں میں ایک اہم پراکرت شورسینی پراکرت تھی جو ہندوستان کے شمال اور شمال مغربی حصے میں بولی جاتی تھی۔ پنجابی اور مغربی ہندی کی بولیاں اسی پراکرت سے نکلی ہیں۔ بعد کے زمانے میں شمالی ہند میں شورسینی پراکرت سے شورسینی اپ بھرنش نکلی۔

پنجابی ایک اپ بھرنش کے طور پر ابھری اور دسویں صدی ہجری کے آتے آتے مستحکم ہوگئی۔ دسویں صدی تک کئی ناتھ پنتھی شاعر پنجابی زبان میں ادب کے اولین نمونے تخلیق کرنے لگے تھے۔

17.5 پنجابی اور لہندا

علاقہ پنجاب کی زبان پنجابی کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور ابوالفضل ملتانی کہتے ہیں۔ مغربی مورخین نے شمالاً و جنوباً ایک خط کھینچ کر مشرقی و مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا ہے۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی مقرر کیا گیا ہے اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا۔ وہ پنجابی کو مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں۔ اہل پنجاب نے اس فرق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ہر ضلع کی مقامی خصوصیت کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے اور یہ تقسیم ہر حال میں ناجائز ہے۔

پنجابی اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبہ کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور ہے بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے۔ ادھر دریائے گھگر تک پہنچ گئی تو وہ دوسری طرف دریائے سندھ پار کر گئی تھی۔ ایک اہم مغربی عقیدہ یہ بھی ہے کہ پنجابی زبان کا ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ ایک زمانہ میں تمام مشرقی پنجاب پر پھیل گئی تھی اور اس صوبہ کی اصل زبان لہندا کو ہٹاتی ہوئی یا اس پر چھائی ہوئی دریائے چناب تک پہنچ گئی تھی یہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس کا اثر جہلم تک محسوس کیا گیا تھا۔ ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے۔ سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہونے لگے تھے۔ بارہویں صدی میں سکھ مت کے افراد پنجاب سے نکل کر اردو و بانگڑو اور بیکانری علاقوں میں رسائی حاصل کی۔ ان واقعات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے ڈھکیلنے کا کوئی مناسب موقعہ نظر نہیں آیا تھا۔

17.6 پنجاب میں مسلمانوں کی آمد

عرب اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات نہایت قدیم ہیں۔ یہ اسلام کے آغاز سے قبل کے زمانے سے قائم ہیں۔ کارومنڈل، مالابار اور جنوبی ہند کے بعض دوسرے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی آمد و رفت سے قطع نظر سب سے پہلے مسلمان بڑی تعداد میں محمد بن قاسم کی قیادت میں بری و بحری راستوں سے 711ء میں سندھ میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہاں کا حکمراں راجا داہر تھا۔ عربوں نے پہلے دیول (سندھ کا بندرگاہ) کے قلعے کو فتح کیا، پھر آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ پورے سندھ کو فتح کر کے اسے اسلامی حکومت کا ایک صوبہ بنالیا۔ یہ مسلمان عرب تھے اور جو زبان بولتے ہوئے وہ یہاں آئے تھے وہ عربی تھی۔ چند وجوہ سے وہ پورے ملک میں نہ پھیل سکے اور تقریباً تین سو سال تک وادی سندھ میں ہی مقیم رہے۔ اس طویل عرصے کے دوران عربوں

اور مقامی باشندوں کے درمیان میل جول اور سماجی روابط بڑھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید سلیمان ندوی (م 1953ء) اپنی تصنیف ''نقوش سلیمانی'' (1939ء) میں اردو کی جائے پیدائش وادی سندھ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> **''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''**

لیکن اگر خالص علمی اور لسانیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس بیان میں ذرا بھی صداقت نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے سندھ کی تہذیب و معاشرت کے علاوہ وہاں کی زبان کو بھی متاثر کیا، لیکن وہ زبان اردو نہ تھی بلکہ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی زبان میں ہمیں عربی کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ اس زبان پر عربی کا اثر یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے عربی زبان کے رسم خط کو بھی اپنا لیا۔ علمی اعتبار سے ہم بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عربوں نے وادی سندھ میں اپنے قیام کے دوران کسی نئی زبان کو جنم نہیں دیا، ہاں اس خطہ ارض میں بولی جانے والی زبان کو متاثر ضرور کیا۔ غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ اردو زبان کے آغاز کا کوئی نظریہ نہیں بلکہ محض قیاس آرائی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی اس قیاس آرائی کو اردو کے لسانیاتی ادب میں زیادہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

دوسری بار مسلمان دسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں غزنی کے بادشاہ امیر سبکتگین کی سرکردگی میں درہ خیبر سے ہوکر پنجاب میں داخل ہوئے۔ امیر سبکتگین غزنی کے ترک بادشاہ امیر الپتگین کا بیٹا تھا۔ وہ الپتگین کی وفات (977ء) کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا تھا۔ اس نے بیس سال تک (977ء تا 997ء) حکومت کی۔ ان دنوں ہندوستان میں دہلی سے لے کر کابل کے نزدیک تک راجا جے پال کی حکومت تھی جس کا دارالخلافہ لاہور تھا۔ امیر سبکتگین نے راجا جے پال کی فوجوں کو شکست دے کر پشاور اور پنجاب کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ 997ء میں جب امیر سبکتگین کا انتقال ہوا تو نہ صرف زمانہ حال کا پورا افغانستان بلکہ تقریباً پورا پنجاب بھی اس کے زیر نگیں تھا۔

امیر سبکتگین کی وفات (997ء) کے بعد اس کے فرزند و جانشین سلطان محمود غزنوی (م 1030ء) کے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر پے در پے حملوں (1001ء تا 1027ء) کا سلسلہ شروع ہوا۔ محمود غزنوی کا سب سے پہلے مقابلہ 1001ء میں راجا جے پال سے ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے آنند پال نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ محمود غزنوی کو آنند پال سے بھی مجبوراً جنگ کرنی پڑی جس کے نتیجے میں لاہور پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ محمود غزنوی نے لاہور کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے وہاں ایک ترکی حاکم مقرر کر دیا اور خود 1027ء میں غزنہ واپس چلا گیا جہاں 1030ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ غزنوی سلطنت کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ مسلمان سارے پنجاب میں پھیل گئے۔ یہ وادی سندھ میں وارد ہونے والے عرب مسلمانوں کے برخلاف فارسی بولتے ہوئے آئے تھے۔ ان میں کچھ کی مادری زبان ترکی بھی تھی کیوں کہ سلطان محمود غزنوی خود ایک ترکی النسل بادشاہ تھا (اگرچہ اس کی ماں ایرانی تھی)۔ پنجاب میں مسلمان نے تقریباً دو سو سال تک قیام کیا۔ اس مدت میں ان کے اور اہل پنجاب کے درمیان مضبوط سماجی روابط قائم ہو گئے۔ اسی گہرے میل جول اور مضبوط سماجی روابط کی بنیاد پر حافظ محمود خاں شیرانی (م 1946ء) نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ زبان جسے ہم ''اردو'' کہتے ہیں سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہیں سے ہجرت کر کے دہلی پہنچی۔

آریا اپنے ساتھ ویدک سنسکرت لائے تھے یعنی وہ سنسکرت جس میں رگ وید، اتھروید، یجر وید اور سام وید لکھے گئے۔ جب آریاؤں کو یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو وہ مقامی زبان سے متاثر ہونے لگے۔ مقامی اثرات سے بچانے کے لیے یاسک (700 ق م)، پانِنی (500 ق م) اور پتنجلی (150 ق م) نے سنسکرت کی گرامر لکھیں۔ ان قواعد کے سانچے میں جو زبان ڈھالی گئی اسے کلاسیکی سنسکرت یا صرف سنسکرت کہا جاتا ہے۔ سنسکرت کے معنی سنواری اور تراشی ہوئی زبان ہے۔ سنسکرت کے قواعد نویسیوں نے یہاں کی مقامی زبان کو پراکرت کا نام دیا جس کے معنی خودرو اور فطری یعنی جو عام لوگوں کی زبان ہو۔ سنسکرت ایک خاص طبقے کی زبان بن کر رہ گئی۔ پراکرتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا گیا۔ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ (483 ق م تا 563 ق م) اور جین مت کے بانی (527 ق م تا 599 ق م) نے اپنے اپنے مذاہب کی تبلیغ کے لیے لوک بولیوں (پراکرت) کا انتخاب کیا۔ گوتم بدھ کے زمانے میں جس پراکرت کا زور تھا اس کو پالی پراکرت کہا جاتا تھا۔ گوتم بدھ نے اپنا پرچار پالی پراکرت میں کیا۔ پالی کو شمالی ہند میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس کے بعد برصغیر پاک و ہند میں پراکرتوں کا عروج شروع ہوا۔ چار پراکرتیں بہت مشہور ہوئیں جس کے نام مہاراشٹری، مگدھی، شورسینی اور پشاچی تھے بعد میں یہ اپ بھرنش کا روپ دھار گئیں۔ (اپ بھرنش کے معنی بگڑی ہوئی، گری ہوئی بولی۔ یہ وہ مقامی زبانیں ہیں جو کہ بنیادی طور پر سنسکرت سے اختلاف رکھتی ہیں)۔ اس طرح چار اپ بھرنش سامنے آئیں (1) مہاراشٹری اپ بھرنش، (2) مگدھی اپ بھرنش، (3) شورسینی اپ بھرنش، (4) پشاچی اپ بھرنش۔ قدیم زمانے میں پنجاب کو پشاچی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اس لیے اس علاقہ کی زبان کو پشاچی اپ بھرنش کہا گیا ہے۔ اسی سے ''پنجابی'' کا روپ نکھر کر سامنے آیا ہے۔

17.7 پنجابی پر عربی اور فارسی کا اثر

دسویں صدی کے اواخر میں برصغیر ہند میں مسلمانوں کی آمد اور ان کی فتوحات سے پنجاب کے علاقے میں عربی اثرات کی کارفرمائی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے کچھ صدیوں بعد وسط ایشیا سے تعلق رکھنے والے ترک اور افغان حکمران خاندانوں کے اقتدار سے جن میں محمود غزنوی بھی شامل ہے، برصغیر میں فارسی زبان کے قدیم جمنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد پنجابی زبان میں متعدد عربی اور فارسی الفاظ شامل ہونے لگتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کے مقابلے میں پنجابی میں عربی اور فارسی الفاظ نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں اس کی ایک اہم وجہ وسط ایشیا سے علاقہ پنجاب کی قربت بھی ہے۔

17.8 پنجابی زبان کی خصوصیات

پنجابی زبان کے لیے دو طرز تحریر موجود ہیں۔ ہندوستان میں اسے گرمکھی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے جب کہ مغربی پنجاب (پاکستان) میں اس کے لیے شاہ مکھی (فارسی نستعلیق) رسم الخط اختیار کیا گیا ہے۔ اسے استعمال کرتے ہوئے اس میں ایک حرف کا اضافہ کرلیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پانچ حرف ایسے ہیں جن کا تلفظ اردو سے مختلف کیا جاتا ہے۔ وہ حرف یہ ہیں:

بھ جھ دھ ڈھ گھ

ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

بھ : اسے پنجابی میں ''پ'' کی آواز کے قریب رکھ کر بولا جاتا ہے جیسے کہ بھرا، بھین، بھنڈی، بھنڈار جیسے الفاظ جنھیں پنجابی میں پرا، پئن، پنڈی، پنڈار کی طرح بولا جاتا ہے لیکن ''پ'' کی آواز کے ساتھ ''ہ'' کی آواز مخلوط ہوتی ہے۔کسی پنجابی کو بولتے ہوئے سن کر اس کا تلفظ درست کیا جاسکتا ہے۔غیر پنجابی کے لیے ان کا تلفظ ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن کسی قدر توجہ اور کوشش سے اس کو اچھی طرح ادا کر سکیں گے۔دیگر مندرجہ ذیل ہیں۔

جھ : اسے پنجابی میں ''چ'' کی آواز کے قریب رکھ کر بولتے ہیں جیسے جھنڈا، جھاڑو، جھگ، جھنگ سے الفاظ میں جن کا پنجابی تلفظ چنڈا، چاڑو، چگ، چنگ کے نزدیک ہوتا ہے۔

دھ : اسے پنجابی میں ''ت'' کی آواز کے نزدیک بولا جاتا ہے جیسے کہ دھند، دھندا، ڈھائی، ڈھیر جیسے الفاظ میں جنھیں ہم پنجابی میں ٹول، ٹگا، ٹائی اور ٹیر کی طرح بولتے ہیں البتہ ''ٹ'' کے ساتھ ''ہ'' کی آواز بھی مخلوط ہوتی ہے۔

گھ : اسے پنجابی میں ''ک'' کی آواز کے قریب بولا جاتا ہے جیسے کہ گھر، گھورا، گھیو، گھنڈ، گھڑی جیسے الفاظ میں جن کو کر، کوڑا، کیو، کنڈ اور کڑی بولا جاتا ہے اور اس ''ک'' میں ''ہ'' کی آواز مخلوط ہو جاتی ہے۔کسی پنجابی کو بولتے ہوئے سن کر اس کا تلفظ درست کیا جاسکتا ہے۔غیر پنجابی کے لیے ان کا تلفظ کسی قدر مشکل ترین ہے لیکن ذرا سی کوشش پر اس کو اچھی طرح سمجھ کر بول سکیں گے۔ان حروف کا بدلا ہوا تلفظ اس وقت کیا جاتا ہے جب یہ حروف کسی لفظ کے شروع میں آئیں۔

ایک اور حروف ''اڑنون'' ہے پنجابی میں اکثر ''ن'' کی بجائے اس کے ساتھ ''ڑ'' کی ہلکی سی آواز بھی شامل ہوتی ہے جیسے پانی اور کنک جیسے الفاظ میں جن کو پانڑی اور کنڑک بولا جاتا ہے اور اس ''ن'' کو اڑنون کہا جاتا ہے۔اس کے لیے پنجابی سائنس بورڈ نے ''ن'' کی علامت مقرر کر رکھی ہے۔مثلاً پانی کو ''پانٖی''، کھانا کو ''کھاناٖ'' اور کہانی کو ''کہانٖی'' لکھا جاتا ہے۔

پنجابی والے ''ہ'' کا تلفظ زیادہ گہرایاں حلق کی گہرائی سے ادا نہیں کرتے بلکہ پنجابی زبان میں اس کی آواز ہمزہ (ء) کے برابر ہوتی ہے مثلاً لفظ ''باہر'' کو پنجابی میں بھی یہ لفظ ایسے ہی لکھا جائے گا لیکن پڑھتے یا بولتے وقت اس کے درمیان والی ''ہ'' کو ہمزہ کے برابر بولا جاتا ہے۔پنجابی میں اس کا تلفظ ''باءر'' ہوگا۔

پنجابی میں یہ اصول ہر ''ہ'' پر لاگو ہوتا ہے۔

اردو میں ہندی سے آنے والے الفاظ کے آخر میں ''ہ'' کی بجائے ''الف'' لکھا جاتا ہے مثلاً ''ڈبہ'' کو ''ڈبا'' لکھنا زیادہ بہتر ہے۔جدید پنجابی میں عام طور پر عربی اور فارسی سے آنے والے الفاظ کے آخر میں بھی ''ہ'' کی بجائے ''الف'' ہی لکھنے کا رواج ہو رہا ہے۔جیسے ''مسئلہ'' اور ''فیصلہ'' جیسے الفاظ کو بھی ''مسئلہ'' اور ''فیصلا'' لکھا جا رہا ہے اس کتاب میں شامل پنجابی فقرات میں یہی انداز اپنایا ہے۔

اردو میں عام طور پر چھوٹی ''ی'' یا یائے کسرہ زیادہ استعمال ہوتی ہے جب کہ پنجابی میں بڑی ''ے'' زیادہ استعمال ہوتی ہے چناں چہ جب تک کسی ''ی'' کے نیچے زیر یائے کسرہ کی علامت نہ ہو تب تک آپ اسے ''ے'' ہی کے طور پر پڑھیں۔مثال کے طور پر اردو میں لفظ ''بکریاں'' کو ''بکری۔آں'' پڑھا جائے گا جب کہ پنجابی میں ''بکرے۔آں'' پڑھیں گے۔اسے

’’بکری۔آں‘‘ پڑھنے کے لیے نیچے لازمی طور پر کسرہ یاں زیر لگائی جائے گی۔لفظ’’گھوڑیاں‘‘ پنجابی میں گھوڑے۔آں‘‘ پڑھا جائے گا۔

پنجابی گنتی کی مثالیں:

ایک	:	اک	دو	: دو
تین	:	تن،ترے	چار	: چار
پانچ	:	پنج	چھ	: چھے
سات	:	ست	آٹھ	: اٹھ
نو	:	نوں	دس	: دس،دہ
گیارہ	:	گیاراں	بارہ	: باراں
تیرہ	:	تیراں	چودہ	: چوداں
پندرہ	:	پندراں	سولہ	: سولاں
سترہ	:	ستاراں	اٹھارہ	: اٹھاراں
انیس	:	اُنیں	بیس	: ویہہ
اکیس	:	اِکی	بائیس	: بائی
تئیس	:	تریئی،تیئی	چوبیس	: چوّی
پچیس	:	پچھی	چھبیس	: چھّی
ستائیس	:	ستائی،ستاوی	اٹھائیس	: اٹھائی،اٹھاوی
انتیس	:	اُنتی	تیس	: تریہ
اکتیس	:	اِکتی	بتیس	: بتّی
تینتیس	:	پینتی	چھتیس	: چھتّی
سینتیس	:	سَینتی	اڑتیس	: اٹھتی
انتالیس	:	اُنتالی	چالیس	: چالھی
اکتالیس	:	اِکتالی	بیالیس	: بتالی
تنتالیس	:	ترتالی	چونتالیس	: چتالی،چُرتالی
سینتالیس	:	سیتالی	چھیالیس	: چھتالی
انچاس	:	اُنچا	پچاس	: پنجاہ

ہندسے اور صفتی اعداد:

نصف	:	اڈّھا	ایک تہائی	: تیجا حصہ
ایک چوتھائی	:	چوتھا حصہ	پانچواں حصہ	: پنجواں حصہ

پہلا	پہلا	دوسرا	دُوجا
تیسرا	تیجا،تریجا	چوتھا	چوتھا
پانچواں	پنجواں	چھٹا	چھیواں
ساتواں	ستواں	آٹھواں	اٹھواں
نواں	نوواں	دسواں	دسواں،دہواں

روزمرہ استعمال میں ہونے والے الفاظ اوران کے معنی:

میں	میں	ہم	اسیں
تم،تو	تُوں	آپ	تُسیں
وہ	اوہ	اُسے	اوہنوں
کون	کون	کس کا	کہدا
کونسا	کہڑا	کیا	کیہ
ہمارا	ساڈا	ان کا	اوہنادا
زیادہ سے زیادہ	ودھ توں ودھ	ایک بار پھر	اِک وار فیر
ایک دم	اک دم	ابتدا،شروع	مَڈھ،شروع
درمیان	وچکار	سے دور	توں دور
پہلے	پہلاں	کیوں کر	کِویں
پیچھے	پچھے	نیچے	تھلے
قریب	نیڑے	پرے	پرانّہہ
کم ازکم	گھٹوگھٹ	آخرکار	اوڑک
کیسی	کنج وی،کہوجہی	کیسا	کنج دا،کہوجہیا
بہت زیادہ	بہُت ودھ	کتنے	کِنے

مختصر جملے:

پھرملیں گے	فرمِلاں گے
خداحافظ	رب راکھا
شادباش،خوش رہو	شاباش،خش رہوو
مبارکباد	مُبارکاں،ودھائیاں
نیک خواہشات	نیک اچھیاواں
یہ بالکل ٹھیک ہے	یہ اَکا ٹھیک اے

17.9 پنجابی زبان کا ادب

پنجابی زبان میں ادب کے اولین نمونے ناتھ یوگیوں کی تحریروں کی شکل میں ملتے ہیں جو روحانیت اور تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے۔ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کو عام طور پر پنجابی زبان کے پہلے اہم شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ گیارہویں صدی سے پنجابی زبان میں متعدد صوفی شعرا ابھرے جنھوں نے پنجابی زبان میں رشد و ہدایت کا کام کیا۔ بلھے شاہؒ کو پنجابی کا عظیم صوفی شاعر مانا جاتا ہے۔ پنجابی زبان میں صوفیانہ شاعری کو پروان چڑھانے میں شاہ حسین (1599ء۔1538ء)، سلطان باہو (1691ء۔ 1628ء)، شاہ شرف (1724ء ۔ 1640ء)، علی حیدر (1785ء ۔ 1690ء)، بلھے شاہ (1757ء ۔ 1680ء) وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی میں پنجاب میں سکھ مت کا آغاز ہوا۔ سکھوں کی زبان پنجابی ہے۔ سکھ مت کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب کا بہت بڑا حصہ بھی پنجابی زبان میں ہے جو گرمکھی رسم خط میں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ گرونانک کے افسانوی حالات زندگی اور ان سے متعلق مختلف کہانیاں جنھیں جنم ساکھی کہا جاتا ہے پنجابی زبان ہی میں ہیں۔ پنجابی زبان اپنے قصوں کے لیے بھی مشہور ہے جو عشق و محبت، جذبات، ایثار و قربانی، سماجی اقدار اور ایک بڑے نظام کے خلاف ایک عام آدمی کی بغاوت سے متعلق ہیں۔ ہیر رانجھا کا قصہ جس کے مصنف وارث شاہ (1798ء۔1706ء) ہیں، پنجابی زبان کا سب سے مقبول قصہ ہے۔ دیگر مشہور قصوں میں سوہنی مہیوال (فضل شاہ)، مرزا صاحبان (حافظ برخوردار)، سسی پنوں (ہاشم شاہ) وغیرہ شامل ہیں۔

17.10 پنجابی اور اردو

پنجابی مغرب میں لہندا یا مغربی پنجابی، شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں بیکانیری بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مشرق میں اس کے حدود مغربی ہندی کی دو بولیوں یعنی کھڑی بولی اور ہریانی سے ملتے ہیں۔ پنجابی ہی کی ایک شاخ ڈوگری ہے جو جموں میں رائج ہے۔ سکھ مت کی وجہ سے پنجابی کو بہت ترقی ہوئی۔ امرتسر ضلع گرداس پور کی پنجابی معیاری سمجھی جاتی ہے۔

لفظ ''پنجابی'' کا اطلاق عام طور پر ان تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے لے کر ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہے۔ سب سے پہلے گریرسن نے اس بات کو واضح کیا تھا کہ لاہور کے مغرب میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے اندرونی بولیوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اس زبان کو مغربی پنجابی کا نام دیتا ہے اور اسے بیرونی زبانوں کی فہرست میں رکھتا ہے۔ اس طرح اس نے مغربی پنجابی اور مشرقی پنجابی میں امتیاز کیا ہے۔ پنجابی پورے پنجاب کی زبان نہیں۔ یہ مشرقی پنجاب، بیکانیر کے شمال اور جموں کے جنوبی اضلاع کی زبان ہے۔ مغرب میں یہ مغربی پنجابی، شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں باگر اور بیکانیر کی بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مشرق میں اس کے حدود کھڑی بولی اور ہریانی سے ملتے ہیں۔ پنجابی اور مغربی ہندی کی بولیوں کے درمیان حد بندی دریائے گھگھر سے کی جاسکتی ہے۔

محمود شیرانی اپنی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں بعض تاریخی دلائل اور پنجابی اور اردو صرف ونحو کے تقابلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب سے ہے اور لکھتے ہیں ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ پنجاب سے ہی کوئی زبان اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔''

شیرانی سے قبل شیر علی سرخوش، گریرسن، سنیتی کمار چٹر جی، زور اور گراہم بیلی وغیرہ نے بھی اپنی تحریروں میں اردو کے پنجابی پن پر زور دیا ہے۔

پنجابی اور اردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ محمود شیرانی نے اپنی تحقیقی تصنیف پنجاب میں اردو میں پنجابی اور اردو کے لسانی رشتوں پر نہایت تفصیل اور وضاحت سے گفتگو کی ہے۔ یہاں پر ان کے اہم نکات کا جائزہ لیا جارہا ہے:

مصدر : مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے۔ یعنی علامت ''نا'' امر کے آخر میں اضافہ کر دی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں ''ناں'' تھا۔ بارہویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کر دیا گیا اور دیگر الفاظ سے بھی خارج کر دیا گیا تھا۔ مثلاً کوں، ستیں وغیرہ جو بعد میں سے، کو اور ستی بن گئے ہیں۔

تذکروتانیث : تذکیروتانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہی ہیں جیسا کہ اکثر ایسے الفاظ جو ''الف'' پر ختم ہوتے ہیں، تانیث کی حالت میں ''ی'' پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً بکرا۔ بکری، گھوڑا۔ گھوڑی، چنگا۔ چنگی، کالا۔ کالی، بوما۔ بوٹی وغیرہ۔

اسی طرح جب اسم مذکر حروف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لیے ''نی'' یا ''انی'' کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں اس طرح ہیں:

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
مغل	مغلانی	مغلانی
لوہار	لُہارن، لُوہاری، لُوہارنی	لُوہاری، لوہارن
دیور	دیرانی	دِورانی
اونٹ	اونٹنی	اونٹنی
نٹ	نٹنی	نٹنی
فقیر	فقیرنی	فقیرنی
زمیندار	زمیندارنی	زمیندارنی
ڈوم	سیدزادی	سیدانی

اگر مذکر ''ی'' پر ختم ہو تو مونث میں ''ی'' نون سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً:

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
میراثی	میراثن	میراثن
تیلی	تیلن	تیلن
قریشی	قریشن	قریشن
موچی	موچن،موچیانی	موچن
بھائی	بھین	بہن
قصائی	قصائن	قصائنی
جوگی	جوگن	جوگن
درزی	درزیانی،درزن	درزن
نائی	نائین	نائن
قاضی	قضیانی	قضیانی
دھوبی	دھوبن	دھوبن

اعلام واسماء اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں ''الف'' پرختم ہوتے ہیں جب کہ برج بھاشا میں واو مجہول پرختم ہوتے ہیں۔جیسے:

پنجابی	اردو
منڈا	لڑکا
گھوڑا	گھوڑا
کتا	کتا
نیولا	نیولا
چنگا	اچھا
نکا	چھوٹا
وڈا	بڑا
کہبا	الٹا
سجا	سیدھا
اُچا	اونچا

اسمائے صفات تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر:

اردو : (1) اونچا گھوڑا (2) میرا لڑکا (3) چھوٹی لڑکی (4) بڑے لڑکے (5) دوڑتے گھوڑے سے (6) چھوٹی لڑکیاں

پنجابی : (1) اُچا گھوڑا (2) میرا منڈا (3) نکی کڑی (4) وڈے منڈے (5) دوڑدے گھوڑے توں (6) نکیاں کُڑیاں

برج میں اس موقعہ پر اونچو گھوڑا اور میرو چھورا لائیں گے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور پنجابی فقروں میں اسمائے صفات ان کے موصوفوں کے مطابق ہیں۔یعنی جب موصوف غیر منصرف ہے تو اس کا اسم صفت بھی غیر منصرف رہا۔ جیسے پہلے تین جملوں میں دکھایا گیا ہے۔ چوتھے اور پانچویں جملہ میں چوں کہ موصوف منصرف ہو گئے ہیں۔یعنی اپنی اصلی حالت لڑکا اور گھوڑا کو چھوڑ کر لڑکے اور گھوڑے بن گئے ہیں۔اس لیے ان کے اسماءِ صفات بھی منصرف ہو کر اپنے موصوفوں کی حالت قبول کر کے بڑے اور دوڑتے بن گئے۔اہل برج اس موقعہ پر''بڑے لڑکا'' اور''دوڑتے گھوڑا سے'' لائیں گے جو اردو اور پنجابی کے خلاف ہے۔ یہ فرق اگر چہ بہ ظاہر خفیف ہے لیکن نہایت اہم ہے۔ چھٹے فقرے میں دیکھا جاتا ہے کہ پنجابی میں جب کہ صفت و موصوف باہم متحد ہیں اردو میں باہم مطابق نہیں۔ چھوٹی واحد ہے اور لڑکیاں جمع ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو میں یہ بے ضابطگی میر وسودا کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔اردوئے قدیم میں''چھوٹیاں لڑکیاں'' ہی بولا جاتا تھا جو پنجابی کے عین مطابق ہے۔

احمد دکنی:

سو چاؤوں سے پالیاں سو بالیاں نکھیاں
وفا شرم انو تھے سکیاں سب سکیاں

خبر تذکیر و تانیث واحد و جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے:

اردو : (1) یہ بات بھلی نہیں (2) یہ باتیں بھلی نہیں

پنجابی : (1) ایہ گلی چنگی نہیں (2) ایہ گلاں چنگیاں نہیں

اردو کے دوسرے جملہ میں دیکھا جاتا ہے کہ خبر اپنے مبتدا کے مطابق نہیں۔ باتیں جمع ہے اور بھلی واحد۔ جب کہ پنجابی میں مبتدا اور خبر دونوں جمع میں ہیں۔ یہ جدت طرازی اسی زمانہ اصلاح سے تعلق رکھتی ہے۔جس کا درج بالا ذکر کیا جا چکا ہے۔قدیم اردو میں یہ جملہ یوں لکھا جاتا''یہ باتیں بھلیاں نہیں'' بلکہ''یہ باتاں بھلیاں نہیں'' جو پنجابی سے بالکل موافق ہے۔سودا کہتے ہیں:

دوانہ ہوگیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اَے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

فعل تذکیر و تانیث و واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہے:

اردو : (1) گھوڑا آیا (2) گھوڑے آئے (3) عورت آئی (4) عورتیں آئیں

پنجابی : (1) گھوڑا آیا (2) گھوڑے آئے (3) بڈھی آئی (4) بڈھیاں آئیاں

چوتھے جملہ میں بڈھیاں غیر منصرف ہے جو بالکل درست ہے۔اردو کے جملہ میں اسے عورتاں سے منصرف کر کے عورتیں بنالیا گیا ہے۔ پرانی اردو میں یہی جملہ یوں لکھتے''عورتاں آئیاں''ایک مثال سودا کے کلام میں موجود ہے:

گھتی نکلیں ہیں لخت دل سے تار اشک کی لڑیاں
یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں

اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق ہوتی ہے:

اردو : اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں بعض چاندی کی، بعض یاقوت سرخ کی اور بعض زمرد کی اور بعض زبرجد کی اور بعض جواہرات سفید کی۔

پنجابی : اودے وچہ کوٹھریاں رنگ برنگیاں ہیں، بعضیاں چاندی دیاں، بعضیاں یاقوت سرخ دیاں تے بعضیاں زمرودیاں تے، بعضیاں زبرجد دیاں تے بعضیاں چٹے جواہرات دیاں نے۔

یہاں اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کوٹھریاں جمع میں ہیں اور اضافت ''کی'' واحد میں لیکن یہاں پھر اردو نے اپنے پرانے قواعد کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں بھی جملہ یوں لکھا جاتا تھا:

''اور اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کیاں، بعض یاقوت سرخ کیاں اور بعض زمرد کیاں اور بعض زبرجد کیاں اور بعض جواہرات سفید کیاں۔'' (منقول از کتاب ہزار مسائل)

اس کی مثال ملاحظہ ہو:

اردو : یوں نو دہزار باتاں اللہ کیاں ہور محمد کیاں ہویاں۔ (از معراج العاشقین)

پنجابی : اینج نوے ہزار باتاں اللہ دیاں ہور محمد دیاں ہویاں۔

ایک اور مثال:

اردو : ''قیامت کی نشانیاں کتنی ہیں اور کیسی ہیں یا رسول اللہ''

پنجابی : قیامت دیاں نشانیاں کتیاں تے کیہاں تے یا رسول اللہ''

قدما کی زبان میں یہ جملہ یوں ہے:

''قیامت کیاں نشانیاں کتنیاں ہیں اور کیسیاں ہیں یا رسول اللہ'' (از ہزار مسائل)

محمد امین دکنی:

گگن کن گردشاں ہیں کئیں طرح کیاں
کد ہیں غم کیا ہیں اور کد ہیں فرح کیاں
(یوسف زلیخا)

ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے:

اردو : وہ آیا۔ وہ آئے۔ میں آیا۔ وہ آئی۔ وہ آئیں۔ تو آئی۔ تم آئیں۔ میں آئی۔ ہم آئیں۔

پنجابی : اوہ آیا۔ اوہ آئے۔ تو آیا۔ تسی آئے۔ میں آیا۔ اسی آئے۔ اوہ آئی۔ اوہ آئیاں۔ تو آئی۔ تسی آئیاں۔ میں آئی۔ اسی آئیاں۔

جمع مونث کے صیغوں میں جو فرق پنجابی اور اردو میں ظاہر ہوتی ہے وہ متاخرین کی اصلاحی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جس نے قدما کے قاعدوں کو درہم و برہم کر دیا۔

وہ آئیاں۔ تم آئیاں۔ ہم آئیاں۔

ماضی قریب فعل امدادی کی تصریف سے بنتی ہے۔ یہاں پنجابی اور اردو میں کسی قدر اختلاف ہے۔

صیغہ مذکر

اردو : وہ آیا ہے۔وہ آئے ہیں۔تو آیا ہے۔تم آئے ہو۔میں آیا ہوں۔ہم آئے ہیں۔

پنجابی : اوہ آیا اے۔اوہ آئے نے۔تو آیاں ایں۔تسی آئے۔اومیں آیا آں۔اسی آئے آں۔

صیغہ مونث

اردو : وہ آئی ہے۔وہ آئی ہیں۔تو آئی ہے۔تم آئی ہو۔میں آئی ہوں۔ہم آئی ہیں۔

پنجابی : وہ آئی اے۔اوہ آئیاں نے۔تو آئی ایں۔تسیں آئیاں او۔میں آئی آں۔اسی آئیاں آں۔

ماضی بعید بھی توابع کی تصریف سے بنتی ہے۔

اپنی گراں قدر تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں محمود شیرانی نے پنجابی اور اردو کی صرفی مماثلتوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> **''اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبے کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔''**

(پنجاب میں اردو،ص:71)

اردو کے پنجابی سے مشتق ہونے یا پنجاب سے منسوب ہونے کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے جسے محمود شیرانی نے پیش کیا ہے۔خود محمود شیرانی نے اعتراف کیا ہے کہ ان سے قبل شیر علی خاں سرخوش اپنے تذکرے ''اعجاز سخن'' (1923ء) میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔شیرانی اور سرخوش کے علاوہ اردو کے اولین باقاعدہ ماہر لسانیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (م 1962ء) نے بھی اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی بات کہی ہے۔محمود شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' کی اشاعت (1928ء) سے ایک سال قبل ڈاکٹر زور اردو کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر لندن یونی ورسٹی میں لسانی تحقیق میں مصروف تھے۔ان کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کہ اردو پنجاب میں بنی۔اس نظریے کی مزید توثیق اور وضاحت انھوں نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی فونی ٹکس'' (Hindustani Phonetics) (1930ء) اور بعد میں اپنی کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' (1932ء) میں بھی کی ہے۔

آخر الذکر کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

> **''اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی جب**

تک کہ مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت نہ بنالیا۔۔۔اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔"

(ہندوستانی لسانیات، (اڈیشن 1960ء)، ص:94، 95)

ٹی گراہم بیلی (م 1942ء) جو پنجابی زبان کے ایک مستند عالم سمجھے جاتے تھے اردو کے آغاز کے بارے میں محمود شیرانی کے خیال سے پورے طور پر اتفاق کرتے ہوئے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلّے میں لکھتے ہیں:

"اردو 1027ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی سوتیلی ماں، برج سے براہ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو جوان دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا، اختیار کیا اور اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیے۔"

(جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، (1930ء)، ص: 391، بہ حوالہ شوکت سبزواری، داستان زبان اردو، ص:50)

گرام بیلی نے اس نقطہ نظر کو اپنی تصنیف "اے ہسٹری آف دی اردو لٹریچر" میں بھی پیش کیا ہے۔

اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے کے سلسلے میں محققین کے مابین سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک طرف محمود شیرانی ہیں جو پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیتے ہیں اور دونوں کی مماثلتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے ہم نوا ڈاکٹر زور اور گراہم بیلی بھی ہیں۔ دوسری طرف مسعود حسین خاں ہیں جن کی رائے مذکورہ علما کے برعکس ہے۔ مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف مقدمہ تاریخ زبان اردو میں محمود شیرانی کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمود شیرانی نے قدیم اردو اور دکنی کی جن پنجابی سے منسوب کیا ہے وہ دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں بالخصوص "ہریانی" (ہریانوی) میں بھی پائی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ قدیم اردو دکنی کا "پنجابی پن" اس کا "ہریانی پن" بھی ہے۔ لیکن ڈاکٹر زور نے مسعود حسین خاں کے نظریے کو یہ کہتے ہوئے رد کیا ہے کہ جس وقت دکنی اردو نے پنجاب میں نشوونما حاصل کیا اس وقت ہریانی کا وجود ہی نہیں تھا۔ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی آمد دلی کے بعد عمل میں آئی ہے۔ و نیز یہ کہ مسعود حسین خاں نے قدیم دکنی کا تقابل موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی سے کیا ہے جو صحیح طریقہ نہیں ہے۔

17.11 خلاصہ

مسلمانوں کی آمد سے پنجاب کی حالت میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور اہل پنجاب حلقہ بگوش اسلام ہو کر دینی و دنیاوی ترقی کرتے ہیں۔ ابھی مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے ایک صدی بھی نہیں گزرنے پائی ہے کہ دہلی کے دربار میں پنجاب کے بعض مشاہیر امرا و فضلا اپنے فضل و کمال اور علم و فضل تصوف و عرفان کا کام انجام دیتے نظر آتے ہیں۔

پنجاب کی زبان پنجاب کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت امیر خسرو نے اس کو لاہوری کا نام دیا تو ابوالفضل نے ملتانی قرار دیا۔ جب کہ مغربی مورخین نے شمال اور جنوب میں ایک خط کھینچ کر مشرقی اور مغربی پنجابی میں تقسیم کر دیا۔ مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی تو مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا رکھا۔ وہ پنجابی کو ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کر کے سندھی اور کشمیری کا رشتہ مانتے ہیں جس کو اہل پنجاب نے مسترد کر دیا۔

پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبہ کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور ہے بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے۔ ایک طرف دریائے گھگر تک تو دوسرے طرف دریائے سندھ کے پار ہو گئی۔ ایک اہم مغربی عقیدہ یہ ہے کہ پنجابی زبان کا ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ ایک زمانہ میں تمام مشرقی پنجاب پر پھیل گئی اور اس صوبہ کی اصلی زبان لہندا کو ہٹا کر اس پر چھا گئی اور دریائے چناب تک پہنچ گئی۔ ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ جنوب کی طرف رہا۔ سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور اس کے نواح میں آباد ہو گئے تھے اور بارہویں صدی میں سکھ پنجاب سے نکل کر اردو و بانگڑا اور بیکانیری علاقوں میں گھس گئے۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے ڈھکیلنے کا کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا۔

پنجابی اور اردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے یعنی علامت ''نا'' امر کے آخر میں اضافہ کر دی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں 'نا'' تھا۔ بارہویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اور دیگر الفاظ سے بھی خارج کر دیا گیا۔ اسی طرح تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہی ہیں مثلاً اکثر ایسے الفاظ جو ''الف'' پر ختم ہوتے ہیں تانیث کی حالت میں ''ی'' پر ختم ہوتے ہیں مثلاً بکرا۔ بکری، گھوڑا۔ گھوڑی، چنگا۔ چنگی، کالا۔ کالی، بوٹا۔ بوٹی وغیرہ جب اسم مذکر حروف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لیے ''نی'' یا ''انی'' اضافہ کر دیتے ہیں۔ اگر مذکر ''ی'' پر ختم ہو تو مونث میں ''ی'' نون سے بدل جاتی ہے۔ ''نی'' لاحقہ تانیث جو ہم زمیندارنی، فقیرنی، ڈومنی وغیرہ میں دیکھتے ہیں درحقیقت پنجابی میں عام علامت تانیث ہے جو عورت کو خطاب کے لیے ابتدائی میں بھی لائی جاتی ہے۔ مثلاً ''نی کڑیے'' (اے لڑکی)، ''نی شیر محمد دی ماں'' (اے شیر محمد کی ماں)۔ اعلام و اسما اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں جب کہ برج بھاشا میں واو مجہو پر ختم ہوتے ہیں۔

اردو اور پنجابی فقروں میں اسمائے صفات ان کے موصوفوں کے مطابق ہیں۔ یعنی جب موصوف غیر منصرف ہے تو اس کا اسم صفت بھی غیر منصرف رہتا ہے۔ خبر تذکیر و تانیث واحد و جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے۔ فعل تذکیر و تانیث و واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق رہتے ہیں۔ اسی طرح پنجابی اور اردو میں اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق ہوتی ہے۔ ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے۔ ماضی قریب فعل امدادی کی تصریف سے بنتی ہے۔ اس میں پنجابی اور اردو میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ماضی بعید بھی توابع کی تصریف سے بنتی ہے۔ ماضی ناتمام میں بڑا فرق ہے کہ پنجابی میں جہاں دال ہے اردو میں ''تے'' بن گئی ہے۔

اپنی گراں قدر تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں محمود شیرانی پنجابی اور اردو کی صرفی مماثلتوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد

اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبے کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔''

(پنجاب میں اردو، ص: 71)

اردو کے پنجابی سے مشتق ہونے یا پنجاب سے منسوب ہونے کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے جسے محمود شیرانی نے پیش کیا ہے۔ خود محمود شیرانی نے اعتراف کیا ہے کہ ان سے قبل شیر علی خاں سرخوش اپنے تذکرے ''اعجاز سخن'' (1923ء) میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ شیرانی اور سرخوش کے علاوہ اردو کے اولین با قاعدہ ماہر لسانیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (م 1962ء) نے بھی اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی بات کہی ہے۔

اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے کے سلسلے میں محققین کے مابین سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک طرف محمود شیرانی ہیں جو پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیتے ہیں اور دونوں کی مماثلتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے ہم نوا ڈاکٹر زور اور گراہم بیلی بھی ہیں۔ دوسری طرف مسعود حسین خاں ہیں جن کی رائے مذکورہ علما کے برعکس ہے۔ مسعود حسین خاں نے اپنی تصنیف مقدمہ تاریخ زبان اردو میں محمود شیرانی کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمود شیرانی نے قدیم اردو اور دکنی کی جن پنجابی سے منسوب کیا ہے وہ دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں بالخصوص ''ہریانی'' (ہریانوی) میں بھی پائی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کا یہ دعویٰ ہے کہ قدیم اردو دکنی کا ''پنجابی پن'' اس کا ''ہریانی پن'' بھی ہے۔ لیکن ڈاکٹر زور نے مسعود حسین خاں کے نظریے کو یہ کہتے ہوئے رد کیا ہے کہ جس وقت دکنی اردو نے پنجاب میں نشو ونما حاصل کیا اس وقت ہریانی کا وجود ہی نہیں تھا۔ ہریانی کی پیدائش مسلمانوں کی آمد دلی کے بعد عمل میں آئی ہے۔ و نیز یہ کہ مسعود حسین خاں نے قدیم دکنی کا تقابل موجودہ پنجابی اور موجودہ ہریانی سے کیا ہے جو صحیح طریقہ نہیں ہے۔

17.12 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ پنجابی زبان کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ پنجابی زبان اور اردو زبان کے لسانی رشتہ کو بیان کیجیے۔

3۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آمد کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ پنجابی زبان کس کو کہتے ہیں؟

2۔ ابتدائی پنجابی ادب کے بارے میں بیان کیجیے۔

3۔ پنجابی پر عربی و فارسی کے اثرات واضح کیجیے۔

17.13 سفارش کردہ کتابیں

1۔ ہندوستانی لسانیات : ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

2۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ : پروفیسر احتشام حسین

3۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو : پروفیسر مسعود حسین خاں

4۔ اردو زبان کی تاریخ : مرزا خلیل احمد بیگ

5۔ پنجاب میں اردو : محمود شیرانی

اکائی 18 اردو اور پالی

ساخت

18.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اردو اور پالی کے لسانی رشتہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اردو اور پالی کے درمیان لسانی رشتہ کی وضاحت کرسکیں
- قبل مسیح کی آریائی زبان پالی میں بدھ مت تعلیمات کے فروغ کی نشان دہی کرسکیں
- ہندوستان میں پالی کی شروعات کے لسانی موقف اور اس کی روایتی خصوصیت کی تفصیل بیان کرسکیں
- پالی کے ہندوستانی مزاج اور اس کے آریائی عناصر کی وضاحت کرسکیں
- پالی اور اردو کے لسانی اثرات اور پالی پر ویدوں کے اثرات کو واضح کرسکیں
- پالی اور اردو زبانوں میں آریائی عناصر کا جائزہ لے سکیں اور
- اردو اور پالی میں لسانی اور ادبی مماثلت اور اختلاف کے ساتھ اردو نثر اور شاعری پر پالی کے اثرات کو واضح کرسکیں گے۔

18.1 تمہید

ہندوستان کی آریائی زبانوں کے لسانی پس منظر میں اردو زبان اور ہندی کی شروعات سے قبل ہندوستان کی دوسری تحریری زبان کی حیثیت سے پالی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان کی سرزمین میں سنسکرت کی شاخ شورسینی پراکرت کے بعد دوسری بڑی پراکرت یعنی ماگدھی پراکرت سے وجود میں آنے والی آریائی زبان کی حیثیت سے پالی زبان کو انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اس زبان کو مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات کو فروغ دینے کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی تحریری زبان سنسکرت تھی جس میں چار ویدیں تحریر کی گئی تھیں اس کے بعد دوسری صدی قبل مسیح میں لکھی جانے والی زبان کی حیثیت سے پالی کو دوسرا مقام حاصل ہوا۔ گوتم بدھ نے اپنے مذہب کے پرچار کے لیے سنسکرت زبان کو وسیلہ نہیں بنایا کیوں کہ سنسکرت زبان میں چاروں ویدوں اور ان کی قدامت کی وجہ سے ویدوں کی سنسکرت کو روایتی زبان یعنی ویدک سنسکرت کا درجہ حاصل ہو چکا تھا جو کتابوں میں محفوظ زبان تھی۔ اس کے بجائے مہاتما گوتم بدھ نے یہ محسوس کیا کہ ماگدھی پراکرت سے وجود میں آنے والی پانی پراکرت سے مل کر بننے والی زبان پالی کو اپنے مذہب کے پرچار کے لیے استعمال کیا جائے، اگر بدھ مت کی تعلیمات نہ ہوتیں اور ان تعلیمات کو استوپ اور مٹی کی تختیوں کے علاوہ نرم پتھروں پر کندہ نہ کیا جاتا تو بلاشبہ ہندوستان میں سنسکرت زبان کے بعد ایک اہم تحریری زبان کی حیثیت سے پالی کو اہمیت حاصل نہ ہوتی۔ غرض اس اکائی میں پالی زبان کا تعارف اور اس کا سنسکرت سے تعلق کی وضاحت کی جائے گی۔ جس طرح گوتم بدھ نے اپنے مذہب کے پرچار کے لیے ہندوستان کی آریائی زبان یعنی سنسکرت کی شاخ پالی کو بہ طور تبلیغی زبان استعمال کیا۔ اسی طرح ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد مسلمان صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے بھی اپنے مذہب کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے ہندوستان میں سنسکرت سے میل کھا کر پیدا ہونے والی زبان یعنی اردو کو ایک وسیلہ کی زبان کے طور پر استعمال کیا۔ جس سے پالی اور اردو زبان میں کچھ مماثلتیں ضرور دکھائی دیتی ہیں لیکن پالی نے بھرپور طور پر سنسکرت سے استفادہ کیا جب کہ اردو نے سنسکرت لفظیات کے ساتھ بیرونی زبانوں جیسے عربی، فارسی اور ترکی زبان کی لفظیات سے استفادہ کیا ہے۔

18.2 پالی کا تعارف

ہندوستان کی سرزمین میں آریاؤں نے سندھ کے علاقہ پر قبضہ جمانے کے بعد سندھ اور پنجاب کے علاقہ سے دراوڑیوں کو شکست دے کر دوآبہ گنگ وجمن کے علاقہ پر 1500 قبل مسیح تک اپنا تسلط قائم کرلیا۔اس علاقہ کو آریاورت کا نام دیا گیا،انھوں نے سماج کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا اور چار کتابیں تحریر کیں۔ان چار کتابوں کو رگ وید، سام وید، اتھر وید اور یجر وید کا نام دیا جاتا ہے۔جس کے ذریعہ اخلاقی اور مذہبی تعلیمات کا سلسلہ شروع ہوا اور آریاؤں نے انسانوں میں تفریق کی بنیاد رکھ کر سب سے بڑی ذات برہمن کو قرار دیا اور ان کے ذمہ مذہبی کاموں کی انجام دہی کی اور اس کے بعد دوسری ذات چھتری قرار دی گئی،جن کے ذمہ فوجی کام تھے تیسری ذات ویش تھی جو تجارت سے متعلق تھی اور چوتھی ذات شودر کہلائی جو نیچ کام کرنے پر مامور تھے۔چناں چہ کمہار، چمار، بڑھئی، لوہار اور موچی کے علاوہ غلاظت صاف کرنے کا کام شودروں کے حوالے کیا گیا۔اس ذات پات کی شدت کا ذکر چاروں ویدوں میں موجود ہے۔اگرچہ ہندوستان کے بہت بڑے خطے میں سنسکرت اور ویدوں کی تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوا لیکن زائد از بارہ سو سال کے اندر ہندو مذہب کی مخالفت کا رویہ اختیار کیے بغیر مگدھ کے علاقہ سے انسانوں کو دکھوں سے نجات دلانے اور خدا ترسی سے وابستہ کرنے کے لیے سدھارتھ نامی ایک شہزادے نے اپنے والد کی مملکت کو چھوڑ کر بودھ گیا یعنی بہار کے علاقہ میں تپسیا کی اور جب انھیں گیان حاصل ہوا تو شہزادہ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ جسے ملک گیر سطح پر شہرت حاصل ہوئی۔اس مذہب کو بدھ مت کی حیثیت سے شناخت کیا جاتا ہے۔مہاتما گوتم بدھ کی تپسیا کے بعد اس مذہب کا آغاز ہوا۔ چوں کہ گوتم بدھ نے اس مذہب کے ذریعہ کسی دوسرے مذہب سے ٹکراؤ اور مماثلت کا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ انسان کو امن وشانتی کے ساتھ زندگی گزارنے کے طریقے بتاتے ہوئے اپنے مذہب میں پوجا یا پرستش کو اہمیت نہیں دی تھی۔اس لیے اس مذہب نے ہندوستان کے آریاؤں کے ہندو مذہب سے زیادہ شہرت حاصل کی اور گوتم بدھ کو اپنے مذہب کی تعلیمات کے لیے سنسکرت کے بجائے پالی زبان کا استعمال کرنا پڑا۔ ماگدھی پراکرت سے وجود میں آنے والی پانی پراکرت کی شاخ کی حیثیت سے پالی کو اہم مقام حاصل ہے اور پالی زبان کو بدھ مت کی تعلیمات کو فروغ دینے کی وجہ سے ہندوستان کی قدیم آریائی زبان کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔گوتم بدھ کی تعلیمات کو ہندوستان میں عام کرنے کی سب سے بڑی کوشش ہندوستان کے مشہور راجا اشوک اعظم نے کی۔اس نے بدھ مت کی تعلیمات کو استوپ پر کندہ کروا کر ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ ہندوستان کی آریائی جدید زبانوں کی آمد سے قبل تک دو ہی زبانوں کو ہندوستان کی تحریری زبانوں کا درجہ حاصل تھا۔جن میں سنسکرت کو اولیت حاصل تھی۔ جس کے بعد پالی زبان ہی بدھ مت کی تعلیمات کی وجہ سے تحریری زبان کا درجہ رکھتی تھی۔

18.2.1 پالی۔قبل مسیح کی آریائی زبان

ہندوستانی زبانوں کے لسانی خاکے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہند۔آریائی کے عہد قدیم (1500 سے قبل مسیح سے 600ء قبل مسیح) کے گزرنے کے بعد پالی زبان کا آغاز ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ پالی زبان باضابطہ وجود حاصل کرنے سے قبل ماگدھی پراکرت سے نکل کر پانی پراکرت میں تبدیل ہوئی۔اسی پانی پراکرت سے وجود میں آنے والی قبل مسیح کی زبان کی

حیثیت سے پالی کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ویدک سنسکرت کی شاخ سنسکرت سے وجود میں آنے والی دوسری اہم زبان کی حیثیت سے ماگدھی پراکرت اہمیت کی حامل تھی۔ اسی ماگدھی پراکرت سے پانی پراکرت کا وجود ہوا۔ پانی پراکرت کے دور کا تعین کرنا سخت دشوار ہے کیوں کہ اس دور میں موجود شہادتوں میں بادشاہی تاریخ کا ضرور پتہ چلتا ہے لیکن زبان کی تاریخ کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہند۔آریائی کے عہد قدیم کے بعد یعنی 600 قبل مسیح کے بعد ہی پانی پراکرت کا وجود ہوا۔ جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے کہ گوتم بدھ نے بدھ مت کی تعلیمات کے فروغ کے لیے پالی زبان کا استعمال کیا۔ اس لیے پالی کے دور کو 300 قبل مسیح سے لے کر اس کے بعد کے دور تک کی زبان کی حیثیت سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کے توسط سے پالی کو پانچویں قبل مسیح سے لے کر پہلی صدی قبل مسیح تک کی زبان کی حیثیت سے شناخت دی جاتی ہے۔ آج کے دور میں پالی کو روایتی زبان کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے، جس میں بدھ مت کی تعلیمات موجود ہونے کی وجہ سے اس کی مذہبی حیثیت مسلمہ ہے۔ لسانی پس منظر میں یہ بتایا گیا ہے کہ پالی زبان کو انڈو۔آرین زبان کی شاخ قرار دیا جاتا ہے۔ جس سے وجود میں آنے والی پراکرت نے پالی زبان کو جنم دیا۔ پالی زبان لکھنے کا طرز تحریر براہمی کہلاتا ہے موجودہ دور میں براہمی رسم الخط لاطینی حروف تہجی میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس طرح پالی نہ صرف ایک ہندوستانی زبان ہے بلکہ اس کے توسط سے بدھ مذہب کی تعلیمات آج تک محفوظ ہے۔ پالی کو مگدھ کے عہد وسطی کے بادشاہوں کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ جو آج کے دور میں بہار کا علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ مہاتما گوتم بدھ کے انتقال کے بعد بدھ مت کے ماننے والوں میں دو فرقے پیدا ہو گئے ایک فرقہ نے ان کے باقیات اور آثار کی پرستش کی جسے ہنایان کہا گیا اور دوسرے فرقہ نے ان کی مورتی کی پرستش کی جسے مہایان کا درجہ حاصل ہوا۔ دونوں فرقے گوتم بدھ کی مذہبی تعلیمات کے بنیادی موقف کی حیثیت سے پالی زبان کو ہی مذہبی آثار کا درجہ دیتے ہیں۔

18.2.2 پالی بحیثیت منفرد زبان

ہندوستان کی سرزمین میں سنسکرت کے بعد سب سے زیادہ مذہبی خیالات کو پیش کرنے والی زبان کی حیثیت سے پالی کی مسلمہ حیثیت موجود ہے۔ پالی زبان کی نہ صرف قواعد لکھی جا چکی ہے بلکہ اس کے الفاظ اور اس کے طریقہ تدریس ہی نہیں بلکہ اس زبان میں کئی مقررین کے خطابات سے پتہ چلتا ہے کہ پالی کو ایک منفرد زبان کا درجہ حاصل ہے۔ پالی کو بھوٹا یعنی ماضی کی بھاشا کا درجہ حاصل ہے۔ اس اعتبار سے پالی کی شناخت ایک ایسی زبان کی حیثیت سے ہوتی ہے جو ماضی کی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ پرانی کتابوں میں تھیرا وادا کے اسناد سے پتہ چلتا ہے کہ پالی کو عام طور پر ''مگادھان'' زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ مگدھ کے علاقوں میں بدھ کی تعلیمات کو جس زبان میں پیش کیا گیا وہی زبان ''مگادھان'' کہلاتی ہے۔ موریا خاندان کے نامور راجا اشوک اعظم نے ہندو مت ترک کر کے بدھ مت اختیار کر لیا تھا اسی وجہ سے اس زبان کو شہرت حاصل ہوئی۔ وسطی ہند۔آریائی زبانوں میں پالی کے علاوہ کوئی بھی ایسی بول چال کی زبان دکھائی نہیں دیتی جو اس مقام و مرتبہ کو پہنچ سکے۔ پالی زبان کے استوپ نہ صرف مگدھ کے علاقہ میں موجود ہیں بلکہ مغربی ہندوستان کے علاقوں میں بھی موجود ہیں۔ مرکزی مغربی پراکرت کو مشرقی علاقوں میں عروج حاصل ہوا جس کے ساتھ ہی اشوک کے دور میں لکھے جانے والے کتبے مگدھ کی نمائندگی کرتے رہے جس میں پالی زبان کا اثر غالب ہے۔ یوروپی مفکرین نے یہ حقیقت واضح کی کہ پالی درحقیقت اپنے عہد کی منفرد زبان رہی

ہے جسے اس دور میں رابطہ کی زبان یعنی لنگوا فرنکا کا درجہ حاصل تھا۔ انگریزی مفکرین جیسے ڈیوڈ اور آرسی چلڈرن ہی نہیں بلکہ آرنارمن نے یہ بتایا ہے کہ پالی زبان درحقیقت قدیم ہند آریائی کی ایک اہم شکل ہے اور گوتم بدھ نے اس زبان کو اپنے مذہب کی زبان کی حیثیت سے استعمال کیا تھا اس سے قبل پالی زبان کو بول چال کی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ یوروپی محققین نے پالی کو اشوک اعظم کے دور میں مغربی ہندوستان میں فروغ پانے والی اہم زبان کا درجہ دیا ہے جسے بدھ سماج میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آج کے دور میں پالی زبان ایک مردہ زبان کا درجہ رکھتی ہے لیکن ہندوستان میں اسے انسانیت کے پیغام کو پھیلانے والی زبان کا درجہ حاصل ہے جو چودھویں صدی عیسوی تک جاری وساری رہی۔ اس میں ادبیات ہی نہیں بلکہ قدیم تاریخ اور طبی مسائل کے علاوہ برما اور مگدھ کی تہذیب کی نمائندگی ہوتی ہے۔ آج کے دور میں پالی زبان جنوبی ایشیاء، برما، سری لنکا، تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا میں موضوع تحقیق زبان کا درجہ رکھتی ہے ہندوستان کی کئی انجمنیں پالی زبان کے مطالعہ کو ترقی دینے اور اس زبان کے بارے میں ہی نہیں بلکہ اس کے ادب کی بیداری پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ جن میں مہابودھی سوسائٹی کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یوروپ میں بھی پالی کی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ یوروپی سرزمین میں نہ صرف پالی میں لکھے ہوئے ادب کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا بلکہ 1869ء میں پالی ڈکشنری کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ اس طرح آج کی نئی دنیا میں انگلستان، جرمنی، روس، ڈنمارک، سری لنکا کے علاوہ دانش رائل لائبریری میں پالی کے مخطوطات موجود ہیں جن کا بیشتر حصہ پالی کے مطالعات کے روایتی انداز سے وابستہ ہے اس طرح قبل مسیح میں فروغ پانے والی پالی زبان آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں خصوصی مطالعات کے ذریعہ اپنا مقام رکھتی ہے۔

18.3 پالی کا ہند۔آریائی موقف

ہندوستان کی سرزمین میں شمالی ہند میں دو بڑی زبانوں کا غلبہ رہا۔ آریاؤں کی آمد سے قبل دراوڑی قوم اس ملک کی حقیقی آبادی کا درجہ رکھتی تھی اور وہ دراوڑی زبان بولتے تھے جو بعد میں لکھنے کی زبان کی علم بردار ہوگئی۔ دراوڑی قوم شکست کھاتے ہوئے سندھ سے پنجاب اور پھر پنجاب سے دوآبہ سے ہوتے ہوئے جنوبی ہند کی مختلف دریاؤں جیسے کاویری، تاپتی، کرشنا، گوداوری، نربدا اور تنگبھدرا کے اطراف آباد ہوگئی۔ تمام دریاؤں کا بہاؤ جنوبی ہند میں ہے۔ شمالی ہند میں آریائی زبان یعنی سنسکرت کا سلسلہ جاری رہا۔ پالی زبان میں وہی تمام عناصر موجود ہیں جو آریائی زبانوں کے عناصر کہلاتے ہیں۔ آریائی زبان کا ہر لفظ آخر میں ساکن ہوتا ہے اس کے علاوہ آریائی زبان لکھنے کا انداز فاعل، مفعول اور فعل پر مشتمل ہے۔ جس کی بھرپور نمائندگی ویدک سنسکرت میں ہی نہیں بلکہ اس سے وجود میں آنے والی سنسکرت زبان پھر ماگدھی پراکرت اور پانی پراکرت کے علاوہ پالی زبان میں بھی نظر آتی ہے۔ سنسکرت سے نکلنے والی دوسری بڑی زبان یعنی ماگدھی پراکرت کی اہم علاقائی زبان کی حیثیت سے پالی کو سب سے پہلے مگدھ کے علاقہ میں فروغ حاصل ہوا۔ ہند۔آریائی زبان کی حیثیت سے سب سے بڑی زبان شورسینی پراکرت اہمیت کی حامل تھی جو زیادہ تر دہلی، آگرہ، الہ آباد اور متھرا کے علاقے میں شہرت رکھتی تھی۔ اس کے بعد سنسکرت سے نکلنے والی دوسری ماگدھی پراکرت سے پالی کا وجود ہوا۔ پالی کی بنیاد اگرچہ گوتم بدھ کی تعلیمات کی وجہ سے مگدھ یعنی موجودہ بہار کے علاقہ میں ہوئی لیکن بدھ مت کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے اس آریائی زبان کے سنسکرت اثرات نہ صرف ہندوستان کے مختلف خطوں میں

بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئے۔ ہندوستان کے جنوب میں بھی بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا جس کی منہ بولتی تصویریں دکن کے علاقے ایلورہ اور اجنتا کے غاروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ساتھ سنسکرت کی شاخ پالی زبان بھی دکن کی طرف پھیلنے لگی۔ اس کے علاوہ چین، جاپان، برما اور ملیشیا کے علاوہ یوروپی ممالک میں بھی بدھ مت کی تعلیمات کا سلسلہ پالی زبان کے ذریعہ فروغ پانے لگا۔ اس طرح پالی زبان کو ہند۔آریائی زبان کا موقف حاصل ہے اور آریاؤں کے ذریعہ ہندوستان میں پھیلنے والی زبان سنسکرت سے وجود میں آنے والی ماگدھی پراکرت کے توسط سے پانی پراکرت کا وجود ہوا جو بول چال کی زبان تھی لیکن گوتم بدھ کی تعلیمات کو اس زبان میں استوپا پر پیش کیا جانے لگا تو پالی زبان بھی تحریری زبان کے موقف میں آ گئی۔ پالی زبان کی تحریر کا انداز براہمی ہے جو بائیں جانب سے شروع ہو کر سیدھی جانب کی طرف پیش رفت کرتی ہے۔ سنسکرت زبان کے اصولوں اور اس کے انداز کو اختیار کرنے کی وجہ سے پالی زبان کو ہند آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔

18.3.1 اردو کا ہند۔آریائی موقف

اردو زبان اور پالی زبان کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کو جدید ہندوستانی زبان کا درجہ حاصل ہے جو ہند۔ آریائی کے عہد جدید میں وجود میں آئی جب کہ پالی زبان ہند۔آریائی کے عہد قدیم کے خاتمہ کے بعد عہد وسطی کے دور میں وجود رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے اردو کے مقابلہ میں پالی زبان کی قدامت مسلمہ ہے۔ پالی کے دور کا آغاز قبل مسیح میں ہوا۔ پالی لکھنے کا انداز وہی ہے جو آریائی زبان کا انداز قرار دیا جاتا ہے۔ سنسکرت کو آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ سنسکرت زبان کی قواعد میں موجود اصولوں کی پابندی پالی میں بھی موجود ہے اور اردو زبان میں بھی۔ دونوں بھی ہند۔آریائی زبانیں ہیں لیکن پالی کو وسطی ہند۔ آریائی زبان کا درجہ دے کر اس کے عہد کا تعین 600 قبل مسیح سے 600 عیسوی تک کیا جاتا ہے جب کہ اردو زبان بھی آریائی زبان ہے لیکن اس کے دور کا تعین ہند۔آریائی کے عہد جدید سے کیا جاتا ہے جس کے مطابق اردو کے آغاز کے دور کو 600 عیسوی سے 1300 عیسوی کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ پالی اور اردو میں وسطی دور اور جدید دور کا فرق ہے۔ پالی کا رسم براہمی ہے جو بائیں سے دائیں جانب لکھا جاتا ہے۔ سنسکرت سے نکلی ہوئی پالی بھی رسم الخط کے معاملہ میں سنسکرت کی نمائندگی کرتی ہے۔ سنسکرت کا رسم الخط ناگری کہلاتا ہے جب کہ پالی کا رسم الخط ناگری نہیں بلکہ براہمی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اردو زبان بھی سنسکرت سے وجود میں آنے والی شورسینی پراکرت سے نکلی ہے۔ شورسینی پراکرت سے شورسینی اپ بھرنش اور اس کے بعد مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں کھڑی بولی سے وجود میں آنے والی اردو زبان کا رسم الخط نہ تو ناگری ہے اور نہ ہی براہمی بلکہ اردو نے اپنے رسم الخط کے لیے عربی سے استفادہ کیا۔ چناں چہ اردو لکھنے کا طریقہ نستعلیق کہلاتا ہے جو سیدھی جانب سے بائیں جانب لکھا جاتا ہے۔ غرض پالی زبان سنسکرت کی شاخ اور ماگدھی پراکرت سے وجود میں آئی۔ اس کے بجائے اردو زبان نے پراکرتوں کے دور کے بعد زائد از چار ادوار کا احاطہ کرنے کے بعد ہندوستان میں جنم لیا۔ سنسکرت سے وجود میں آنے والی اولین زبان شورسینی پراکرت اور پھر اسی شورسینی پراکرت سے شورسینی اپ بھرنش کا وجود جس کے ذریعہ مغربی ہندی کی پیدائش کو سنسکرت کے تیسرے دور کا درجہ حاصل ہے اور اسی مغربی ہندی سے وجود میں آنے والی پانچ مختلف بولیوں میں کھڑی بولی سے اردو کا وجود ہوا۔ اس طرح پالی زبان پراکرت کے دوسرے دور میں وجود میں آئی جب کہ اردو زبان شورسینی پراکرت کے بعد چوتھے دور میں وجود میں آئی۔ پالی زبان کو فروغ

دینے میں بدھ مت کی تعلیمات کو اہمیت حاصل ہے تو اردو زبان کو فروغ دینے میں صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی تعلیمات کو کسی اعتبار سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح پالی کو دوسرے دور کی ہند۔آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے تو اردو کو چوتھے دور کی آریائی زبان کا موقف حاصل ہے۔ دونوں زبانوں کی طرز تحریر میں براہمی اور نستعلیق رسم الخط کا فرق ہے۔

18.3.2 پالی کی روایتی خصوصیات

لسانی پس منظر میں بتایا جا چکا ہے کہ پالی زبان کا وجود پراکرتوں سے عمل میں آیا۔ ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول شورسینی پراکرت کے بعد دوسری بڑی مقبول ترین بول چال کی زبان کی حیثیت سے ماگدھی پراکرت کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ ماگدھی دور کو روایات کا پاسدار قرار دیا جاتا ہے۔ پالی کی روایتی خصوصیت میں سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ پالی کا ادب زیادہ تر جاتک کتھاؤں پر مشتمل ہے، جن میں بیشتر اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی اور سماجی باتوں کی نمائندگی کے لیے مہاتما گوتم بدھ کو ہیرو کی طرح پیش کرتے ہوئے ہمدردی، صلہ رحمی، جانوروں سے محبت اور بڑوں کا ادب چھوٹوں سے محبت اور ضعیفوں سے نیک سلوک کرنے کی تمام اچھی صفات کو گوتم بدھ اور ان کی زندگی سے مربوط کر دیا گیا ہے۔ شاہی محل کو خیر باد کہہ کر اپنی بیوی اور بچوں سے علاحدگی اختیار کر کے گیان حاصل کرنا اور تنہا زندگی گزارنا ہی بدھ مت کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ بدھ مذہب میں خدا کی پرستش اور خدا کی وحدانیت کا کوئی تصور نہیں۔ خود مہاتما گوتم بدھ نے مورتی پوجا کی ہدایت نہیں کی لیکن ان کے انتقال کے بعد ایک فرقہ نے ان کے آثار کی پوجا شروع کی جب کہ دوسرے فرقہ نے ان کی پتھر میں تراشی ہوئی مورتیوں کی پرستش کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں پندرھویں قبل مسیح میں آریاؤں کا مذہب موجود تھا اور اس مذہب نے بھی مورتی پوجا کا تصور نہیں دیا لیکن ایک خدا یعنی برہما کو آریائی مذہب کے لوگ تمام خداؤں کا خدا مانتے تھے۔ گوتم بدھ نے خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کے بجائے انسان کے عمل کو اہمیت دیتے ہوئے ہندو مت کے تمام روایتی فلسفوں سے علاحدگی اختیار کی۔ چناں چہ بدھ مت میں پنرجنم کا تصور موجود نہیں۔ اس کے علاوہ انسان کی موت کے بعد اس کے پاپ ڈھل جانے تک دوبارہ جنم کے طریقہ کو بھی گوتم بدھ نے نظر انداز کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ گوتم بدھ نے اپنے دور کی روایات سے الگ روایت قائم کی۔ بدھ مت نے انسان کو مختلف خواہشات سے دور رہنے کی تعلیم دی۔

18.3.3 اردو کی جدید خصوصیات

پالی زبان کی قدامت اپنی جگہ مسلمہ ہے کیوں کہ اس زبان کا آغاز ہی قبل مسیح میں ہوا اور پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی تک جب کہ اردو کا ابتدائی دور شروع ہو رہا تھا پالی زبان کو زوال آ گیا۔ دونوں زبانوں میں چند مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پالی کو بھی بدھ مت کی تعلیمات کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا۔ اس کے مقابل اردو زبان کو بھی صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی تعلیمات اور مذہبی عقائد کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے پالی زبان میں ابتدائی ادبی ذخیرہ جاتک کتھاؤں پر مبنی ہے۔ جب کہ اردو زبان کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو پھیلاتے ہوئے صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے اردو میں مخطوطات اور تذکروں کی بنیاد رکھی۔ اس کے علاوہ اردو کے ابتدائی دور میں صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے عوامی زبان

کو اظہار کا ذریعہ بناتے ہوئے ابتدائی طور پر شاعری کے مختلف نمونے، نور نامے، لوری نامے، چکی نامے کے علاوہ ولادت نامے اور شہادت نامے لکھ کر مقامی باشندوں کو اسلامی تہذیب و ثقافت سے وابستہ کرنے کی کوشش کی۔ بدھ مت کے پرچار کرنے والے سادھوؤں اور سنتوں نے بدھ مذہب اور گوتم بدھ کی تعلیمات کو نقش کرنے کے لیے کاغذ اور قلم کے استعمال کے بجائے دیواروں اور پتھروں پر کندہ کرنے کی روایت کو فروغ دیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پالی اور بدھ مت کی تعلیمات کو اس وقت فروغ حاصل ہوا جب کہ لکھنے پڑھنے کی سہولت موجود نہیں تھی اور لوگ کاغذ کے قلم اور سیاہی بنانے سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے بجائے اردو کا فروغ اس وقت ہوا جب کہ انسان کو کاغذ، قلم اور سیاہی بنانے کا ہنر حاصل ہو چکا۔ اس لیے اردو کے دور کو جدید دور کی خصوصیات کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ چناں چہ اس زبان میں ابتدائی طور پر دکنی میں نہ صرف شاعری لکھی گئی بلکہ نثر نگاری کی دلیلیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح اردو زبان نے عربی، فارسی زبانوں کے بیشتر اصناف سے استفادہ کیا تو اس کے ساتھ ہی شعر و نثر میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بیشتر یوروپی زبانوں میں سے انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی کے علاوہ ہندی، جاپانی اور پنجابی زبانوں کی شعری اصناف سے استفادہ کیا۔ غرض یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان نے جدید دور کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے یوروپی دنیا کی شعری اور نثری اصناف کو اپنے تخلیقی ورثے میں شامل کیا۔ اس طرح پالی قدیم دور کی زبان قرار پاتی ہے تو اردو زبان کو جدید دور کی زبان کا موقف حاصل ہے۔

18.4 پالی کا ہندوستانی مزاج

لسانی پس منظر میں یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستان جیسے طویل وعریض ملک کی آبادی میں قبل مسیح کے دوران ہی دو زبانوں کے افراد میں تصادم کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ آج کے دور میں بھی ان دو ذاتوں کی نمائندہ ہندوستانی زبانیں رائج ہیں۔ شمالی ہند میں موجود آریاؤں کے تسلط سے ہند۔ آریائی زبانوں کا رواج عام ہوا جب کہ جنوبی ہند میں دراوڑیوں کے تسلط کی وجہ سے دراوڑی زبانوں کی روایت قائم ہوئی۔ آریائی زبانوں میں بھی ہندوستانی مزاج کی نمائندگی دکھائی دیتی ہے اور اس کے ساتھ دراوڑی زبانیں بھی اس ملک کی زبانیں ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے مزاج کی نمائندگی کرتی ہیں۔ زبانوں کے ان دونوں اثرات کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ پالی زبان میں اس ملک کے تمام آریائی زبانوں کے اثرات موجود ہیں۔ اس زبان میں لکھی جانے والی جاتک کتھاؤں کا تعلق بھی ہندوستان کی سرزمین یعنی سابقہ مگدھ اور موجودہ بہار کی سرزمین سے وابستہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ پالی زبان کے لکھنے والوں نے داستانوں، حکایتوں اور تمثیلوں کے طریقوں کو خیر باد کہہ کر حقیقت کی آمیزش سے مبالغہ آمیز قصوں کی بنیاد رکھی۔ آریائی زبان کی حیثیت سے پالی کے وجود میں آنے سے پہلے سنسکرت میں ''پنچ تنتر کی کہانیاں'' اور ''ہتوپدیش'' کا بہت بڑا ذخیرہ وجود میں آ چکا تھا۔ اس کے علاوہ چار ویدوں کی سنسکرت زبان کے ذریعہ فلسفہ، حکمت، مذہب، اخلاق، تہذیب شائستگی ہی نہیں بلکہ حساب، معرفت اور جغرافیہ جیسے علوم بھی عام ہونے لگے تھے۔ ان ہندوستانی خصوصیات سے بدھ مت کے ماننے والوں نے ضرور استفادہ کیا اور پالی زبان میں پہلی مرتبہ Hero Worship یعنی ہیرو پرستی کی کہانیوں کا آغاز ہوا۔ جن میں مہاتما گوتم بدھ کو مرکزی حیثیت اور ان کے اطراف اپسراؤں کو پیش کر کے ایسی کہانیاں لکھی گئیں جو ''پنچ تنتر'' اور ''ہتوپدیش'' کی کہانیوں سے بالکل مختلف تھیں۔ پالی میں لکھی جانے والی تمام تر جاتک کتھاؤں کا مرکز گوتم

بدھ ہیں لیکن ان کہانیوں میں تہذیب واخلاق اور رسم ورواج کے تمام تر ہندوستانی طریقے ہی نہیں بلکہ پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام معاملات کو ہندوستانی انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کی منہ بولتی تصویریں اجنتا کے غاروں میں آج بھی محفوظ ہیں اور پتھروں میں کندہ کیے ہوئے نقش آج بھی ایلورہ کے غاروں کے ذریعہ یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ بدھ مت کی تعلیمات کو لکھنے سے زیادہ کندہ کرنے اور تصویروں کی زبانی ہی نہیں بلکہ پتھروں میں تراشنے کے ذریعہ اہمیت دی گئی۔ ہندومت کی طرح بدھ مت میں بھی رہبانیت کی تعلیم کا انداز ملتا ہے جو ہندوستان کی خمیر کا حصہ ہے۔ جس طرح ہندو سادھو، رشی اور منی، ترک دنیا اور ترک تعلق کر کے خدا سے لو لگانے میں مصروف رہتے تھے اسی طرح بدھ بھکشو بھی نفسانی خواہشات کو مارنے اور شادی نہ کرتے ہوئے مجرد زندگی گزارنے کو اہمیت دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں پالی زبان کے ذریعہ شہرت حاصل کرنے والے بدھ مذہب کے ماننے والوں میں شادی کا تصور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی آبادیاں کم ہوتی گئیں۔ پالی میں رہبانیت اور مجرد زندگی گزارنے کو اہمیت دی گئی ہے جو بدھ مت کی تعلیمات کا اثر ہے۔ پالی میں اس انداز کو بھی ہندوستانی مزاج کا علم بردار قرار دیا جائے گا۔

18.4.1 اردو کا ہندوستانی مزاج

اردو زبان کو ہند۔ آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس زبان کے تمام مصادر سنسکرت سے وابستہ ہیں۔ اصلی مصدر اردو کی بنیادی شناخت ہے۔ تمام سنسکرت الفاظ اردو میں شامل ہو کر اصلی مصدر بناتے ہیں جیسے جانا، آنا، کھانا، پینا، رونا، ہنسنا، کھولنا، پکڑنا، دوڑنا، چھوڑنا، دیکھنا، سننا، سونگھنا، بولنا، کہنا، سیکھنا، سمجھنا وغیرہ کو اردو میں اصلی مصدر کہا جاتا ہے۔ ان مصادر میں لفظ کے ساتھ ہی ''نا'' یعنی علامت مصدر بے ساختہ جڑ جاتا ہے۔ اس کے بجائے اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ کے علاوہ عربی اور فارسی الفاظ کو مصدر میں تبدیل کرنا ہو تو عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ ''نا'' جیسا مصدر شامل نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ عربی اور فارسی ہی نہیں بلکہ انگریزی زبان سے آنے والے الفاظ کو مصدر بنانا ہو تو باضابطہ کرنا یا ہونا کا استعمال کرنا پڑے گا۔ اس قسم سے بننے والے مصدر ''وضعی مصدر'' کہلاتے ہیں۔ جیسے صاف کرنا، معاف کرنا، بات کرنا، راج کرنا، رام کرنا اور جھوٹ بولنا وغیرہ۔ یہی نہیں بلکہ سوال کرنا، جواب دینا، فون کرنا، گاڑی چلانا، صورت دیکھنا وغیرہ بھی ''وضعی مصدر'' کہلاتے ہیں۔ غرض اردو میں لاتعداد سنسکرت الفاظ راست ردوبدل کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے سنسکرت میں ''سوریہ'' کا استعمال ہوتا ہے جسے اردو والے سورج کی حیثیت سے استعمال کر چکے ہیں۔ اسی طرح سنسکرت میں چندر بہ معنی چاند استعمال ہوتا ہے۔ اردو والے چندر کی بدلی ہوئی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اردو جملوں کی ساخت میں پہلے فاعل کا استعمال پھر مفعول اور آخر میں فعل کا استعمال خالص سنسکرت کے جملے کی قواعد کی بنیاد ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان نے سنسکرت الفاظ میں تراش، خراش کے ساتھ انھیں قبول کیا۔ اردو شاعری اور نثر میں بعض بیرونی عناصر بھی شامل ہیں۔ اردو کے اسما اور صفت کو چھوڑ دیا جائے تو اردو جملہ کا ڈھانچہ خالص ہندوستانی روایت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے ہندو رشی، منی کی طرح ترک دنیا کرنے والے افراد کو اہم مقام دیا جو ہندوستانی مزاج کی نمائندگی ہے۔ اسی طرح بدھ مت کے ماننے والوں نے اپنے گرو کی حیثیت سے گوتم بدھ کو مرکزی حیثیت دی تو اردو والوں نے بزرگوں اور صوفیائے کرام کے توسط سے ''تصور شیخ'' کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اردو زبان نے صرف سنسکرت زبان سے ہی استفادہ نہیں کیا بیشتر سنسکرت اور پالی کے خیالات کے استفادہ کرتے

ہوئے بزرگان دین کے تذکرے لکھے تو ان تذکروں میں بھی Hero Worship کا رجحان واضح ہوتا ہے جس سے اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو زبان نے ہندوستانی پیدائش کی وجہ سے بیشتر ہندوستانی مزاج کے طریقوں کو اپنے شعر وادب میں شامل کیا۔

18.5 پالی میں آریائی عناصر

ڈاکٹر گریرسن نے اپنے لسانی جائزہ میں یہ بات واضح کی ہے کہ وسطی ہند۔آریائی زبانوں میں بول چال کی زبان کی حیثیت سے ماگدھی پراکرت اور اسی مگدھ کے علاقہ میں گوتم بدھ کی تعلیمات اور اشوک اعظم کی لاٹوں پر لکھی ہوئی زبان میں پراکرت کے اثرات کم اور آریائی اثرات زائد ہیں۔مگدھ کے کچھ علاقوں میں ارد ماگدھی بولی جاتی تھی۔اس زمانہ میں سنسکرت کے ناٹک کھیلے جاتے تھے اور ان ناٹکوں میں نیچ ذات کے کرداروں کے ذریعہ جس زبان کو فروغ حاصل ہوتا تھا وہ آریائی زبان کی ایک شکل یعنی پالی ہوا کرتی تھی۔ پالی نے بھی سنسکرت کے اثر کو قبول کیا۔تحقیقات کی بنیاد پر یہ بتانا مشکل ہے کہ پالی پراکرت سے پانی پراکرت کا وجود کب ہوا اور کس دور میں سنسکرت اثرات کو قبول کرتے ہوئے پالی زبان نے اپنا اثر واضح کیا تاہم یہ ثبوت ضرور ملتا ہے کہ گوتم بدھ نے اپنے دور میں آریائی ذہنی تحفظات اور ان میں پیدا ہونے والے ذات پات کے جھگڑوں کے خاتمے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ سنسکرت کے بجائے اپنے مذہب کے پرچار کے لیے پالی زبان کا استعمال کیا جائے۔اس دور میں سنسکرت کے ناٹک پیش ہوتے تو براہمنوں اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی زبان کی حیثیت سے سنسکرت ادا کی جاتی۔کلاسیکی سنسکرت کے بجائے ادبی سنسکرت کا آغاز ''سنسکرت وا کیم'' سے ہوا۔اردو میں وا کیم کو شستہ زبان کہا جا سکتا ہے۔اسی شستہ زبان سے پالی کا وجود ہوا اس نے دھرم کے پرچار کے لیے عوامی بولی کو اہمیت دی۔اس طرح صوبائی بولیاں فروغ پانے لگیں اور وہ سنسکرت سے ٹکر لینے لگیں۔ سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی۔سنسکرت کو ''دیو بانی'' کا رتبہ دیا گیا اور اس سے جو صوبائی بولیاں وجود میں آئیں ان میں بھی آریائی کا اثر موجود رہا اور یہی آریائی اثر لے کر پالی زبان اپنی جاتک کتھاؤں کا آغاز کرتی ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ پالی زبان کا وجود ایک صوبائی زبان کی حیثیت سے ہوا۔جس میں آریائی خصوصیات موجود تھیں لیکن گوتم بدھ کی تعلیمات کی وجہ سے اس زبان کو اہمیت حاصل ہوئی، پالی کو قدیم ماگدھی بھی کہا جاتا ہے۔ بدھ مت کے ماننے والے اسے پہلی زبان قرار دیتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ دیگر زبانیں اور سنسکرت بھی اسی زبان سے نکلی ہے۔پالی کے نمونے یا تو بدھ مت کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں یا پھر اشوک کی لاٹوں پر جو جنوب میں گنجم سے لے کر شمال مغربی صوبے کے علاقے شہباز گڑھی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ تحریریں دو رسم الخط میں ہیں۔ پہلا رسم الخط کھر دشٹری اور دوسرا براہمی کہلاتا ہے۔شہباز گڑھی اور مان سیرا کی تحریریں کھر دشٹری میں ہے جب کہ باقی تمام تحریریں براہمی میں موجود ہیں۔اشوک کے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم دو زبانیں رائج تھیں۔ شہباز گڑھی کی لاٹ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس پر لکھی ہوئی تحریر میں سنسکرت کا اثر گہرا ہے۔اس حقیقت کو بی ڈی گنے نے اپنی انگریزی کتاب ''تقابلی لسانیات کی مبادیات'' کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ پانی اور پالی کی سخت قید و بند کے باوجود سنسکرت کا ارتقانہ رک سکا اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعد کی سنسکرت میں نحوی قاعدوں میں خفیف سی تبدیلیاں کی گئیں۔اس طرح آریائی اثر پالی کی تحریری زبان پر نمایاں ہوا۔

18.5.1 اردو میں آریائی عناصر

ہم جانتے ہیں کہ سنسکرت سے پراکرتوں اور پھر اپ بھرنش کا وجود ہوا۔ شورسینی اپ بھرنش سے استفادہ کر کے مغربی ہندی نے سنسکرت کے قواعدی اصول برقرار رکھتے ہوئے پانچ بولیوں کو جنم دیا اور ان پانچ بولیوں میں استعمال ہونے والے الفاظ اور تراکیب میں آریائی زبان کے عناصر بہ درجہ اتم موجود رہے۔ اردو زبان میں ہندوستان کی آریائی زبان یعنی سنسکرت کے اثرات کو تلاش کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت جیسی آریائی زبان کا قواعدی ڈھانچہ فاعل، مفعول اور فعل کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو ہی نہیں بلکہ دیگر تمام آریائی جدید زبانیں جیسے ہندی، گجراتی، پنجابی اور مارواڑی میں بھی قواعد کے اسی قسم کے اصولوں کی پابندی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں میں آریائی زبان یعنی سنسکرت کا اثر غالب ہے۔ اردو میں اسما اور افعال ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ضمائر اور صفات کا استعمال عربی اور فارسی زبانوں کی لفظیات سے ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اردو کو اس کے قواعدی ڈھانچہ کی بنیاد پر آریائی زبان اور سنسکرت سے فیض حاصل کرنے والی زبان کی حیثیت دی جاتی ہے۔

18.5.2 پالی پر پراکرتوں کا اثر

ڈاکٹر گریرسن ہی نہیں بلکہ لسانیات کے اہم ادیب بی ڈی گنے نے یہ بات بتائی ہے کہ ویدک سنسکرت کے بہت سے لفظ پالی کے دور میں متروک ہو چکے تھے۔ اس کے بجائے سنسکرت کے الفاظ ارتقا پا رہے تھے۔ سنسکرت کے ساتھ ساتھ ہی پراکرتوں کا بھی ارتقا ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' میں واضح کیا ہے کہ دوسری پراکرتوں کے ابتدائی حالات کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن پالی کے اندر ہمیں اس پراکرت کی شکل دکھائی دیتی ہے جس میں پراکرت کے الفاظ کے تلفظ میں بگاڑ اور اس میں توڑ مروڑ کی سب سے پہلی کوشش ہندوستان کی مشرقی بولیوں میں ہوئی۔ ان بولیوں میں حروف صحیح (مصمتوں کا میلان) جذب پذیری کی طرف پایا جاتا تھا اور دندانی آواز جیسے ''ر'' کو ''ل'' میں تبدیل کیا گیا۔ یہ تمام خصوصیات آج بھی بنگال اور بہار کی بولیوں میں موجود ہیں۔ غرض پراکرتوں نے سنسکرت لفظیات کا تلفظ ہی نہیں بلکہ اس کے اظہار میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ جب 600 قبل مسیح کے لگ بھگ دوسری پراکرتوں کا عہد شروع ہوا تو مغربی یوپی ہی نہیں بلکہ دوآبہ اور پنجاب میں بھی لسانی تبدیلیاں رونما ہوئیں چناں چہ آج بھی ان علاقوں کی بولیوں میں انفی آوازوں کو مشدد لفظوں میں پیش کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ غرض عہد وسطی کی پراکرتوں کی نمایاں خصوصیات پالی زبان میں اپنا اثر دکھاتی ہیں۔

18.6 پالی اور اردو میں لسانی مماثلت

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ پالی نے ماگدھی پراکرت سے فیض حاصل کیا اور اردو نے شورسینی اپ بھرنش سے استفادہ کیا۔ دونوں میں فرق یہی ہے کہ پالی کا تعلق مگدھ کے علاقہ سے قائم ہے جسے موجودہ دور میں بہار کی ریاست کا درجہ حاصل ہے۔ پالی کو ایک زبان کی حیثیت سے مقبولیت اس وقت حاصل ہوئی جب کہ اس زبان میں گوتم بدھ کی تعلیمات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے پالی زبان پانی پراکرت کے دامن میں چھپی ہوئی تھی۔ اس زبان کی شناخت اور اس کی توسیع کے معاملہ میں اتنا ہی کہا

جاسکتا ہے کہ اپنی اصلی پراکرت سے پالی زبان نے مکمل طور پر اثرات قبول کیے جب کہ ویدوں کے قدیم سنسکرت دور کے انداز سے گریز برتتے ہوئے پراکرت کی روش کا اتباع کیا۔ اس کے مقابل جب اردو زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پالی کی ایجاد سے زائد از آٹھ سو سال بعد اردو زبان کا وجود ہوا۔ پالی زبان نے گوتم بدھ کی تعلیمات کی وجہ سے شہرت حاصل کی جس کے آٹھ سو سال بعد صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے اپنی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے اردو کا استعمال کیا۔ اس طرح پالی زبان اور اردو زبان میں مذہبی تعلیمات قدر مشترک ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو پر عرب، ایران اور ترکستان کے اثرات گہرے ہیں جب کہ پالی پر مقامی بولیوں کے اثرات کی برتری اپنی جگہ مسلمہ ہے۔

18.6.1 پالی اور اردو میں ادبی اختلاف

اصناف کے اعتبار سے جب پالی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو گوتم بدھ کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے پالی کو وسیلہ کی زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ پالی زبان نے ادبی طور پر ''جاتک کتھاؤں'' کا آغاز کیا جن میں ہیرو ورشپ کی روایت نمایاں ہے جب کہ اردو زبان نے پالی کی طرح سورماؤں کی کہانیوں کے بجائے ''داستان'' کی صنف کو اردو میں فروغ دیا۔ اسی طرح شاعری میں اردو زبان نے مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کی روایت عربی اور فارسی سے حاصل کی۔ اس کے بجائے پالی زبان میں شعری اور نثری اصناف کا تعلق خالص سنسکرت زبان کی شعریات اور نثریات سے وابستہ ہے۔ جس کی وجہ سے پالی اور اردو زبانوں میں ادبی اختلاف نمایاں ہوتا ہے۔ پالی نے ہمیشہ سنسکرت قواعد اور لفظیات پر توجہ دی جس کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا کہ پالی کے دور میں کسی دوسری بیرونی زبان کے اثرات بہت کم تھے جیسے اردو کی شروعات کے طور پر دکنی کا آغاز ہوا تو دکنی زبان نے مقامی اثرات کے بجائے عربی، فارسی اور ترکوں کے اثر کو نمایاں کیا۔ اس طرح پالی اور بدھ مت کا گہرا تعلق ہے جب کہ اردو میں صوفیا کرام اور بزرگان دین کی تعلیم کا اثر غالب ہے لیکن دونوں زبانوں یعنی پالی اور اردو میں موجود اختلاف کو محسوس کیا جاتا ہے۔

18.7 خلاصہ

قبل مسیح کی زبان پالی کے علاوہ ہند۔ آریائی کے عہد جدید سے تعلق رکھنے والی زبان اردو کے باہمی رشتہ کو ثابت کرنے کے لیے اس اکائی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ ہند۔ آریائی کے عہد وسطی میں پراکرتوں کا رواج تھا اور یہ دور 600 قبل مسیح سے 500 عیسوی تک کے عہد پر مشتمل ہے۔ اس زمانہ میں پراکرتوں کا وجود تھا۔ سب سے مقبول پراکرت شورسینی کے نام سے مشہور تھی لیکن قبل مسیح میں شورسینی پراکرت کے بجائے ماگدھی پراکرت سے وجود میں آنے والی پانِنی پراکرت اور اس کے توسط سے شہرت حاصل کرنے والی زبان پالی کہلاتی ہے۔ پالی زبان کو ہندوستان کی دوسری تحریری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس سے قبل ہند۔ آریائی کے عہد قدیم میں سنسکرت زبان چار ویدوں کے وجود کے ساتھ تحریری زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ پالی زبان کو تحریری زبان کا درجہ اس لیے حاصل ہوا کہ مہاتما گوتم بدھ نے اپنے مذہب کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے سنسکرت کے بجائے پالی زبان کا انتخاب کیا۔ اشوک کے لاٹ پر کندہ کردہ بدھ مت کی تعلیمات کا سلسلہ پالی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ قبل مسیح کی آریائی

زبان کی حیثیت سے پالی نے اس لیے منفرد زبان کا درجہ حاصل کر لیا کہ اس وقت تک سنسکرت میں ہندومت کی تعلیمات کا دور دورہ تھا جب کہ بدھ مت کی تعلیمات کے لیے پالی زبان کا استعمال کیا گیا۔ اسی لیے پالی کو اپنے عہد کی سب سے منفرد زبان کہا جاتا ہے جو مگدھ یعنی موجودہ بہار کے علاقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ بدھ مت کی تعلیمات کے علاوہ جاتک کتھاؤں کے ساتھ ساتھ پالی زبان نے بدھ مت کو فروغ دیتے ہوئے اس زبان کو ہندوستان کی سرزمین سے باہر کی سرزمین تک مشہور کر دیا۔ پاٹلی پتر سے نکل کر یہ زبان برما، چین، جاپان اور سری لنکا تک پھیل گئی کیوں کہ اشوک اعظم نے کالنگا کی جنگ میں قتل ہونے والے انسانوں کے خون کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر بدھ مت اختیار کر لیا تھا اور بقیہ زندگی بدھ مت کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس لیے بدھ مت کی تعلیمات اشوک کے لاٹ پر پالی زبان میں دکھائی دیتی ہیں۔ پالی کو ہند۔آریائی زبان کا موقف حاصل ہے جو ویدک سنسکرت سے استفادہ کر کے سنسکرت اور پھر عوامی سنسکرت سے ماگدھی پراکرت سے رشتہ جوڑتی اور اس پراکرت سے وجود میں آنے والی پانی پراکرت سے اپنی خصوصیات کو فروغ دیتی ہے۔ اردو بھی ایک ہند۔آریائی زبان ہے لیکن پالی زبان ہند۔آریائی دور کے عہد وسطی کی نمائندگی کرتی ہے جب کہ اردو زبان بھی سنسکرت سے وجود میں آنے والی مکمل آریائی زبان ہے لیکن اس زبان نے پالی زبان کے زائد از آٹھ سو سال بعد جدید ہند۔آریائی زبان کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ان دونوں زبانوں میں آریائی زبان یعنی سنسکرت کے قواعدی اصول یکساں ہیں اور فاعل، مفعول اور فعل کی روایت سے ان دونوں میں لسانی مماثلت پائی جاتی ہے۔ پالی زبان نے روایتی خصوصیات کو فروغ دیا جب کہ اردو زبان نے جدید تقاضوں کی تکمیل کی۔ پالی کا مزاج بھی ہندوستانی ہے اور اردو کے مزاج میں بھی ہندوستانیت موجود ہے لیکن اردو زبان نے اپنے اسما اور افعال کے لیے سنسکرت کے علاوہ عربی اور فارسی لفظیات سے استفادہ کیا جب کہ پالی زبان مکمل طور پر آریائی اور پراکرتوں سے مستفید ہوتی رہی۔ ہندومت میں بھی وحدانیت کی تعلیم موجود تھی اور بدھ مت میں بھی یہی تصور پایا جاتا ہے۔ دونوں مذاہب میں وحدانیت کا تصور موجود ہے لیکن بدھ مذہب نے مورتی پوجا کی مخالفت کی اور خدا کی پرستش سے بھی انکار کیا لیکن گوتم بدھ کے انتقال کے بعد بدھ مت دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جسے ہنایان اور مہایان کا درجہ حاصل ہے۔ ایک گروہ گوتم بدھ کی باقیات کی پرستش کرتا رہا جب کہ دوسرا گروہ ان کی مورتی پوجا کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو زبان میں ہندوستانی مزاج کی نمائندگی اس کی قواعد سے ہوتی ہے۔ اردو نے تمام شعری اور نثری اصناف کے تعین کے معاملہ میں عربی اور فارسی سے استفادہ کیا جب کہ پالی زبان مکمل طور پر آریائی زبان کے شعری اور نثری وسیلے کو اظہار کا ذریعہ بناتی رہی چناں چہ بھجن، کیرتن اور اشلوک کا رجحان پالی زبان کا حصہ ہے۔ اردو اور پالی دونوں زبانوں میں آریائی عناصر موجود ہیں۔ تاہم پالی نے ہند۔آریائی زبانوں سے اپنا ڈھانچہ مضبوط کیا۔ اردو نے ہند۔آریائی زبانوں کے علاوہ ہند۔ایرانی اور سامی زبانوں سے استفادہ کیا۔ اردو زبان نے عربی اور فارسی ہی نہیں بلکہ انگریزی کی شعری اصناف اور نثری اصناف سے استفادہ کیا لیکن پالی زبان پراکرتوں کا زیادہ سے زیادہ اثر ہونے کی وجہ سے پالی زبان کو روایتی زبان اور عصر حاضر کی نمائندگی سے دور مذہبی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ پالی اور اردو میں لسانی مماثلت اسی وجہ سے پائی جاتی ہے کہ یہ دونوں زبانیں پراکرتوں سے وجود میں آئی ہیں۔ اردو نے شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش سے استفادہ کر کے لسانی پس منظر میں ہندی کی شاخ کھڑی بولی سے جنم لیا جب کہ پالی زبان پراکرت کے دور کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس لیے دونوں زبانوں میں آریائی نسل کی مماثلت موجود ہے لیکن ادبی طور پر اختلاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پالی اور اردو کی نثر اور شاعری کا تقابل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے

کہ صرف مذہب کی تبلیغ کی وجہ سے پالی زبان کو اہمیت حاصل ہے اور اردو زبان نے مذہب کی تبلیغ کے علاوہ جدید علوم وفنون اور ٹکنالوجی کی خصوصیات کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اس لیے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ پالی کو ہندوستان کی کلاسیکی آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو کو جدید ہند۔آریائی زبان کا موقف حاصل ہے۔ اس طرح یہ دونوں زبانیں کسی حد تک مماثلت اور کسی حد تک اختلافات کے ذریعہ قدیم اور جدید دور کی روایت سے استفادہ کرتی ہیں۔ لسانی پس منظر میں پالی مرحوم زبان ہو چکی ہے جب اردو زبان میں شعر وادب کے نئے تقاضوں کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اس لیے پالی اور اردو میں موجود فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

18.8 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ پالی زبان کا تعارف کرواتے ہوئے قبل مسیح میں اس زبان کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ لسانی پس منظر میں پالی زبان نے کس زبان سے اشتراک حاصل کیا اور اس کی انفرادی خصوصیت بیان کیجیے۔

3۔ پالی کی منفرد خصوصیات بیان کرتے ہوئے اس زبان میں بدھ مت کی تعلیمات پیش کرنے کی وجوہات بیان کیجیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ اردو کے ہند۔آریائی موقف کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کے دور کی جدید خصوصیات کی نشان دہی کیجیے۔

2۔ پالی کے ہندوستانی مزاج کا احاطہ کرتے ہوئے اس زبان میں بدھ مت کی تعلیمات کی وجوہات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ پالی اور اردو میں لسانی مماثلت کی وضاحت کیجیے۔

18.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو : ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2015ء

2۔ ہند۔آریائی اور ہندی : ایس۔کے۔چٹر جی، کتابستان، امین آباد لکھنو 1973ء

3۔ پالی زبان (انگریزی متن) : انسائیکلو پیڈیا (وکی پیڈیا)، بہ توسط انٹرنٹ۔

4۔ فرہنگ ادبیات : سلیم شہزاد، منظر نما، مالیگاؤں 1998ء

5۔ لسانیات کیا ہے؟ : ڈیوڈ کرسٹل (ترجمہ نصیر احمد خاں)، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1988ء

اکائی 19 اردو اور نواح دہلی کی بولیاں

ساخت

19.0 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اردو اور نواح دہلی کی بولیوں پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نواح دہلی کے مفہوم کی وضاحت کرسکیں
- دہلی اور اس کے نواحی علاقوں کی بولیوں کی نشان دہی کرسکیں
- برج بھاشا اور بندیلی قنوجی، پنجابی اور لہندا کی خصوصیات کی وضاحت کرسکیں
- برج اور کھڑی بولی کے اثرات کو واضح کرسکیں اور
- نواح دہلی کی بولیوں کے اردو پر اثرات کی صراحت کرسکیں۔

19.1 تمہید

آریاؤں کے دور سے ہی دہلی اور اس کے نواحی علاقوں پر مختلف زبانوں اور بولیوں کے اثرات کا سلسلہ جاری رہا۔ آریاؤں کے دور میں دہلی کا وجود نہیں تھا بلکہ اس پورے علاقہ کو دوآبہ کہا جاتا تھا۔ اس علاقہ میں گنگا اور جمنا کا سنگم موجود ہونے کی وجہ سے آریائی دور میں اس علاقہ کو دوآبہ گنگ وجمن کہا جاتا رہا۔ اس تمام تر علاقہ پر آریا قابض تھے۔ موجودہ دور کے آگرہ، متھرا اور الہ آباد کے علاقہ کو دوآبہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس دور میں ہستناپور اور پاٹلی پتر کو اہم مقام حاصل تھا۔ رفتہ رفتہ آریاؤں نے دہلی کے نواحی علاقوں میں اقتدار قائم کرکے اس علاقہ کو آریاورتھ کا درجہ دیا اور اسی آریاورتھ میں چار ویدوں اور چار ذاتوں کا آغاز ہوا۔ اسی کے تحت چار ویدوں کی زبان سنسکرت کو فروغ حاصل ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ آگرہ، متھرا اور الہ آباد کے قریبی علاقہ آباد ہونے لگے جب مسلمانوں نے ان علاقوں پر قبضہ کیا تو رفتہ رفتہ یہ علاقہ مسلم حکمرانوں کے زیر نگیں ہوگیا جس کی وجہ سے اطراف واکناف میں انسانی آبادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جنگلوں کو کاٹ کر گاؤں بسائے گئے۔ سنسکرت سے وجود میں آنے والی شورسینی پراکرت سے پھیلنے والی شورسینی اپ بھرنش اور مغربی ہندی کا چلن عام رہا، یہ تمام زبانیں بول چال کی زبانیں تھیں۔ جب مغربی ہندی کی پانچ بولیاں وجود میں آئیں تو ان بولیوں کے اثرات دہلی کے باشندوں کی زبانوں پر نمایاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں شورسینی پراکرت، شورسینی اپ بھرنش کے علاوہ مغربی ہندی اور اس کی پانچ بولیوں برج بھاشا، کھڑی بولی، بندیلی، قنوجی اور لہندا کے اثرات دہلی کی زبان پر نمایاں ہوتے رہے۔ اسی رویہ کو دہلی کی زبان پر نواحی بولیوں کے اثرات کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اکائی کے ذریعہ اردو نواح دہلی کی بولیوں کے جائزہ سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اردو زبان نے اپنا لسانی مزاج برقرار رکھتے ہوئے دہلی کے اطراف میں موجود بولیوں کے اثرات کو بھی قبول کیا اس طرح اردو پر نواح دہلی کی بولیوں کے اثرات کا جائزہ درحقیقت اردو زبان اور اس کے فروغ میں ممکنہ مدد کرنے والی زبانوں کے لسانی اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔

19.2 نواح دہلی سے کیا مراد ہے؟

مسلمانوں کی آمد اور ان کی بادشاہت کے وقت بھی مقام دہلی کو اہمیت حاصل نہیں تھی بلکہ لاہور، قنوج، بھڑوچ اور پٹنہ کو مذہبی حوالے سے اہمیت حاصل تھی مسلمانوں نے رفتہ رفتہ ان علاقوں سے آگے بڑھتے ہوئے دہلی کو اپنے قبضہ اور تصرف میں لے لیا۔ عام طور پر یہ مقولہ مشہور ہے کہ دہلی سات مرتبہ بنی اور سات مرتبہ اجڑی، خاندان غلامان کے علاوہ خلجی خاندان اور تغلق

خاندان کے بعد مغل خاندان نے بھی ہندوستان پر حکمرانی کی تو اس وقت بھی دہلی کو کم اہمیت حاصل تھی۔ جب کہ آگرہ کو پایہ تخت کا درجہ حاصل تھا۔ غرض تاریخی پس منظر میں دہلی کو مرکزیت کا درجہ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی حاصل ہوا۔ عربی زبان میں ''نواح'' کے معنی مضافات اور اردگرد کے علاقہ کے ہوتے ہیں۔ عربی اسم ناحیہ کی جمع نواحی کہلاتی ہے جس کے معنی مضافات اور اردگرد کا علاقہ کے لیے جاتے ہیں، کسی بھی بڑے علاقہ کے اطراف واکناف یا اردگرد کے علاقوں کو نواح یا نواحی علاقہ کہا جاتا ہے۔ غرض دہلی اور اس کے اطراف میں موجود تمام گاؤں، دیہات اور علاقوں کو اس کے نواحی علاقوں کی حیثیت حاصل ہے۔ دہلی میں دوسرے علاقوں سے آکر بسنے والے افراد کی بڑی تعداد موجود تھی یہی وجہ رہی کہ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی آمد کے وقت تک بھی مختلف ممالک ہی نہیں بلکہ مختلف علاقوں کے لوگ رفتہ رفتہ دہلی کا رخ کرنے لگے تھے۔ عرب اور ترکستان کے علاوہ فارس اور ایران کے باشندوں نے بھی ہندوستان کی جانب پیش رفت شروع کر دی تھی اسی طرح مگدھ، قنوج، ردولی کے ساتھ ساتھ لاہور، پنجاب اور بھڑوچ ہی نہیں بلکہ گجرات، متھرا اور الہ آباد جیسے علاقوں سے دہلی کے قرب ونواح میں لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے نتیجہ میں ہر قسم کے افراد اور ان کی بولیوں کے اثرات دہلی کی زبان پر مرتسم ہوئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے مرید وخلیفہ سے امیر خسروؒ نے دو سخنے، پہیلیاں کہہ مکرنیاں اور انمیلیاں کے علاوہ فارسی اور اردو میں جو شعر لکھے ان پر دہلی کی اطراف واکناف کی بولیوں کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی سے ہی دہلی کی زبان پر اطراف واکناف کی بولیوں کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے، اسی لیے اردو زبان پر دہلی کی نواحی بولیوں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اردو زبان ایک مشترکہ زبان ہے۔ جس میں آریائی زبانوں کے اثرات ہی نہیں بلکہ دہلی کی سماجی بولیوں کے اثرات بھی موجود ہیں۔ کئی زبانوں کے علاوہ بولیوں کے اثرات قبول کرنے کی وجہ سے اردو کو ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس زبان میں کئی زبانوں اور بولیوں کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

19.2.1 دہلی اور اس کے نواحی علاقے

دنیا میں شہروں کے بسنے کی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب سرکاری سطح پر کسی جگہ کو اہمیت دی جاتی ہے یا پھر کوئی سادھو، سنت یا پھر پیر یا صوفی کسی مقام کو اپنی رہائش گاہ کے طور پر قبول کرتا ہے تو اس علاقہ کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دہلی کو دونوں خصوصیات کا درجہ حاصل ہے اس علاقہ کو بادشاہوں نے صدر مقام کی حیثیت سے منتخب کیا تو اس کے ساتھ ہی مسلمان صوفیا کرام اور بزرگان دین نے اس علاقہ کی عظمت میں اضافہ کرنے کے لیے یہاں سکونت اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی کو ہندوستان کے دل کا درجہ حاصل ہے۔ اس علاقہ میں بزرگوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیمات، مذہب کی تبلیغ وترویج، بادشاہوں کی طرف سے عوامی سرپرستی اور اقتدار کی وجہ سے مغربی ہندی سے وجود میں آنے والی کھڑی بولی نے مسلمانوں پر ثقافتی اثرات مرتب کیے تو اردو زبان پیدا ہوئی۔ اس زبان کو لاہور، قنوج، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بھی شہرت حاصل ہوئی لیکن دہلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے دہلی کے تمام تر علاقہ میں صوفیائے کرام کے ملفوظات اور ان کی تعلیمات کی وجہ سے سارے ملک میں خانقاہی نظام کو فروغ حاصل ہوا جہاں سماع کی محفلوں اور قوالی کو اہمیت دی گئی، جس کے لیے عارفانہ کلام کی ضرورت تھی۔ فارسی زبان سے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سرزمین پر پھیلنے والی نئی اردو زبان سے استفادہ کر کے بزرگان دین نے شاعری پھر نثر نگاری

کی بنیاد رکھی۔اس کے نتیجہ میں دہلی کو اردو شعر وادب کے مرکز کا درجہ حاصل ہو گیا۔حضرت امیر خسروؒ سے لے کر بعد کے دور تک یعنی میر تقی میر کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اردو کو اظہار کی زبان کا درجہ دینے میں دہلی کے شاعروں اور ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس لیے دہلی اور اس کے نواحی علاقہ جیسے آگرہ، متھرا، الہ آباد ہی نہیں بلکہ پنجاب اور گجرات کے علاقوں کے اثرات بھی اردو زبان کی بول چال اور تحریری زبان کا حصہ بننے لگے۔اس طرح دہلی کی زبان پر مختلف بولیوں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا جاتا ہے کہ دہلی بہ ذات خود آریائی زبانوں کے مرکز کا درجہ رکھتی تھی لیکن اس کے اطراف و اکناف میں ہند آریائی کے عہد وسطی کی بے شمار بولیوں کے اثرات نمودار ہوئے۔جنوبی بہار کی ماگدھی، پراکرت اور متھرا کی شورسینی پراکرت اور الہ آباد کی اردماگدھی پراکرت، کشمیر کے علاقہ کی پشاچی پراکرت کے اثرات بھی دہلی کی بولیوں سے مربوط رہے۔جب ہند آریائی کے عہد جدید یعنی 600ء سے 1300ء پر غور کیا جاتا ہے تو لسانی اعتبار سے اپ ناگر کو شمالی ہند کی لنگوا فرانکا کا درجہ حاصل تھا۔یہی نہیں بلکہ دہلی کی اردو زبان پر کھڑی بولی اور ہندوستانی کے علاوہ راجستھانی، پنجابی، گجراتی کے علاوہ براچڈ اپ بھرنش کے اثرات بھی محسوس کیے جانے لگتے تھے۔راجپوتانہ کے اثرات بھی دہلی کی زبان پر نمایاں ہوتے گئے اس طرح اردو زبان پر دہلی کے اندرونی گروہوں کے اثرات ہی نہیں بلکہ بیرونی گروہوں کے اثرات بھی نمائندگی کرنے لگے۔غرض اردو زبان پر دہلی میں فروغ کے دوران درمیانی زبان، شمال مغربی زبان اور مشرقی ہندوستان کے علاوہ جنوبی ہندوستان کی آریائی زبانوں کے اثرات محسوس کیے جاسکتے تھے۔اسی مطالعہ کو اردو پر دہلی کی نواحی بولیوں کے اثرات سے شناخت کیا جاتا ہے۔

19.2.2 نواحی علاقوں کی مختلف بولیاں

دہلی کے اطراف واکناف میں اگر چہ سندھ کی براچڈ کا اثر تھا جن میں لہندا اور سندھی کو اہمیت حاصل رہی لیکن اردو زبان نے بیرونی علاقوں کی زبان سے زیادہ اندرونی علاقوں کی زبانوں کے اثرات کو قبول کیا اگر چہ میتھلی، مگہی اور بھوجپوری جیسی زبانیں بھی مشرقی ہندوستان میں فروغ پا چکی تھیں لیکن بہاری، بنگالی، چھتیس گڑھی اور اودھی کا اثر دہلی کی اردو زبان پر دکھائی نہیں دیتا۔مدھیہ پردیش کی زبانوں میں کمایونی، گڑھوالی، مغربی پہاڑی، گجراتی اور راجستھانی کے اثر کو بھی اردو نے قبول نہیں کیا۔ راجستھان کی دوسری زبانیں جیسے مارواڑی، میواڑی، مالوی، جے پوری اور میواتی کے اثرات بھی اردو پر دکھائی نہیں دیتے۔ اگر چہ سندھ سے لے کر امبالہ تک بولی جانے والی زبان پنجاب کہلاتی ہے۔حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' کے ذریعہ اردو زبان کے تعلق کو پنجابی سے جوڑا ہے لیکن کھڑی بولی پر اس کے اثرات موجود ہیں۔مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں اوکو ترجیح دینے والی بولیوں میں برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کو لسانی اہمیت حاصل ہے جب کہ ''اَ'' کو ترجیح دینے والی بولیوں میں ہریانی اور کھڑی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اردو نے برج بھاشا سے ہی نہیں بلکہ بندیلی، قنوجی اور ہریانی سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔اسی لیے اردو کو جب دہلی کے علاقہ میں فروغ پانے کا موقع ملا تو اس زبان پر نواح دہلی کی بولیوں کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

19.3 نواح دہلی کی بولیوں کی شناخت

دہلی کے اردگرد اور اطراف واکناف میں دو قسم کی بولیوں کے اثرات موجود ہیں۔ کھڑی بولی کی زبانوں میں ''آ'' کی شناخت رکھنے والی دو زبانیں اہمیت کے حامل ہیں۔ جنھیں ہریانی اور کھڑی بولی کا درجہ حاصل ہے اس کے علاوہ مغربی ہندی سے اردو میں شامل ہونے والی دیگر تین زبانیں جیسے برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کا شمار ''او'' کو ترجیح دینے والی زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ اگر چہ ان پانچ بولیوں میں استعمال ہونے والے آخری الفاظ ''اَ'' اور ''او'' پر ختم ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت مغربی ہندی کی بولیوں میں اہمیت کی حامل ہے۔ اس پس منظر میں جب دہلی کی اردو زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دہلی کی اردو زبان نے ''اَ'' آواز والی زبانوں کے ساتھ ساتھ ''او'' آواز والی زبانوں سے استفادہ کیا اسی استفادہ کی وجہ سے محمد حسین آزاد کو مغالطہ ہوا اور انھوں نے اپنی کتاب ''آب حیات'' کے ذریعہ لسانی نظریہ پیش کیا کہ اردو ''برج بھاشا'' سے نکلی ہے۔ ان کے عہد میں آگرہ کے علاقہ میں ''برج بھاشا'' کا بہت زور تھا اور اردو لکھنے والے آئیو، دیکھیو، پڑھیو، سنیو، اور فرمائیو کا استعمال کرتے تھے اس کے بجائے مغربی ہندی کی دو بولیاں جیسے کھڑی بولی اور ہریانوی میں استعمال ہونے والے الفاظ ''اَ'' پر ختم ہوتے ہیں موجودہ لسانی نظریہ کے مطابق اردو چوں کہ کھڑی بولی سے نکلی ہے اسی لیے کھڑی بولی سے وابستہ تمام بولیوں سے اس کے ربط و تعلق کو قبول کیا جاتا ہے۔ ہریانی زبان کے علاوہ پنجابی، راجستھانی میں استعمال ہونے والے الفاظ جیسے افعال میں مارتا ہوں کے بجائے مارو ہوں اور مارے ہے کا استعمال نہ صرف راجستھانی بلکہ ہریانی اور پنجاب کے علاوہ دکنی میں بھی موجود ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نے دہلی میں فروغ کے دوران اپنی خصوصیات کو پھیلاتے ہوئے کھڑی بولی کی مختلف خصوصیات کو بھی لسانی اساس پر شامل کیا جس کی مثال ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے یہ بتائی ہے کہ ہندی ادبیات میں 700 عیسوی تا 1150 عیسوی کے دوران اٹھارہ (18) شاعروں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی آمد کے بعد سنسکرت کے اثر کو کم کرتے ہوئے اس دور کی مسلمانوں کی روایت کو اہمیت دی۔ اس دور کے ہندی ادب کو ''ویر گاتھا کال'' یعنی رزمیہ عہد کی شاعری کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں طویل رزمیہ نظمیں لکھی گئیں جو راسو کہلاتی ہیں۔ ان کے نام بھی موجود ہیں (i) وجے پال راسو، (ii) ہمیر راسو، (iii) کیرتی لتا، (iv) کیرتی پتا کا، (v) کھومان راسو، (vi) بیسلد یوراسو، (vii) پرتھوی راج راسو، (viii) جے چندر پرکاش، (ix) پرمال راسو، (x) ودیاپتی پداولی اور ان کے لکھنے والوں میں مشہور شاعر اکرم، فیض، نرپتی مالا، چند بردائی، مدھوکر، شری دھر کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ اگر چہ ان راسو لکھنے کے دوران شاعروں نے قدیم راجستھانی زبان کا استعمال کیا ہے لیکن ان میں عربی اور فارسی کی بول چال کے بے شمار الفاظ جیسے محل، انعام، نیزہ کے بجائے نیچا اور تازیانہ کے بجائے تاجنو کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ اس دور میں ہندوستانی لسانی پس منظر میں فروغ پانے والی زبانوں پر عربی اور فارسی کے اثرات مرتسم ہو رہے تھے۔ پرتھوی راج راسو کو چند بردائی لکھی ہوئی کھڑی بولی کی اہم کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ پرتھوی راج کی بہن پرتھا بائی سے منسوب کتاب ''دان پتر'' میں بھی کھڑی بولی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جس سے ثبوت ملتا ہے کہ دہلی کی مغربی ہندی سے وجود میں آنے والی کھڑی بولی کا اثر دہلی کی نواحی بولیوں اور اردو کا وسیلہ بنا تو اس اردو میں فروغ پانے والے عربی اور فارسی الفاظ کے اثرات ہندوستان کی مختلف بولیوں پر مرتسم ہوئے اور یہی اثرات دہلی کی نواحی بولیوں میں اپنی نمائندگی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

19.3.1 نواح دہلی کی بولیوں کی خصوصیات

دہلی اور اس کے اطراف و اکناف کے علاقوں میں اگرچہ کھڑی بولی کے اثرات غالب رہے لیکن برج بھاشا کی نمائندگی بھی آگرہ اور متھرا کے توسط سے اثر انداز ہوئی۔ بولی کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ تحریری شکل میں موجود نہیں ہوتی بلکہ بول چال کے طریقہ سے کسی دوسری زبان پر اثر انداز ہوتی ہے یہی صورت حال دہلی میں اردو کی ہوئی کیوں کہ اردو کا لسانی رشتہ کھڑی بولی سے اٹوٹ ہے۔ لیکن دہلی کے قرب و نواح میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے اثرات اردو زبان پر نمایاں طریقہ سے موجود ہیں۔ کوئی بھی بولی علاقائی حیثیت کی حامل اور اس کی اپنی تحریری شکل نہ ہونے کی وجہ سے وہ بہ آسانی بول چال کے توسط سے کسی بھی زبان کا حصہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دہلی میں بسنے والے اکثر افراد لاشعوری طور پر فعل کی ایسی صورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو کھڑی بولی سے مربوط نہیں جیسے دہلی میں بسنے والے اردو داں طبقہ میں فعل کی حالت کو تبدیل کرنے کا انداز محسوس کیا جاسکتا ہے چناں چہ ''آرہا، جارہا'' کے لیے ''آریا، جاریا'' اور ''کیا'' کے لیے ''کری'' اور ''کریا'' کی تراکیب کا دہلی میں مقامی بولیوں کے اثر کا نمونہ بنتا گیا۔ غرض یہ بات واضح ہے کہ دہلی کی تحریری زبان کی حیثیت سے اردو پر مقامی بولیوں کے اثرات کم ہوئے لیکن بول چال کی اردو میں مقامی اثرات اور بولیوں کے اثر کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

19.4 اردو پر مختلف بولیوں کے اثرات

اردو زبان کو ہند آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس زبان کے کھڑی بولی سے وجود میں آنے کا لسانی ثبوت ملتا ہے اس کے ہر لفظ کی شناخت ''اَ'' آواز سے ہوتی ہے لیکن اردو میں برج کی اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ برج کی شناخت ''او'' والے الفاظ سے ممکن ہے اردو میں آئیو، لکھیو، جائیو وغیرہ کا استعمال موجود ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو نے برج بھاشا سے استفادہ کیا ہے جو دہلی کی نواحی زبان ہے۔ برج کے علاوہ بندیلی اور قنوجی میں بھی الفاظ کی شناخت او سے ہوتی ہے۔ ان زبانوں کے اثرات بھی اردو پر دہلی کے پس منظر میں محسوس کیے جاسکتے ہیں جیسے بندیلی زبان میں گھروا، بلی وا، چری وا کا استعمال ہوتا ہے اور یہ الفاظ اردو میں بھی دہلی کی زبان کا حصہ ہیں۔ بندیلی کی طرح قنوجی کے اثرات کو بھی دہلی کی اردو نے قبول کیا۔ قنوجی زبان آج بھی ایٹہ، فرخ آباد، شاہ جہاں پور، کانپور اور ہردوئی میں پھیلی ہوئی ہے۔ قنوجی میں ''کہنے'' کے لیے کہی ''او'' اور ''جانے'' کے لیے جاتی ہو کا استعمال ہوتا ہے۔ دہلی کی اردو زبان پر اس کا اثر بھی ہے۔ دہلی کی اردو زبان نے اس سے بھی استفادہ کیا جس کی مثال میر عبدالواحد ہانسوی کی کتاب ''غرائب اللغات'' سے دی جاسکتی ہے۔ اس طرح دہلی کی اردو زبان پر ''او'' والی آوازوں کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ جس کے بعد اس سے مربوط آوازوں میں کھڑی بولی کے اثرات اپنی جگہ مسلمہ ہیں۔ اس طرح دہلی میں پروان چڑھتے ہوئے اردو زبان نے مختلف بولیوں کے اثرات کو قبول کیا۔

19.4.1 اردو پر برج بھاشا کے اثرات

دہلی کے نواحی علاقہ جیسے آگرہ اور متھرا میں برج بھاشا کا چلن عام تھا جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ برج بھاشا بھی مغربی

ہندکی ایک اہم بولی کا درجہ رکھتی ہے اس بولی کی خصوصیت یہی ہے کہ اس کے الفاظ ''او'' یا پھر ''وو'' کی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔اس انداز کالب ولہجہ اردوزبان کا نہیں لیکن دہلی کی نواحی بولی کی حیثیت سے برج بھاشا نے اردو کے بول چال ہی نہیں بلکہ تحریری زبان بھی اپنا بھاری اثر چھوڑا ہے۔اردو میں ''کہیو، پڑھیو، لائیو'' کا استعمال برج بھاشا کی بولی کے اثرات کے نتیجہ میں اردوتحریر کا حصہ بن گئیں۔اردو میں ان الفاظ کے استعمال کی وجہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لسانی طور پر اردوزبان نہ صرف برج بھاشا کے انداز سے متاثر ہے بلکہ برج کی لفظیات کی شناخت کے انداز کواردو میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔اسی لیے دہلی کے نواح کی بولی یعنی برج بھاشا کے اردو پر اثرات اور اس بولی کو دہلی کے اطراف واکناف کی بولی کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے کیوں کہ اس بولی نے دہلی میں پہنچنے والی اردوزبان کو اپنے لسانی اثر سے متاثر کیا۔اس طرح دہلی کی نواحی بولیوں میں اردو پر اثر انداز ہونے والی ایک اہم بولی کی حیثیت سے برج بھاشا کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

19.4.2 بندیلی کے اثرات

عام طور پر بندیل کھنڈ میں بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے بندیلی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔جغرافیائی اعتبار سے بندیل کھنڈ میں وہ علاقے شامل ہیں جن میں باندا، ہمیر پور، جالون اور جھانسی کے اضلاع اور مرکزی ہندوستان کی اکثر سابق ریاستوں کا بندیل کھنڈ میں شمار ہوتا ہے۔لیکن بندیلی زبان کا علاقہ اس سے زیادہ وسیع رہا، چناں چہ شمال میں آگرہ، مین پوری اور ایٹہ تک یہ زبان بولی جاتی تھی۔اس کے مشرق میں پوری ہندی کی بگھیلی بولی کا چلن عام تھا جب کہ شمال مغرب میں قنوجی اور برج بھاشا سے گھرے ہوئے اس علاقہ میں جنوب مغرب کی بولیوں سے متاثر ہو کر پیدا ہونے والی بولی بندیلی کہلائی۔ بندیلی زبان میں خصوصیت موجود ہے کہ اس کے تلفظ میں ''اے'' اور ''او'' جیسے الفاظ کو چھوٹے بنا کر ''اِ'' اور ''اُ'' بنا دیا جاتا ہے جیسے ''بیٹی'' کے بجائے ''بیٹا'' اور ''گھر'' کو گھروا'' کی تراکیب بدل دینا بندیلی زبان کی خصوصیت ہے۔اردوزبان میں اس کے اثرات یوں محسوس کیے جاسکتے ہیں کہ اردو نے لفظ ''کڑؤ'' سے ''کڑوا'' اور ''بیسؤ'' سے ''بیسوا'' کا استعمال جاری رکھا ہے۔اسی طرح ''جوڑ'' سے جوڑا''، ''توڑ'' سے ''توڑا'' جیسی لفظیات کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ دہلی کی اردوزبان پر بندیلی کے اثرات بھی موجود ہیں جو تحریری شکل میں نمایاں ہوتے ہیں۔آج بھی اردوزبان میں بندیلی کی خصوصیت کو نمایاں کرنے والے الفاظ مروج ہیں۔

19.4.3 قنوجی کے اثرات

مغربی ہندی کی اس بولی کو قنوجی کہا جاتا ہے جو شہر قنوج کے نام سے شہرت حاصل کرتی گئی۔ یہ شہر ضلع فرخ آباد میں موجود ہے۔ ہندوستان کے قدیم شہروں میں قنوج کا شمار ہوتا ہے۔سنسکرت کے قدیم ادب میں ہی نہیں بلکہ رامائن میں بھی قنوج کا ذکر ملتا ہے۔500 عیسوی کے درمیان یہ علاقہ راجپوت راجاؤں راٹھوڑ کے قبضہ میں آ گیا۔1193 عیسوی میں اس خاندان کے آخری راجہ جئے چند کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔آج کے دور میں بھی قنوجی زبان ایٹہ، فرخ آباد اور شاہ جہاں پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے اور یہ زبان اضلاع کانپور اور ہردوئی تک پھیلی ہوئی ہے لیکن کانپور میں بندیلی اور ہردوئی میں اودھی زبان سے متاثر ہو جاتی ہے۔شاہ جہاں پور کے شمال میں پیلی بھیت تک اس زبان کا چرچا ہے۔اس علاقہ میں وہ برج بھاشا کے اثر کو قبول

کر لیتی ہے اس طرح مغرب اور شمال مغرب میں برج بھاشا اور جنوب میں بندیلی نے اس زبان کو آگے بڑھنے سے روک دیا چوں کہ قنوجی کا رقبہ محدود ہے اور یہ مختلف اضلاع میں ملواں شکل میں بولی جاتی ہے۔ اس لیے اس کی شناخت مشکل ہے لیکن قنوجی زبان کی شناخت یہی ہے کہ یہ زبان عربی اور فارسی کے الفاظ ہی نہیں بلکہ سنسکرت اور مقامی الفاظ میں آخری سطح پر اس کا استعمال کر کے اپنی شناخت بناتی ہے۔ جیسے بعد سے بعدی، دور سے دوری اور روز سے روزی ہی نہیں بلکہ چھوٹی، گھوٹی اور سوجی کا استعمال بھی اس زبان کی شناخت کا ایک حصہ ہے چوں کہ اردو زبان میں اس قسم کے الفاظ کا استعمال موجود ہے اور قنوجی زبان نے حروف علت کی درمیانی ''ہ'' کو گرانے کی بنیاد رکھی جیسے ''کہی ہو'' کی بجائے ''کئی او'' اور اسی طرح ''سنے ہو'' کو ''سن ہو'' کے طور پر استعمال کیا۔ دہلی کی نواحی بولیوں کے اثرات کے ساتھ قنوجی کا اثر بھی اردو زبان پر دکھائی دیتا ہے۔ دہلی کے باشندے اکثر لفظ کے آخر میں ''ی'' کا استعمال اور حرف علت کے درمیانی ''ہ'' کو نظر انداز کر کے اردو میں بولتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کی اردو زبان پر قنوجی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔

19.4.4 لہندا کے اثرات

ڈاکٹر گریرسن کی لسانی تحقیق کے مطابق مغربی پنجاب کے علاقہ میں بولی جانے والی زبان لہندا کہلاتی ہے۔ اس نے زبانوں کی گروہ بندی کے پس منظر میں یہ ثابت کیا ہے کہ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے حدود کچھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ بعض سرحدی اضلاع کے اندر دونوں میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ لہندا پر دردیا پشاچ زبانوں کا اثر بہت گہرا ہے۔ مغربی پنجاب کے علاقہ ''کیکئے'' میں قدیم زمانے سے پشاچی پراکرت اور براچڈاپ بھرنش زبانیں بولی جاتی تھیں۔ لہندا جیسی زبان کو مغربی پنجابی، جاٹکی یا پھر ہندکی اور اچی کے ناموں سے بھی شہرت حاصل ہے لیکن ان تمام ناموں میں سب سے بہتر نام لہندا قرار دیا جاتا ہے جس کے لفظی معنی ''سمت مغرب'' کے ہوتے ہیں۔ لہندا میں کوئی ادبی کارنامہ انجام نہیں دیا گیا ہے، البتہ یہ زبان اپنی قواعد اور فرہنگ کے اعتبار سے مشرقی پنجابی سے بالکل مختلف ہے اور اس کا اپنا رسم الخط لنڈا ہے لیکن آج کل یہ زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔ اس زبان نے مغربی پنجاب کا اثر کو قبول کرنے کی وجہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زبان نے مغربی پنجابی خصوصیات کو اختیار کیا اور یہی اثرات دہلی کی اردو پر مرتسم ہوتے ہیں۔ اس لیے اردو کو دہلی میں فروغ حاصل ہونے کے دوران لہندا جیسی بولی کے اثرات مرتب ہونے کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہندا زبان دوآبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ اردو کے آغاز کے سلسلہ کو اس زبان سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ ثبوت ضرور ملتا ہے کہ مسلمان پہلے پہل ان ہی زبانوں کے علاقہ میں داخل ہوئے تھے اسی لیے لہندا کے اثرات اردو پر مرتسم ہونے کا ثبوت واضح ہو جاتا ہے۔

19.4.5 پنجابی کے اثرات

عام طور پر پنجاب کا اطلاق ان تمام علاقوں پر ہوتا ہے۔ دریائے سندھ سے لے کر ضلع امبالہ تک کے علاقہ میں بولی جانے والی زبانیں بنیادی طور پر پنجابی کا درجہ رکھتی ہیں۔ سب سے پہلے گریرسن نے لسانی جائزہ کے دوران یہ بتایا کہ لاہور کے مغرب میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اندرونی بولیوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اس زبان کو

مغربی پنجابی کا نام دیتا ہے۔ چناں چہ اس نے اس زبان کو بیرونی زبانوں کی فہرست میں رکھا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر گریرسن نے مغربی پنجابی اور مشرقی پنجابی میں امتیاز کیا ہے۔ درحقیقت پورے پنجاب کی زبان کی حیثیت سے پنجابی اپنی شناخت رکھتی ہے۔ یہ مشرقی پنجاب ہی نہیں بلکہ ریاست بیکانیر کے شمالی اضلاع اور ریاست جموں کے جنوبی اضلاع کی زبان ہے۔ مغرب میں یہ لہندا یا مغربی پنجابی اور شمال کے علاوہ شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں بارگر اور بیکانیری بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مشرق میں اس کے حدود مغربی ہندی کی دو بولیوں یعنی کھڑی بولی اور ہریانوی (بانگڑو) سے ملتے ہیں جس کی وجہ سے مشرقی انبالہ، کرنال، ریاست پٹیالہ، ضلع حصار کے مشرقی حصہ جیسے روہتک، گڑگاؤں اور ریاست دہلی کی زبان پنجابی ہی نہیں بلکہ کھڑی بولی (ہندوستانی) یا پھر ہریانوی ہے۔ ان علاقوں کو چھوڑ دیا جائے تو باقی تمام علاقوں میں پنجابی زبان بولی جاتی ہے۔ اس طرح مشرقی پنجاب کی زبان پنجابی قرار دی جاتی ہے۔ پنجاب اور مغربی ہندی کی بولیوں کے درمیان دریائے گھاگرا کی حد بندی موجود ہے۔ دریائے گھاگری کے مشرق میں چند سکھ مت کی آبادیوں کو چھوڑ کر باقی سارے علاقہ میں کھڑی بولی یا ہریانوی بولی جاتی ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں یہ ثابت کیا ہے کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح پنجابی زبان کا تعلق بھی قدیم زمانہ سے اردو کے ساتھ قائم ہے۔ جس کے نشانات جدید پنجابی میں بھی ملتے ہیں۔ گریرسن کے خیال میں معیاری پنجابی دوآبہ کی بولی ''ماجھی'' ہے جو امرتسر کے مرکز کا درجہ رکھتی ہے۔ ابتدائی یوروپ کے اسکالروں نے لدھیانہ کی زبان کو معیاری پنجابی قرار دیا ہے کیوں کہ یہ علاقہ انگریزی مشنری کا مرکز رہا ہے۔ پنجابی کی قواعد لکھتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ تحی آوازیں جیسے ''ل'' اور ''ڑ'' کو ایک ساتھ پڑھنا اور ''ن'' اور ''ڑ'' کو ایک ساتھ پڑھنا درحقیقت برج بھاشا میں نہیں ہے لیکن اس کا اثر پنجابی میں دکھائی دیتا ہے۔ پنجابی کا ہلکا سا اثر ''ل، ڑ'' اور ''ن، ڑ'' کا دہلی کی نواحی بولیوں پر دکھائی دیتا ہے۔ اردو بول چال میں پنجابی کے اس انداز کی نشان دہی دکنی زبان میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ جیسے ''نلڑا، کڑلا'' وغیرہ اردو لفظیات میں پنجابی کے زیر اثر ہے۔ دہلی کی نواحی بولی کی حیثیت سے پنجابی نے ضرور دہلی کی اردو پر اپنا اثر مرتسم کیا ہے۔

19.5 نواحِ دہلی کی بولیوں کے اردو پر اثرات

اردو زبان کو مشترکہ زبان کا درجہ حاصل ہے اور اس زبان نے جس علاقہ میں بھی پیش رفت کی وہاں کی زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ لسانی پس منظر میں اردو کو لاہور ہی نہیں بلکہ دوآبہ گنگ وجمن کی زبان کی حیثیت سے شناخت حاصل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو نے جہاں مختلف علاقوں کی زبانوں پر اپنا اثر چھوڑا ہے اس کے ساتھ ہی مقامی اثرات کو بھی حد درجہ قبول کیا ہے۔ دہلی اور اس کی نواحی بولیوں کے بیشتر اثرات اردو پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ہر علاقہ میں آریائی زبانوں کی مختلف شاخیں موجود تھیں۔ ان آریائی زبانوں کی مختلف شاخوں جیسے راجستھانی، پنجابی، گجراتی، مغربی ہندی کے علاوہ قنوجی، بندیلی، لہندا اور پھر برج کے علاوہ کھڑی بولی اور اور مارواڑی کے اثرات کو بھی نواحِ دہلی کے بولیوں کی حیثیت سے اردو زبان نے قبول کیا۔ اردو زبان میں موجود بھرپور صوتی ادائیگی صلاحیت کی بدولت اس زبان کو یہ سہولت حاصل رہی کہ وہ شمالی ہند کے مختلف خطوں میں بولی جانے والی زبانوں کو مکمل آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مارواڑی زبان کی ''وت'' اور برج کی ''او'' اور ''یو'' کے علاوہ ''وٗ'' کی آوازوں کو اردو نے قبول کیا۔ کھڑی بولی کی ''اَ'' والی آوازیں بھی اردو پر اثر انداز ہوئیں۔ بنیادی طور پر اردو

زبان نے دہلی میں پروان چڑھنے کے دوران برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات کو قبول کیا اس کے علاوہ نواحی بولیوں کے دیگر اثرات بھی اردو زبان پر دہلی میں فروغ پانے کے دوران نمایاں ہوئے۔ اس لیے یہ نتیجہ اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ نواح دہلی کی بولیوں کے اثرات اردو زبان پر شدید ہیں اور اتنے شدید اثرات ہندوستان کی کسی زبان نے نواحی بولیوں سے قبول نہیں کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کو ہندوستان کی مقبول ترین زبان کا درجہ حاصل ہے۔ غرض اردو زبان کی صوتیات اور لفظیات میں ہمہ گیری پیدا ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اس زبان نے تمام آریائی زبانوں کے عمدہ اثرات کو قبول کر کے اپنی زبان کو باوقار بنا دیا ہے۔

19.5.1 اردو پر کھڑی بولی کا اثر

مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کے لسانی نظریہ کو مصدقہ طور پر قبول کیا جا چکا ہے کہ اردو زبان کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ اس لسانی نظریہ کو عصر حاضر میں اردو داں طبقہ نے قبول کر لیا ہے۔ اردو کی تمام لفظیات کا اختتام ''اَ'' والی آوازوں پر ہوتا ہے اور لسانی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آ والی آواز صرف ان زبانوں میں استعمال ہوتی ہیں جو کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے لسانی نظریہ کے مطابق اردو کا تعلق کھڑی بولی سے ہے اس لیے کھڑی بولی کے تمام اثرات اردو میں موجود ہونے کا نظریہ اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ کھڑی بولی سے نکلی ہوئی اردو زبان کے مصادر، اسما، افعال اور صفات پر ''اَ'' والی آوازوں کا غلبہ ہے۔ اگر کوئی سانس لینا، دور جانا، گاڑی پکڑنا، اسکوٹر چلانا، مدرسہ جانا، پیٹ بھر کھانا کی تراکیب استعمال کر رہا ہے تو ان تراکیب میں مصدر کا ''نا'' شامل ہونا خود ثبوت فراہم کر رہا ہے کہ وہ ''اَ'' والی آواز پر ختم ہو رہا ہے جو کھڑی بولی کی شناخت ہے۔ غرض اردو زبان کھڑی بولی سے نکلی ہوئی ایک آریائی زبان ہے اس لیے اردو کی تمام لفظیات اور خصوصیات پر کھڑی بولی کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

19.6 نواح دہلی کی بولیوں کے اردو پر اثرات

کسی بھی علاقہ کی زبان کے اثرات دوسری زبان پر بلاشبہ مرتسم ہوتے ہیں۔ جو مثبت اور منفی دونوں قسم کے ہوتے ہیں۔ لازمی ہے کہ اردو زبان نے نواح دہلی کی تمام بولیوں میں نہ صرف بھوجپوری اور برج بھاشا سے استفادہ بلکہ بندیلی کے علاوہ قنوجی اور لہندا سے بھی استفادہ کیا۔ راجستھانی کا اثر بھی نواح دہلی کی بولیوں کے طور پر اردو پر دکھائی دیتا ہے لیکن اردو پر نواح دہلی کی دو اہم بولیوں کے نمایاں اثرات کے طور پر برج بھاشا اور کھڑی بولی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بلاشبہ اردو زبان نے لفظیات کی ترکیب اور صوتیات کی ہم آہنگی اور لفظوں کی نغمگی شاید اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ اردو زبان نے نواح دہلی کی مختلف بولیوں کے مثبت اثرات کو قبول کیا۔ جس طرح کوئی شہد کی مکھی مختلف باغوں کے پھولوں سے رس چوس کر شہد بناتی ہے اسی طرح نواح دہلی کی نمائندہ خصوصیات اور مثبت اثرات کو قبول کر کے اردو نے اپنے آپ کو مکمل طور پر گلدستہ کی حیثیت دے دی، جس میں کئی رنگ کے پھول ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں میں بہ طور خاص سنسکرت اور ہندی کے شعر و ادب کو بھی وہ امتیاز حاصل نہیں ہے جو اردو شعر و ادب کو حاصل ہو گیا ہے۔ دنیا میں کسی بھی زبان کے مشاعروں کو عوامی مقبولیت

حاصل نہیں جب کہ اردو مشاعرے عالمی سطح پر اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک ملی جلی زبان ہونے کی وجہ سے اردو کی لفظیات اور شاعری میں حسن کاری پیوست ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر زبان جب کسی دوسری بولی یا زبان سے استفادہ کرتی ہے تو نواحی زبان کے اثرات کے نتیجہ میں اگر بے شمار مثبت خصوصیات جلوہ گر ہوتی ہیں تو کئی منفی خصوصیات بھی زبان کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ہندوستان کی زبانوں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح کی زبانوں میں اردو کو حد درجہ حساس زبان کا درجہ دیا جاتا ہے کیوں کہ اس زبان میں شاعروں اور ادیبوں نے نہ صرف لفظیات کے ذریعہ ''لے'' اور ترنم کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ اس کے الفاظ میں موجود موسیقیت کی بنیاد پر یہ زبان نغمگی کی عمدہ صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو زبان نے نواح دہلی کے بولیوں سے وہی الفاظ اور لفظیات کا انتخاب کیا جن میں ترنم اور ''لے'' کی کیفیت موجود تھی۔ کئی ایسے الفاظ بھی ہیں جن کی ادائیگی اور لفظیات کی پیچیدگی کی وجہ سے یہ الفاظ غیر فصیح ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر سنسکرت زبان کی بولیوں میں ''ڈ'' اور ''ڑ'' کی آواز ثقیل مانی جاتی ہے۔ ایسے الفاظ اردو میں بہ کثرت استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے جھاڑ، گھٹ، چھوڑ، چھپر کھٹ، مرگھٹ، دھڑ، بھٹ اور جھٹ پٹ وغیرہ میں آخری لفظ کی صوتیات سے معنویت تو پیدا ہوتی ہے لیکن لے اور ترنم کی دنیا ضرور متاثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے پرہیز برتا گیا، ''ڈ، ٹ، ڑ'' اور بعض اوقات ہا کاری آوازوں سے بھی سماعت پر بوجھ معلوم ہوتا ہے لیکن اردو زبان نے ایسے بہت سے الفاظ کو اپنی زبان کا وسیلہ بنایا ہے۔

19.6.1 نواح دہلی کے اردو پر اثرات کا جائزہ

مختلف ذیلی عنوانات کے ذریعہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ نواح دہلی کے بہ کثرت اثرات اردو نے قبول کیے۔ جہاں تک نواح دہلی کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کا معاملہ ہے ان دونوں نواحی زبانوں نے اردو زبان پر نمایاں اثرات مرتب کیے، اس کے علاوہ ذیلی اثرات بھی دور دراز کی بولیوں سے اردو زبان پر نمایاں ہوتے ہیں۔ گجراتی اور راجستھانی جیسی زبانوں کے علاوہ پنجابی اور ہندی کے اثرات کو اردو زبان نے قبول کیا اور ان بولیوں اور زبانوں میں کشش اور دلچسپی رکھنے والی لفظیات کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان کے لکھنے والے شاعر اور ادیب بہ ذات خود اس سلیقہ کی حامل تھے کہ انھوں نے اپنی ضرورت کے اعتبار سے نواح دہلی کی بولیوں سے استفادہ کر کے ان لفظیات اور صوتیات کو قبول کیا جن میں نغمگی کا عنصر موجود تھا اور جن میں ترنم اور موسیقی کی کمی پائی گئی، انھیں نظر انداز کیا۔ غرض نواح دہلی کی بولیوں کے اثرات کو قبول کرنے کے دوران اردو والوں کی طلب اور دلچسپی کو بہر حال تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اگر اردو داں طبقہ جمالیاتی احساس کے بغیر نواح دہلی کی مختلف بولیوں کے لفظیات پر اپنا حق جتاتا تو بلاشبہ اردو کو عالم گیر شہرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ غرض اردو پر نواح دہلی کے اثرات کے جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ نواح دہلی کی بولیوں کی لفظیات سے اردو والوں نے ہیرے اور جواہرات کا انتخاب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں دوسری بولیوں کے اثرات بلاشبہ اردو کے وقار کو بلند کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

19.7 خلاصہ

اردو زبان نے مکمل طور پر آریائی زبان ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے دہلی میں فروغ حاصل کیا جس کے ساتھ دہلی کے اطراف واکناف کے علاقہ میں بولی جانے والی مختلف زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا۔قدیم دور سے لے کر جدید دور تک دہلی کو سلطنت کے قائم ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت حاصل رہی لیکن موجودہ دور کی ترقیات کی طرح دہلی کو فروغ حاصل نہیں ہوا تھا۔اس کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں اوران کے بولنے والے موجود تھے جو پایہ تخت کی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنے علاقہ چھوڑ کر دہلی میں بسنے لگے تھے۔جس کی وجہ سے دہلی میں فروغ پانے والی اردو زبان پر مختلف نواحی بولیوں کے اثرات مرتب ہوئے۔ نواح دہلی کی بولیوں سے مراد دہلی کے اطراف واکناف میں موجود زبانوں اور بولیوں کے اثرات کا جائزہ قرار دیا جائے گا۔دہلی کے نواح میں نہ صرف قنوج، پنجاب اور روہیل کھنڈ آباد تھے بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بندیل کھنڈ اور گجرات کے علاقہ بھی شامل تھے۔دہلی کے علاقوں میں برج کا اثر زیادہ تھا اور بھوجپوری بھی دہلی کی زبان پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ہر بولی کا رشتہ لسانی اعتبار سے آریائی زبان سے تھا جو سنسکرت سے آگے بڑھ کر پراکرت اور اپ بھرنش کے روپ میں ظاہر ہوئی۔نواح دہلی کی بولیوں میں صرف بندیلی اور قنوجی نے ہی اپنے اثرات کو اردو پر مرتسم نہیں کیا بلکہ لہندا اور راجستھانی زبان کے اثرات بھی اردو زبان پر اپنی چھاپ چھوڑے ہیں۔نواح دہلی کی تمام بولیوں کے مختلف اثرات، مختلف انداز کے رہے جن کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے اس اکائی میں بتایا گیا ہے کہ نواح دہلی کی بولیوں میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کا واضح اثر اردو زبان پر دکھائی دیتا ہے۔ برج کا سلسلہ ''او'' اور ''وو'' کے لفظیات سے وابستہ ہے۔اردو میں بولو، لکھو، پڑھو اور دوستو کے علاوہ عزیزو کا استعمال ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان نے برج کے اثرات کو قبول کیا ہے۔اس کے علاوہ اردو نے کھڑی بولی کی ''آ'' والی خصوصیت کو برقرار رکھا ہے جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اردو زبان نے برج اور کھڑی سے باضابطہ استفادہ کیا ہے۔ان تمام بولیوں کے اثرات کے جائزہ کے ذریعہ اس اکائی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نواح دہلی کی بولیوں کی وجہ سے اردو پر مثبت اثرات ایسے مرتسم ہوئے کہ لے اور ترنم والی لفظیات کو اردو نے قبول کیا جس کی وجہ سے اردو میں جمالیاتی احساس اور نغمگی کی خصوصیت پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں کے مقابلہ میں اردو کو عالمی سطح پر مقبولیت حاصل ہے۔جس کی مثال اردو کے عالمی مشاعروں سے دی جاسکتی ہے۔بے شمار منفی اثرات بھی اردو پر نواح دہلی کی بولیوں سے نمایاں ہوئے۔''ڈ، ڑ'' اور ''ٹ'' کی آوازیں صوتی اعتبار سے کراہت کا پتہ دیتی ہیں۔ایسے الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہوئے جو غریب الفاظ کا درجہ رکھتے ہیں جیسے تلملاہٹ، ہچکچاہٹ وغیرہ۔ان الفاظ کو اردو میں ضرور استعمال کیا گیا لیکن لے اور ترنم کے دوران اسے نمایاں نہیں کیا گیا۔غرض اردو زبان نے بے شمار زبانوں سے اور بے شمار بولیوں میں اردو کو اسی وجہ سے امتیازی مقام حاصل ہے کہ اس زبان نے نغمگی اور جمالیاتی خصوصیات کے حامل لفظیات سے لوگوں کے دل موہ لینے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔اس لیے اردو زبان کو دہلی اور اس کی نواحی بولیوں سے استفادہ کرنے کے نتیجہ میں شہد کی مٹھاس پیش کرنے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

19.8 نمونہ امتحانی سوالات

I۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ نواح کا مفہوم ظاہر کرتے ہوئے دہلی اور اس کے نواحی علاقوں کی وضاحت کیجیے۔

2۔ دہلی کے نواحی علاقوں کی مختلف بولیوں اور ان کے اردو پر اثرات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ نواح دہلی کی بولیوں اور ان کی خصوصیات پر جامع نوٹ لکھیے۔

II۔ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ نواح دہلی کی بولیوں میں بندیلی، قنوجی اور لہندا کے علاوہ گجراتی کے اردو پر اثرات کی نشان دہی کیجیے۔

2۔ نواح دہلی کی بولیوں میں سب سے زیادہ اثرات برج بھاشا اور کھڑی بولی کے ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟

3۔ نواح دہلی سے کیا مراد ہے؟ مختصراً بیان کیجیے۔

19.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	:	ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2015ء
2۔	لسانیات اور اردو	:	ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی، 1972ء
3۔	ہندوستانی لسانیات	:	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، 1975ء
4۔	اردو لسانیات	:	امیر اللہ خاں شاہین
5۔	اردو لسانیات	:	ڈاکٹر شوکت سبزواری، 1975ء
6۔	اردو میں لسانی تحقیق	:	ڈاکٹر عبدالستار دلوی، 1971ء
7۔	اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو	:	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، 1964ء

اکائی 20 اردو اور گجراتی

ساخت

20.0 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں اردو اور گجراتی کے لسانی رشتہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس اکائی کو مکمل کر لینے کے بعد اس قابل ہو

جائیں گے کہ:

- گجراتی زبان کی آریائی حقیقت کے بارے میں معلومات فراہم کرسکیں
- گجراتی زبان کے علاقے اور اس کے اسلوب کی نشان دہی کرسکیں
- گجراتی اور اردو زبان میں موجود لسانی مماثلت کو واضح کرسکیں
- گجراتی اور اردو زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات کی نشان دہی کرسکیں اور
- اردو اور گجراتی کے ربط اور اس کے لسانی موقف کو واضح کرسکیں۔

20.1 تمہید

اردو کی طرح گجراتی کو بھی ہندوستان کی ہند آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس ہندوستانی زبان کو گجرات کے علاقہ میں فروغ حاصل ہوا۔ قدیم گجراتی زبان کو 1100ء سے 1300ء تک ہندوستان میں شہرت حاصل ہوئی۔ گجرات کے علاوہ دمن، دیو، دادرا اور نگر حویلی کے علاقوں میں بھی گجراتی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا۔ جن بادشاہوں نے راجپوتانہ اور پنجاب کے علاقوں میں حکمرانی کی انھیں گوجر کہا جاتا تھا اور انھیں گوجر حکمرانوں کی زبان گجراتی کی حیثیت سے شہرت حاصل کرگئی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان کی آبادی کا 4.5% حصہ گجراتی زبان بولتا اور سمجھتا ہے۔ گجراتی بولنے والوں کی تعداد 2011ء کی مردم شماری کے مطابق 1.21 ہے جو گجراتی زبان سے واقفیت رکھتی ہے۔ گجراتی بولنے والوں کی تعداد 46 ملین قرار دی جاتی ہے جن میں سے 25 ملین گجراتی بولنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گجراتی کو دنیا کی 26 ویں اور زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اہم درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مہاتما گاندھی جیسے ہندوستان کے بابائے قوم اور محمد علی جناح کی مادری زبان بھی گجراتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے گجراتی زبان ایک آریائی زبان ہے۔ جسے قدیم گجراتی، وسطی گجراتی اور جدید گجراتی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ جدید گجراتی کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ہوا۔ یہ زبان بول چال کی زبان کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتی ہے۔ غرض ہندوستان کے علاقہ کے نام سے شہرت یافتہ گجراتی کو ساری گجرات کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے لیکن یہ زبان مرکز کے زیر اثر علاقہ جیسے دیو، دادرا، نگر اور حویلی میں بھی بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ گجراتی کو ہند آریائی کی جدید زبان کا موقف حاصل ہے۔ اس طرح یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان بھی آریائی زبان ہونے کے باوجود جدید زبان ہونے کا درجہ رکھتی ہے تو اس کے ساتھ گجراتی زبان کو بھی جدید آریائی زبان کا موقف حاصل ہے۔

20.2 اردو اور گجراتی کا تعلق

ہند آریائی زبانوں کی دو شاخوں کی حیثیت سے اردو اور گجراتی کو ہندوستان کی سب سے قدیم زبان سنسکرت سے نسبی تعلق کا موقف حاصل ہے۔ دونوں زبانوں نے اپنے الفاظ کے معاملے میں ہندوستان میں مقامی سنسکرت کے علاوہ بیرونی زبانوں جیسے عربی اور فارسی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ سنسکرت اور پراکرت میں جن الفاظ کا استعمال ہوا ہے انھیں تھوڑے سے ردو

بدل کے ساتھ اردو زبان ہی نہیں بلکہ گجراتی زبان نے بھی اختیار کرلیا ہے۔ انگریزی زبان میں Hand کہا جاتا ہے جب کہ سنسکرت میں اس لفظ کو ہستا لکھا گیا اور پراکرت میں ہتھا استعمال ہوتا ہے لیکن گجراتی اور اردو میں بھی اس سنسکرت لفظ کو ہاتھ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں Seven کے لیے سنسکرت زبان میں سپتا کا لفظ رائج ہے جب کہ پراکرت میں ستّا لکھا جاتا ہے اور اردو اور گجراتی میں سات ہی ہے۔ اسی طرح انگریزی میں جس عدد کو Eight کہا جاتا ہے اس کے لیے سنسکرت میں استرا اور پراکرت میں اٹھا لکھا جاتا ہے جب کہ گجراتی میں آٹھ اور اردو میں بھی آٹھ کا لفظ مروج ہے۔ انگریزی میں Snake کو سنسکرت میں سانپا اور پراکرت میں سپّا جب کہ گجراتی اور اردو میں سانپ کا لفظ مروج ہے۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ گجراتی اور اردو میں الفاظ کی مماثلت موجود ہے اس کے علاوہ اردو اور گجراتی کے افعال اور اسما میں بھی یکسانیت محسوس کی جاسکتی ہے اردو اور گجراتی زبان کیوں کہ ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے سنسکرت سے استفادہ کیا ہے اس لیے اردو اور گجراتی کی لفظیات میں مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ گجراتی زبان میں تدسم اور تدبھو کا استعمال یہ ثابت کرتا ہے کہ گجراتی اور اردو میں کی لسانی سطحیں ایک جیسی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ گجراتی زبان نے سنسکرت زبان اور پراکرت کے لب ولہجہ کو اختیار کیا تو اس کے بجائے اردو نے عربی اور فارسی کے اثرات بھی جذب کیے۔

20.2.1 اردو کا قدیم نام گجری

گوجیر قبیلہ کی زبان گجری نہیں بلکہ گجراتی کہلاتی ہے۔ اردو زبان کا ابتدائی ادب دکنی زبان میں دستیاب ہے۔ چناں چہ دکنی کے صوفی شاعر حضرت برہان الدین جانمؒ نے جب کتابیں لکھیں تو انھوں نے اپنی زبان کو دکنی یا اردو کی حیثیت سے نہیں بلکہ گجری کی حیثیت سے شناخت دی جس کی وجہ سے تاریخ کے ماہرین اور ادب کے تنقید نگاروں کو غلط فہمی کا شکار ہونا پڑا۔ اصل میں اردو کا قدیم نام گجری بھی ہے۔ جانم کے والد حضرت میراں جی شمس العشاق نے بھی کتابیں لکھیں تو ان کتابوں کی زبان کو گجری کہا لیکن اس سے مراد گجراتی نہیں بلکہ قدیم دکنی ہی لی جائے گی۔

20.2.2 گجراتی اور اردو

اردو کا قدیم لسانی روپ دکنی ہے۔ دکنی زبان نے بھی ہندوستانی لسانی پس منظر میں آریائی زبانوں سے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی اردو میں ہی نہیں بلکہ موجودہ اردو میں بھی گجراتی کے مختلف انداز تھوڑے بہت ردو بدل کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ دکنی میں لاحقہ بنانے کے لیے دکنی کے ادیبوں نے گجراتی زبان سے استفادہ کیا۔ انگریزی زبان میں Writer کے لیے سنسکرت میں لکھیک کا لفظ مروج ہے جب کہ گجراتی اور دکنی میں لیکھن ہار لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح جیتنے والے کو انگریزی میں Winner کہا جاتا ہے جب کہ سنسکرت میں وجیتا کہا جائے گا لیکن گجراتی اور دکنی میں جیتنار استعمال ہوتا ہے۔ اردو کی پرانی شکل یعنی دکنی نے سنسکرت لفظیات کے کچھ حروف کو لاحقہ میں تبدیل کیا اور کئی الفاظ کو نظر انداز کردیا۔ غرض دکنی زبان نے اپنے عہد کی دوسری زبانوں سے اسی حد تک استفادہ کیا جو اس کی فطرت کے عین مطابق رہے۔ اس طرح دکنی میں گجراتی کے تمام اثرات قبول نہیں کیے گئے لیکن جو قبول کیے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکن کے لکھنے والوں نے قدیم اردو کا استعمال کیا تو اس

میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے انداز کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ان میں گجراتی کو بھی آٹے میں نمک کے برابر کا درجہ حاصل ہے۔

20.3 گجراتی زبان کی تاریخ

لسانی اعتبار سے اردو اور گجراتی کا تعلق آریائی زبان سنسکرت سے ہے۔سنسکرت کی قدیم تاریخ اور عہد وسطی میں بھی جس طرح اردو زبان کا اندراج نہیں ملتا اسی طرح گجراتی بھی ہند آریائی کے قدیم اور وسطی دور میں موجود نہیں تھی۔اردو زبان کا لسانی رشتہ مغربی ہندی اور اس سے قبل شورسینی اپ بھرنش سے ہوتے ہوئے شورسینی پراکرت اور پھر سنسکرت سے وابستہ ہو جاتا ہے۔گجراتی زبان بھی سنسکرت سے استفادہ کرتی ہے۔لسانی پس منظر میں اس زبان کو گجرات کے علاقہ میں فروغ پانے کا موقع ملا۔قدیم گجراتی کا انداز بول چال کی زبان کا تھا رفتہ رفتہ اس زبان میں جب تحریری انداز پیدا ہوا تو یہ زبان دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے لگی۔گجراتی ادیب سب سے پہلے گجراتی اور کچی زبان لکھا کرتے تھے۔یہ دونوں زبانیں دیوناگری میں لکھی جاتی تھیں۔گجراتی زبان کو کچی ہی نہیں بلکہ پرکولی پراکرت سے قریبی زبان کا تعلق حاصل رہا ہے۔پرکولی فارسی میں لکھی جاتی ہے اس لیے کچی اور کولی زبان میں فرق پیدا ہوا اور پھر رفتہ رفتہ گجراتیوں نے کچ ضلع کو اپنے تصرف میں لے لیا جس کی وجہ سے کچ کی زبان بھی گجراتی قرار پائی۔گجراتی زبان پر فارسی اور عربی کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ترکستان اور افغانستان کے حملہ آوروں نے دہلی کی سلطنت پر جب اپنا تسلط قائم کیا اور ترک ومنگول کے علاوہ مغل سلطنت نے ہندوستانی زبانوں پر اپنا گہرا اثر مرتسم کیا تو اس کے اثرات گجراتی پر بھی ہوئے۔فارسی کے لفظ ''کہ'' کا استعمال گجراتی زبان میں نہ ہونے کے برابر تھا لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار اور ان کے عربی اور فارسی لب ولہجہ کے نتیجہ میں گجراتی زبان نے انگریزی کے متبادل That کے طور پر فارسی کے ''کہ'' کے استعمال کو اپنی زبان کا حصہ بنالیا۔کئی عربی اور فارسی اسما ہی نہیں بلکہ صفاتی خصوصیات کو گجراتی نے اپنی زبان میں منتقل کرلیا۔مکان، نصیب، شہر، میدان، سردی، بازو، چیز، زندگی، جوڑی، نزدیک، خراب اور لال جیسے بے شمار الفاظ آسانی کے ساتھ فارسی زبان سے گجراتی زبان میں منتقل ہوگئے۔گجراتی زبان تاریخی اعتبار سے سنسکرت سے نکلنے والی خالص ہندوستانی زبان ہے جو تیرہویں صدی عیسوی میں قدیم دور کو ختم کر کے وسطی دور میں داخل ہوئی اس زبان کا جدید دور اٹھارہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے گجراتی ادب کا ارتقا بھی عصری دور کا غماز ہے۔غرض آریائی زبان اور سنسکرت سے فیض حاصل کرنے کے باوجود بھی گجراتی زبان نے فارسی اور عربی زبان کی لفظیات سے بھرپور استفادہ حاصل کیا۔تاریخی پس منظر میں گجراتی نے ویدک سنسکرت اور قدیم سنسکرت سے فیض حال کیا جب کہ گجراتی کا وسطی دور پراکرت اور اپ بھرنش کا خوشہ چیں نظر آتا ہے۔گجراتی زبان تیزی سے اپنے علاقوں سے باہر شہرت پاتی رہی، جس کی چار اہم وجوہات بتائی جاتی ہیں۔شمال، مغرب، مشرق اور مغرب کے علاقوں میں گجراتی پھیلتی جارہی تھی پنجاب کے علاوہ سندھیا، بنگال میں بھی گجراتی کا چلن عام ہورہا تھا۔مغرب اور مرکزی علاقے ہی نہیں بلکہ جنوبی علاقوں میں بھی گجراتی کو فروغ حاصل ہورہا تھا مرکزی علاقے یعنی جن علاقوں میں گجراتی، راجستھانی، مغربی ہندی، پنجابی، لہندا اور سندھی بولی جاتی ہے وہاں گجراتی اور راجستھانی کا زور بڑھتا چلا گیا۔گجراتی اور راجستھانی کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ ان

دونوں زبانوں نے گجراتی زبان کوفروغ دینے میں اہم کردار نبھایا ہے اس طرح عصر جدید میں گجراتی کو جدید ہند آریائی زبان کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔

20.3.1 گجراتی ایک جدید آریائی زبان

اردو زبان کی طرح گجراتی زبان بھی جدید ہند آریائی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔آریاؤں کی آمد کے بعد گجراتی زبان کے لسانی پس منظر سے پتہ چلتا ہے کہ آریاؤں کے قدیم دور سے گجراتی زبان کا رشتہ قائم ہے۔گجراتی کا سلسلہ پراکرتوں اوراپ بھرنش سے وجود میں آتا ہے۔گجراتی ناگراپ بھرنش سے نکلی ہے جوشورسینی کا مغربی روپ ہے۔یہ کاٹھیاواڑ اور کچ کی زبان ہے۔قدیم راجستھانی اورقدیم گجراتی میں بہت کم فرق ہے۔اس زبان کواردو کی طرح ہندی، پنجابی اور بنگالی زبان کے مماثل جدید ہند آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔اس زبان نے ہندوستان کے علاقوں کے علاوہ یوروپی دنیا کے علاقوں کوبھی متاثر کیا ہے۔ہندوستان کے علاوہ یوگانڈا میں ایک لاکھ پچاس ہزار کی آبادی یوگانڈا میں گجراتی بولنے والوں کی ہے۔اسی طرح تنزانیہ میں پچاس ہزار کی آبادی گجراتی بولنے والوں کی موجود ہے۔اس کے علاوہ کینیا میں ایک لاکھ سے زیادہ اور پاکستان کے شہر کراچی میں بھی ایک لاکھ سے زائد افراد گجراتی زبان بولنے اور سمجھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔پاکستان کی گجراتی کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے قائدین کا یہ اندازہ ہے کہ صرف کراچی کے علاقہ میں تین ملین سے زیادہ لوگ گجراتی میں بات کرتے ہیں۔ماریشیس کے بہت بڑے علاقے میں بھی گجراتی بولی جاتی ہے اوراس کے کئی جزیروں میں گجراتی کا چلن عام ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گجراتی زبان نے ہندوستان میں اپنا تاریخی ورثہ رکھنے کے ساتھ پڑوسی ممالک ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف خطوں میں شہرت حاصل کی ہے۔شمالی امریکہ کے شہر نیویارک کے مختلف علاقوں اورٹورنٹو کے علاقوں میں ایک لاکھ پچھتر (75) ہزار سے زائد افراد گجراتی بولنے اور لکھنے میں ماہر ہیں۔کینیڈا کے علاوہ عظیم تر ٹورنٹو کے علاقوں میں بھی اردو، پنجابی اورتمل زبان کے بعد گجراتی کو وہاں کی اہم زبان کا درجہ حاصل ہے۔برطانیہ کے علاقہ ،لندن کے علاقہ اور شمالی مغربی لندن کے علاقوں جیسے برمنگھم، مانچیسٹر ،لیسسٹر ،کونٹی، براڈفورڈ اور لانسچر میں بھی گجراتی شہرت کی حامل زبان ہے۔یوگانڈا جیسے افریقی ملک میں بھی آباد پچاس ہزار سے زائد ایشیائی باشندے گجراتی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔برطانیہ کے طلبہ کے لیے گجراتی زبان کو جی۔سی۔ایس۔ای زبان کا درجہ حاصل ہے۔خود گجرات میں آباد افراد ہی نہیں بلکہ دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے گجرات میں بسنے والے افراد بھی گجراتی کو اپنی مادری زبان قرار دیتے ہیں جن میں پارسی افراد بھی شامل ہیں۔غرض ہندوستان کی اہم زبانوں میں گجراتی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے جوملک کی سولھویں سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔

20.3.2 گجراتی اورآریائی زبان میں مماثلت

آریائی زبانوں کی تحریر کے لیے مختلف رسم الخط اختیار کیے جاتے رہے۔سنسکرت زبان لکھنے کا انداز ناگری ہے کھڑی بولی سے وجود میں آنے والی ہندی زبان بھی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے لیکن آریائی زبان کی حیثیت سے ماگدھی پراکرت سے وجود میں آنے والی پالی زبان براہمی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس کے بجائے گجراتی کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے

کہ اس ہند آریائی زبان نے ابتدا میں عربی رسم الخط سے استفادہ کیا لیکن بعد میں دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرلیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گجراتی زبان ایک ایسی ہند آریائی زبان ہے جس نے بہ وقت اردو کی طرح عربی رسم الخط اور ہندی کی طرح دیوناگری رسم الخط اختیار کیا۔ جس دور میں گجرات کے علاقوں میں مسلمانوں کی حکمرانی کا سلسلہ جاری رہا اس وقت گجراتی کو عربی رسم الخط میں لکھا گیا، پھر بعد میں گجراتی کے جدید دور میں دیوناگری رسم الخط اختیار کرلیا گیا۔ اس اعتبار سے گجراتی کو یہ اہم موقف حاصل ہے کہ اس زبان نے ایک جانب کھڑی بولی کے اردو رسم الخط یعنی عربی طرز تحریر کو بھی اختیار کیا اور اس کے ساتھ ہندی کے طرز تحریر یعنی دیوناگری رسم الخط کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا۔

20.3.3 گجراتی رسم الخط اور اس کی شناخت

قدیم گجراتی اور جدید گجراتی میں یہی فرق محسوس کیا جاسکتا ہے کہ قدیم گجراتی کے لیے ویدک سنسکرت، پراکرتوں اور اپ بھرنش کے انداز کو اختیار کیا گیا لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ گجرات پر مسلمانوں کے اقتدار کی وجہ سے گجراتی زبان کو اس عہد تک عربی رسم الخط میں لکھا جاتا رہا۔ بعد میں جدید گجراتی طرز اظہار کے لیے اس زبان کے عربی رسم الخط کو بدل کر دیوناگری رسم الخط کی شروعات کی گئی۔ آج ہندوستان کے گجرات کے علاقے ہی نہیں بلکہ پاکستان کے علاقوں کچھ اور کراچی کے علاوہ دنیا کے مختلف خطوں میں گجراتی زبان کو حد درجہ اثر و رسوخ حاصل ہوگیا ہے آج کے جدید گجراتی لکھنے والے اپنے عربی رسم الخط سے بے نیاز ہوکر دیوناگری رسم الخط کی حمایت کرتے ہوئے اور ساری دنیا میں گجراتی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح گجراتی زبان کے رسم الخط کی حیثیت سے دیوناگری طرز تحریر کو موجودہ دور میں اس کی شناخت کا درجہ حاصل ہے۔

20.4 گجراتی کی آریائی خصوصیات

اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ گجراتی زبان لکھنے کا ابتدائی انداز عربی تھا اور بعد میں اس کا رسم الخط دیوناگری قرار دیا گیا، جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ گجراتی کو آریائی زبان کی حیثیت سے قبول کیا جانا چاہیے یا نہیں۔ جس طرح اردو مکمل طور پر آریائی زبان ہے اور اس میں سنسکرت کے قواعد کا انداز فاعل، مفعول، فعل کے طریقے کو روا رکھا جاتا ہے اسی طرح گجراتی زبان میں بھی قواعد کے اسی سنسکرت انداز کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق گجراتی زبان نے بھی عربی اور فارسی سے کئی الفاظ مستعار لیے لیکن ناگری رسم الخط اختیار کرلیا جب کہ اردو بھی گجراتی کی طرح آریائی زبان ہے لیکن فرق یہی ہے کہ آریائی زبان ہونے کے باوجود بھی اردو نے سنسکرت رسم الخط دیوناگری طرز تحریر کو اختیار نہیں کیا۔ اس لیے اردو کو آریائی زبان کا درجہ دینے کے باوجود بھی اس کے طرز تحریر کو عربی اور فارسی زبان سے مستعار لینے کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن گجراتی زبان مکمل طور پر آریائی انداز کی علم بردار ہونے کے باوجود اس زبان کے دو رسم الخط یعنی عربی اور ناگری کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی بلکہ گجراتی کو آریائی انداز کی زبان اور آریائی رسم الخط کو اختیار کرنے والی زبان کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے۔

20.4.1 گجراتی اور اردو میں مماثلت

جب گجراتی زبان میں اپنے رسم الخط کو عربی زبان سے اختیار کرلیا تھا تو اس زبان نے ایشیاء کی دو غیر ہند آریائی زبانیں جیسے فارسی اور عربی کا اثر اس زبان پر رہا۔ فارسی کو ہند آریائی کے بجائے ہند ایرانی زبان کا درجہ حاصل ہے، اس کے بجائے عربی زبان کو سامی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ گجراتی زبان نے نہ صرف ہندوستان کی آریائی زبان سے لفظوں سے استفادہ کیا بلکہ ایرانی زبان فارسی اور عرب کی زبان عربی سے بھی اپنے الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ اس پس منظر میں اردو زبان بھی ہند آریائی زبان ہونے کے باوجود فارسی جیسی ہند ایرانی زبان اور عربی جیسی سامی زبان کی لفظیات سے استفادہ کرتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح اردو زبان میں سنسکرت، عربی اور فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اسی طرح گجراتی زبان میں بھی عربی اور فارسی کے علاوہ مقامی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ شامل ہے۔ اسی لیے گجراتی زبان اور اردو زبان میں پہلی مماثلت یہ ہے کہ یہ دونوں زبانیں ہند آریائی زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں اور ان دونوں زبانوں میں ہند ایرانی ہی نہیں بلکہ سامی زبان سے استفادہ کا انداز پایا جاتا ہے اسی لیے ان دونوں زبانوں میں موجود مماثلت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گجراتی کو بھی عربی رسم الخط میں لکھا جاتا رہا ہے جب کہ اردو زبان آج تک بھی فارسی اور عربی رسم الخط سے استفادہ کرتی ہے۔

20.5 اردو اور گجراتی کا ربط

اردو کا رسم الخط نستعلیق کا درجہ رکھتا ہے لیکن اردو کو لسانی اعتبار سے کھڑی بولی کی اہم زبان کا درجہ حاصل ہے اور گجراتی بھی ہند آریائی لسانی پس منظر میں ناگراپ بھرنش کی ایک بولی کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو کا رسم الخط ابتدا سے ہی عربی اور فارسی سے ارتقا پذیر ہوا جب کہ گجراتی زبان بھی ابتدا میں عربی رسم خط میں لکھی جاتی رہی۔ کھڑی بولی ہندوستانی سے وجود میں آنے والی اردو اور ہندلسانی پس منظر میں شورسینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی اپ بھرنش سے راجستھانی، پنجابی، گجراتی کا وجود ہوا۔ ابتدا میں کوئی زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اردو میں سنسکرت الفاظ کو رد و بدل کے ساتھ قبول کیا گیا ہے جیسے چندر کو چاند اور سُرج کو سورج کے انداز سے اردو میں سنسکرت الفاظ کا استعمال رد و بدل کے ساتھ موجود ہے۔ چناں چہ اسی قسم کی خصوصیت گجراتی زبان میں بھی موجود ہے چوں کہ اردو گجراتی کھڑی بولی کی شاخیں ہیں اور شورسینی اپ بھرنش سے برآمد ہوئی ہیں۔ البتہ اردو پر پہاڑی بولیوں کے اثرات دکھائی نہیں دیتے جب کہ گجراتی میں پہاڑی بولیوں کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ گجراتی اور اردو زبان کی ابتدا اور ترقی کا ایک ہی دور ہے۔ مدھیہ دیش کی درمیانی زبانوں میں گجراتی اہمیت کی حامل ہے جب کہ اردو کا تعلق صرف مدھیہ دیش سے نہیں بلکہ سارے ہندوستان سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان سارے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن گجراتی زبان مدھیہ دیش کی درمیانی زبانوں کے لسانی رشتہ سے مربوط ہے اس لیے یہ زبان گجرات کے علاقے اور اس کے اطراف واکناف کے علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اردو کی طرح گجراتی کو ہندوستان گیر شہرت حاصل نہ ہوسکی۔ گجراتی کے علاقہ کا تعین کرتے ہوئے لسانی پس منظر میں یہ بتایا گیا ہے کہ کاٹھیاواڑ اور بڑودہ کے آس پاس کے اضلاع میں پھیلنے والی زبان گجراتی کہلاتی ہے۔ گجراتی کا نام اس وقت وجود میں آیا جب گوجروں نے چارسو تا چھ سو عیسوی میں ہندوستان کے

مختلف صوبوں سے دوری اختیار کر کے اس علاقہ میں سکونت اختیار کر لی۔ پنجاب کے دو شہر گوجرنوالہ اور گجرات کا نام ان ہی گوجروں کی نسبت سے شہرت کا حامل رہا۔ ڈاکٹر گریرسن نے مغربی ہندی، راجستھانی اور پنجابی کی طرح گجراتی کو اندرونی زبانوں کی فہرست میں شامل کیا ہے اور اس زبان کی شناخت یہی ہے کہ اس زبان میں ''س'' اور ''ہ'' کا تلفظ بالکل موجود نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ویدک دور سے موجودہ دور تک گجراتی زبان کا تسلسل برقرار ہے۔ یہ زبان مغربی ہندی کی برج بھاشا سے متاثر ہوئی ہے۔ اس کے اسما و افعال میں مغربی ہندی کی پیروی موجود ہے۔ لیکن برج بھاشا سے کافی متاثر ہے۔ ''ڑ'' اور ''ڑھ'' کی آوازوں کو گجراتی زبان میں ''ڈ'' اور ''ڈھ'' سے بدل دیا جاتا ہے۔ یہ خصوصیت دکنی میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ اردو اور گجراتی کا لسانی ربط انتہائی قریب ہے اور گجراتی نے عربی رسم الخط کو اختیار کر کے اردو سے قربت ضرور حاصل کی لیکن بعد میں اپنا رسم الخط بدل کر دیوناگری اختیار کیا تو اس کے باوجود بھی گجراتی الفاظ اور اسما کے علاوہ افعال میں وہی خصوصیت موجود ہے جو اردو زبان کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

20.5.1 اردو اور گجراتی کی لسانیات

تاریخی پس منظر میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' اور ڈاکٹر گریرسن نے اپنی کتاب ''Linguistic Survey of India'' کے ذریعہ واضح کیا ہے لسانی پس منظر میں اردو اور گجراتی کا تعلق ویدک سنسکرت سے قائم ہوتا ہے اور پھر ویدک سنسکرت سے سنسکرت کا وجود اور ان سے پانچ پراکرتوں کے بعد پانچ اپ بھرنش میں سے سب سے پہلی اور مشہور اپ بھرنش ''شورسینی'' سے اردو اور گجراتی کا تعلق ہے۔ شورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی کا وجود ہوا اور مغربی ہندی سے پانچ بولیوں میں کھڑی بولی اور اردو اور ہندی کا جس طرح راست ربط ہے اسی طرح شورسینی اپ بھرنش سے گجراتی کا وجود ہوا۔ اس لیے گجراتی میں سنسکرت کے اثرات اور اردو میں بھی سنسکرت کے اثرات الفاظ اور ان کے محل استعمال سے ثابت ہو جاتے ہیں۔ غرض اردو اور گجراتی زبانوں کا خاکہ ایک ہی دور میں تیار ہوا لیکن اردو نے سب حاصل کر لی اور گجراتی کو سولہویں صدی عیسوی کے بعد فروغ حاصل ہوا جب کہ اردو کے ابتدائی نقوش تیرہویں اور چودہویں صدی سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ غرض لسانی اعتبار سے اردو کو مغربی ہندی کی کھڑی بولی سے رابطہ ہے جب کہ گجراتی کا شورسینی اپ بھرنش سے وجود میں آنے والی چار زبانوں میں راجستھانی، پنجابی اور پہاڑی بولیوں سے لسانی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح اردو اور گجراتی کا لسانی جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی لسانی رشتہ کی زبانیں ہیں۔ گجراتی نے راست شورسینی اپ بھرنش سے استفادہ کیا جب کہ اردو نے شورسینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح گجراتی کو لسانی طور پر پہلے شروع ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن گجراتی ایک علاقہ کی زبان بن کر رہ گئی جب کہ اردو نے کھڑی بولی سے رشتہ استوار کر کے سارے ہندوستان کو اپنی لسانی اور ادبی شناخت کا ذریعہ بنا دیا۔

20.5.2 اردو اور گجراتی لفظیات میں مماثلت

گجراتی زبان کے آخری الفاظ ساکن ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی آواز بھی ''آ'' والی خصوصیت کی حامل

ہے۔ بیشتر اردو اور گجراتی الفاظ میں مماثلت ہونے کی وجہ یہی ہے کہ جس طرح اردو زبان پر صوفیائے کرام اور بزرگان دین کی تعلیمات کا اثر مرتسم ہوا اسی طرح گجرات کو بھی صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے مرکز کی حیثیت سے شہرت حاصل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو اور گجراتی میں عربی اور فارسی کے الفاظ میں تال میل نظر آتا ہے۔ عام اسماء ہی نہیں بلکہ افعال میں بھی سنسکرت الفاظ اردو اور گجراتی میں یکسانیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ سنسکرت میں ہستا اور گجراتی میں ہاتھ، سنسکرت میں سپنا اور گجراتی میں سات، سنسکرت میں اشٹا اور گجراتی میں آٹھ، سنسکرت میں ساپا اور گجراتی میں سانپ کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ گجراتی زبان نے جن سنسکرت الفاظ کو ردو بدل کے ساتھ اختیار کی وہی ردو بدل اردو میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ کو دکنی زبان نے جس طرح آسان کر دیا اسی طرح گجراتی نے بھی گاڑھے تلفظ کو آسان کر کے استعمال کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو اور گجراتی میں استعمال ہونے والے الفاظ میں بہت ساری مماثلتیں موجود ہیں۔ اسی لیے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو اور گجراتی کی لفظیات ایک دوسرے سے تعلق قائم کر کے لسانی اتحاد کا ثبوت دیتے ہیں۔

20.5.3 اردو اور گجراتی دو جدید آریائی زبانیں

ہندوستان کی سرزمین میں سارے شمالی ہند کا علاقہ آریائی زبانوں سے مربوط رہا جب کہ جنوبی ہند کا علاقہ دراوڑی زبانوں سے مالا مال رہا۔ گجرات کے علاقہ کو طویل عرصہ تک دکن کا علاقہ کہا جاتا رہا۔ اس علاقہ پر مسلمان سلطنتوں کے اقتدار کے دوران بھی گجرات کے ساتھ ساتھ مالوہ کے علاقہ کو بھی دکن یا جنوبی ہند کا علاقہ تصور کیا جاتا رہا۔ اس تصور کو آزادی کے بعد نظر انداز کر دیا گیا کیوں کہ گجرات کے علاقہ میں پھیلنے والی زبان گجراتی نہ صرف ہندوستان کی ہند آریائی زبان یعنی شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہونے والی ایک مکمل آریائی اور سنسکرت زبان ہے بلکہ اردو زبان بھی شورسینی اپ بھرنش سے وجود میں آنے والی مغربی ہندی کی شاخ کھڑی بولی سے وجود میں آئی ہے۔ اس طرح اردو اور گجراتی دونوں زبانوں کو آریائی زبانوں کا درجہ حاصل ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ گجراتی زبان نے شورسینی اپ بھرنش جیسی ہند آریائی زبان سے استفادہ کیا جب کہ اردو زبان نے شورسینی اپ بھرنش سے وجود میں آنے والی مغربی ہندی اور پھر مغربی ہندی جیسی سنسکرت زبان سے پیدا ہونے والی پانچ بولیوں میں سے کھڑی بولی سے استفادہ کیا۔ غرض دونوں زبانیں ہندوستان میں پیدا ہونے والی ہند آریائی خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ دونوں میں لسانی اشتراک ہے۔ اسماء اور افعال کے معاملہ میں بھی دونوں زبانوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اردو لکھنے کا انداز نستعلیق ہے اور اردو زبان میں سنسکرت سے زیادہ عربی اور فارسی کے الفاظ کا داخلہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں گجراتی زبان کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جاتا ہے اور اس زبان میں اردو کی طرح الفاظ، اسماء اور افعال کے استعمال کے باوجود عربی اور فارسی لفظیات سے زیادہ سنسکرت لفظیات کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس طرح لسانی اعتبار سے دونوں زبانوں کا تعلق قائم ہونے کے باوجود بھی دونوں زبانیں اپنے رسم الخط اور الفاظ کے ذخیرے کے معاملہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

20.6 گجراتی پر عربی اور فارسی کا اثر

گجرات پر جب مسلمانوں کے دور اقتدار کا سلسلہ جاری رہا تو بے شمار عربی اور فارسی الفاظ گجراتی زبان کا حصہ بنتے

رہے جن الفاظ کو گجراتی زبان نے اس دور کے تقاضہ کے مطابق اختیار کرلیا۔ ان کا رواج آج تک بھی گجراتی زبان کا حصہ ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ آنے والے نئے ہتھیار ہی نہیں بلکہ ان کی سماجی، معاشرتی اور ثقافتی خصوصیات کا اثر بھی گجراتی تہذیب پر پڑا۔ اس کے علاوہ کراچی ہی نہیں بلکہ کچھ کے علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں نے اپنی مادری زبان کی حیثیت سے گجراتی کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کے علاوہ فطرہ، صدقہ اور ایسے ہی کئی اسلامی عقائد کے الفاظ کو تلفظ کے ردوبدل کے ساتھ گجراتی میں استعمال کیا جانے لگا۔ ایک مرتبہ عربی اور فارسی الفاظ جب گجراتی کا حصہ بن گئے تو وہ ہندوستانی تلفظ کے ساتھ اس زبان کا حصہ بنتے چلے گئے۔ اس طرح گجراتی نے اپنے ابتدائی دور میں عربی اور فارسی لفظیات کو ناگری رسم الخط میں استعمال کرتے ہوئے صرف اس دور کی پیروی کی بلکہ اسے آج بھی اپنی زبان کا ورثہ تصور کرتی ہے۔ عربی لفظ بندہ فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور یہ لفظ گجراتی کا بھی اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح ابتدائی دور میں گجراتی نے عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ سے استفادہ کیا جب کہ ابتدائی دور میں اردو زبان نے عربی اور فارسی کے بجائے سنسکرت زبان کے الفاظ سے استفادہ کیا۔ اس قسم کی تبدیلی کی وجہ یہ رہی کہ گجرات پر مسلمانوں کی حکومت کے نتیجہ میں اس علاقہ کی زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات مرتب ہوئے جب کہ بعد میں ان اثرات کو کم سے کم کردیا گیا۔ اس طرح موجودہ دور کی گجراتی زبان میں عربی اور فارسی کے بجائے سنسکرت الفاظ کے استعمال کا چلن عام ہوگیا ہے۔

20.6.1 اردو پر عربی اور فارسی کا اثر

ہندوستان کی سرزمین میں آریائی زبانوں سے استفادہ کرنے والی اردو زبان نے ابتدا میں مغربی ہندی اور کھڑی بولی کی لفظیات سے استفادہ کیا۔ دکن کی سرزمین میں اردو کی پرورش کے دوران بھی کئی سنسکرت لفظیات دکنی زبان کا وسیلہ بنتے رہے لیکن اس کے ساتھ ہی ادیبوں اور شاعروں نے اردو کی طرز تحریر کے لیے فارسی رسم الخط کو جاری رکھا پھر رفتہ رفتہ سنسکرت لفظیات کے بجائے عربی اور فارسی لفظیات کا چلن عام ہونے لگا۔ بنیادی طور پر اردو کو ہندآریائی اور شورسینی اپ بھرنش سے وجود میں آنے والی زبان کا درجہ حاصل ہے اور اس زبان نے ہمیشہ اپنا رسم الخط نستعلیق رکھا۔ لیکن اردو جملوں کی ساخت سنسکرت زبان کے قواعد کی ساخت پر ہے جب کہ اردو لفظیات میں فارسی اور عربی زبانوں کے الفاظ کی کثرت ساٹھ فی صد سے زیادہ ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو پر سنسکرت کا اثر غالب نہیں بلکہ عربی اور فارسی کا اثر زیادہ ہے۔

20.6.2 گجراتی پر آریائی زبانوں کے اثرات

گجراتی اور اردو ہر دو زبانوں کی لسانی اساس آریائی زبان ہے۔ اردو ایک آریائی زبان ہونے کے باوجود بھی اس زبان نے قواعد کی رو سے سنسکرت قواعد کی پیروی کی لیکن اسماء اور افعال کے معاملہ میں عربی اور فارسی سے استفادہ کیا۔ بعض افعال میں مصدر کے عربی اور فارسی انداز کو ''کرنا'' اور ''ہونا'' سے مربوط کرکے اردو نے آریائی زبان کے ساتھ ساتھ غیر آریائی زبان کے الفاظ کے استعمال پر توجہ دی۔ اس کے بجائے گجراتی زبان مکمل طور پر آریائی زبان ہونے کے ناطے اس زبان نے پراکرت اور سنسکرت کے بنیادی الفاظ میں تھوڑا بہت ردوبدل کرکے انھیں استعمال کرنا شروع کیا۔ یہی نہیں بلکہ طویل عرصہ تک گجراتی زبان

میں عربی رسم الخط کو بھی اختیار کیا لیکن گجراتی زبان اردو کی طرح عربی اور فارسی الفاظ سے کم سے کم استفادہ اور پراکرت کے علاوہ سنسکرت کے الفاظ سے بھر پور استفادہ کرتی ہے۔ گجراتی بھی شورسینی اپ بھرنش سے وجود میں آنے والی زبان ہے۔ اس لیے گجراتی زبان میں اپنے ذخیرہ کے معاملہ میں سنسکرت قواعد کے ساتھ ساتھ سنسکرت لفظیات اور ان کو اپنے انداز سے برتنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ گجراتی زبان میں اردو زبان کی طرح دوسری زبان کے الفاظ کے استعمال کا تنوع نہیں پایا جاتا۔ جب کہ بے ساختہ دوسری زبانوں کے الفاظ با آسانی گجراتی میں داخل نہیں ہوتے۔ گو کہ اردو بھی مغربی ہندی سے وجود میں آنے والی زبان ہے جب کہ گجراتی کو بھی اسی بنیادی زبان سے استفادہ کا موقع ملا ہے لیکن لسانی اعتبار سے گجراتی نے تمام آریائی زبانوں سے استفادہ کیا چناں چہ گجراتی پر راجستھانی، پنجابی، برج بھاشا کے علاوہ مشرقی ہندوستان کی بولیوں کے اثرات واضح ہیں۔ اگر چہ گجراتی زبان کو مدھیہ پردیش کی درمیانی زبانوں سے استفادہ کا موقع حاصل ہوا اس کے باوجود بھی گجراتی زبان میں کمایونی بولی اور گھڑ والی بولی کے علاوہ راجستھان کے علاقہ کی مغربی پہاڑی بولی سے استفادہ کیا۔ راجپوتانہ کی بولیوں کا اثر بھی گجراتی پر دکھائی دیتا۔ حالاں کہ مدھیہ پردیش کی اندرونی زبانوں میں ان تمام بولیوں کے اثرات موجود ہیں اس کے باوجود گجراتی زبان اپنے مخصوص دائرے میں ترقی کرتی ہوئی بیشتر اردو سے مماثل لفظیات اور خصوصیات کو نمائندگی دیتی ہے۔ اس طرح گجراتی زبان نے لسانی پس منظر میں آریائی زبانوں سے بھر پور استفادہ کیا۔ اس لیے گجراتی کو مخصوص آریائی بولیوں سے وابستہ زبان کا درجہ دیا جاتا ہے جب کہ اردو آریائی قواعد کی تکمیل کرتے ہوئے عربی اور فارسی اسماء، صفات اور افعال کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس طرح یہی بنیادی فرق اردو اور گجراتی جیسی قریبی زبانوں میں اتحاد کے ساتھ ساتھ دوری کا سبب بھی بنتا ہے۔ غرض گجراتی زبان نے آریائی بولیوں سے استفادہ کیا جب کہ اردو اپنے اصلی مصدر آریائی زبانوں سے حاصل کرتی اور باقی تمام معاملات میں عربی اور فارسی کا تتبع کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اردو کی شعری اور نثری اصناف بھی سنسکرت اصناف سے جداگانہ ہیں اس کے بجائے گجراتی نے اپنے شعری اور نثری ذخیرے کو آریائی شعری اصناف سے وابستہ رکھا ہے۔

20.7 خلاصہ

گجراتی اور اردو زبان کو ہند آریائی زبانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ گجراتی زبان بھی عہد قدیم اور عہد وسطی اور عہد جدید سے وابستہ ہے۔ گجراتی زبان کا عہد قدیم گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی تک اور گجراتی زبان کا عہد وسطی چودہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک اور عہد جدید انیسویں صدی سے تا حال قرار دیا جاتا ہے۔ اردو کے دور کو بھی تین مختلف ادوار کا موقف حاصل ہے جو عہد قدیم، عہد وسطی اور عہد جدید سے تعلق رکھتا ہے۔ راجپوتانہ اور پنجاب میں حکمران بادشاہ گوجر کہلائے اور انہی گوجروں نے گجرات کے علاقہ میں حکمرانی کی تو ان کی زبان گجراتی کہلائی۔ گجراتی زبان بھی شورسینی اپ بھرنش سے استفادہ کرتی اور پھر مغربی ہندی سے عالم وجود میں آنے والی ایک زبان ہے۔ اس کے مقابلہ میں اردو زبان مغربی ہندی کی شاخ کھڑی بولی سے وجود میں آئی ہے۔ دکنی زبان میں حضرت برہان الدین جانم نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ جس کا مطلب ڈاکٹر اکبرالدین صدیقی نے گجری سے واضح کیا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ گجراتی اور دکنی ایک زبان نہیں ہوسکتی۔ دکنی میں بھی سنسکرت الفاظ موجود ہیں۔ گجراتی میں بھی فاعلی حالت کا عمل دکنی جیسا ہے جیسے کرنہار، دیکھنہار، لکھنہار وغیرہ۔ غرض دکنی

نے گجراتی سے استفادہ کیا ہے۔ گجراتی اور اردو الفاظ کی اصل ایک یعنی سنسکرت زبان ہے۔ گجراتی زبان پر کولی پراکرت کا اثر ہے جو کچھ کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ گجراتی زبان کا ابتدائی عملا عربی اور فارسی سے منسلک رہا پھر رفتہ رفتہ گجراتی نے ناگری رسم الخط کو اختیار کرلیا۔ گجراتی کو ایک جدید ہند آریائی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ جو صرف گجرات ہی نہیں بلکہ کراچی، کچھ اور شمالی امریکہ، ماریشیس اور برطانیہ کے علاوہ افریقی ممالک میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میں گجراتی کو چودھواں مقام حاصل ہے۔ گجراتی اور آریائی زبان میں لفظوں کی مماثلت ہے۔ اردو کے اصلی مصادر سنسکرت سے مربوط ہیں اور گجراتی میں بھی وہی کیفیت موجود ہے۔ گجراتی رسم الخط آج ناگری حیثیت کا حامل ہے۔ جب کہ پہلے عربی تھا اس کے بجائے اردو کا تحریر کا انداز خالص نستعلیق خط کی نمائندگی کرتا ہے۔ گجراتی آریائی انداز یعنی قواعد کی رو سے فاعل، مفعول، فعل کی ترکیب اردو ہی کی طرح ہے۔ گجراتی کو کئی علاقوں میں پھیلنے کا موقع ملا۔ پاکستان میں بسنے والے میمن خاندان کے لوگ گجراتی میں بات کرتے ہیں۔ گجراتی اور اردو میں یہی مماثلت ہے کہ گجراتی نے ہند آریائی انداز کو اختیار کیا جب کہ اردو نے ہند آریائی کے علاوہ ہند ایرانی اور سامی انداز کو عربی سے قبول کیا۔ اردو اور گجراتی میں باہمی ربط اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ گجراتی زبان بھی ابتدا میں عربی میں لکھی جاتی تھی لیکن اب ناگری میں لکھی جاتی ہے۔ اردو زبان کھڑی بولی سے وجود میں آئی جب کہ گجراتی زبان شورسینی اپ بھرنش سے رشتہ رکھتی ہے دونوں میں الفاظ کا ربط دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو اور گجراتی کو دو جدید ہند آریائی زبانوں کا درجہ حاصل ہے۔ گجراتی زبان پر ہی نہیں بلکہ اردو زبان پر بھی عربی اور فارسی کے اثرات موجود ہیں۔ گجراتی نے آریائی اثرات کو قبول کیا اور اردو نے بھی اپنی دکنی زبان کے ذریعہ جدید ہند آریائی زبان یعنی مرہٹی سے ''چ'' تاکیدی کو قبول کر کے اپنے انداز میں آریائی زبانوں کے اثرات کی نمائندگی کی۔ اس طرح اردو اور گجراتی کے باہمی لسانی ربط اور رسم الخط کی مماثلت کو بھی یادگار کا درجہ حاصل ہے۔

20.8 نمونہ امتحانی سوالات

I مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً چالیس (40) سطروں میں دیجیے۔

1۔ اردو اور گجراتی کے باہمی تعلق کی وضاحت کیجیے۔

2۔ اردو کا قدیم نام گجری کی لسانی اور معنوی حقیقت واضح کیجیے۔

3۔ گجری اور دکنی فرق کو واضح کیجیے۔

II مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تقریباً بیس (20) سطروں میں دیجیے۔

1۔ گجراتی اور اردو کے ربط کو بتاتے ہوئے گجراتی زبان کی تاریخ کا جائزہ لیجیے۔

2۔ کن بنیادوں پر گجراتی کو ایک جدید ہند آریائی زبان کا درجہ دیا جاتا ہے؟

3۔ گجراتی کی آریائی خصوصیات بیان کیجیے۔

20.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو : ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 2015ء

2۔ گجراتی زبان (انگریزی متن) : انسائیکلو پیڈیا، وکی پیڈیا، بہ توسط انٹرنٹ

3۔ فرہنگ ادبیات : سلیم شہزاد، منظر نما، مالیگاؤں 1998ء

4۔ اردو میں لسانی تحقیق : ڈاکٹر عبدالستار دلوی 1971ء

5۔ اردو کی تعلیم کے لسانی پہلو : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ 1964ء

6۔ ہندوستانی لسانیات : ڈاکٹر محی الدین قادری زور 1975ء

7۔ اردو لسانیات : ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین

8۔ اردو لسانیات : ڈاکٹر شوکت سبزواری 1975ء

ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

فیکلٹی آف آرٹس

ایم۔اے اردو

سال اول

نصاب۔I اردو لسانیات

بلاکI : لسانیات کی تعریف

اکائی۔ 1 علم زبان

اکائی۔ 2 لسانیات کیا ہے؟

بلاکII : توضیحی لسانیات

اکائی۔3 صوتیات

اکائی۔4 فونیمیات

اکائی۔5 صرف

اکائی۔6 نحو

اکائی۔7 معنیات

بلاکIII : اطلاقی لسانیات

اکائی۔8 اسلوبیات

اکائی۔9 ساختیات پس ساختیات

اکائی۔10 تدریس زبان

اکائی۔11 لغت نویسی اور اصطلاح سازی

بلاکIV : لسانیات اور دیگر علوم

اکائی۔12 لسانیات اور سماجیات

اکائی۔13 لسانیات اور تاریخ

اکائی۔14 لسانیات اور نفسیات

اکائی۔15 لسانیات اور کمپیوٹر سائنس

بلاک V : اردو زبان کا ارتقا

اکائی۔16 ہند آریائی کا ارتقا

اکائی۔17 اردو اور پنجابی

اکائی۔18 اردو اور پالی

اکائی۔19 اردو اور نواح دہلی کی بولیاں

اکائی۔20 اردو اور گجراتی

ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

شعبہ اردو

ایم۔اے اردو

سال اول

نصاب۔I اردو لسانیات

نمونہ پرچہ سوالات

وقت: 3 گھنٹے

زیادہ سے زیادہ نشانات : 70

کم سے کم نشانات : 28

حصہ الف

(نشانات : 40 = 10 x 4)

نوٹ : I صرف چار(4) سوالات کے جواب مطلوب ہیں۔

II ہر سوال کا جواب چالیس (40) سطروں میں لکھیے۔

III ہر سوال کے دس(10) نشانات ہیں۔

1۔ لسانیات کی تعریف کیجیے اوراس کے احاطہ کار پر روشنی ڈالیے۔

2۔ تدریس زبان کے مسائل کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

3۔ ہند آریائی کے مرحلہ وار ارتقا کی وضاحت کیجیے۔

4۔ اردو اور پنجابی کی مماثلتوں پر روشنی ڈالیے۔

5۔ فونیمیات کی تعریف کیجیے اور مختلف جوڑوں کی وضاحت کیجیے۔

6۔ اردو پر نواح دہلی کی بولیوں کے اثرات کی شناخت کیجیے۔

7۔ لسانیات اور سماجیات کے رشتے پر اظہار خیال کیجیے۔

8۔ صرف کی تعریف کیجیے اور صرفی تجزیے کے اہم مسائل پر روشنی ڈالیے۔

حصہ ب

(نشانات : 30 = 6 x 5)

نوٹ : I صرف پانچ (5) سوالات کے جواب مطلوب ہیں۔

II ہر سوال کا جواب بیس (20) سطروں میں لکھیے۔

III ہر سوال کے چھ(6) نشانات ہیں۔

9۔ صوتیات کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

10۔ فائلالوجی اور لسانیات کا تقابل کیجیے۔

11۔ معنیات سے کیا مراد ہے؟ اس کے تحت کن مسائل پر بحث کی جاتی ہے؟

12۔ اردو اور پالی کے رشتے کا اجمالی جائزہ لیجیے۔

13۔ لسانیاتی مطالعات میں کمپیوٹر سائنس کے شمول پر اظہار خیال کیجیے۔

14۔ اسلوبیات کی تعریف کیجیے اور اس کے طریقہ کار پر روشنی ڈالیے۔

15۔ نحو کے احاطہ کار کا جائزہ لیجیے۔

16۔ ساختیات اور پس ساختیات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے ۔

17۔ اردو اور گجراتی کی مماثلتوں کو اجاگر کیجیے۔

18۔ اصطلاح سازی کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

شعبہ اردو

ایم۔اے اردو

سال اول

نصاب۔I اردو لسانیات

مشق۔I

نشانات : 15 کامیابی کے نشانات : 6

ہدایات

- مشق پورا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ اس کے نشانات سالانہ امتحانات میں لیے گئے نشانات میں ملائے جائیں گے۔ پورے کیے گئے مشقوں کو مقررہ وقت میں داخل کرنا اور اس میں کامیاب ہونا بھی ضروری ہے۔
- سوالوں کا جواب لکھتے وقت کسی کتاب، مقالے یا مضمون سے نقل نہ کریں۔
- کسی اقتباس کا لکھنا ضروری ہے تو اس کتاب کا پورا حوالہ دیں۔
- ہر صفحہ کے ایک ہی جانب لکھیں۔
- ممتحن کو اپنی رائے لکھنے کے لیے جگہ چھوڑ کر لکھیں۔
- مشق پورا کرنے کے لیے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہ لیں۔

حصہ۔I (نشانات : 10 = 10 x 1)

ہدایات : (الف) درج ذیل سوالات میں سے کسی ایک کا جواب تقریباً پانچ سو (500) الفاظ میں لکھیے۔

(ب) ہر ایک جواب کے لیے دس (10) نشانات مختص ہیں۔

سوال 1 : فونیمیات کے مسائل و مباحث کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

سوال 2 : اردو پر نواح دہلی کی بولیوں کے اثرات کو نشان زد کیجیے۔

حصہ۔II (نشانات : 5 = 5 x 1)

ہدایات : (الف) درج ذیل سوالات میں سے کسی ایک کا جواب تقریباً دو سو پچاس (250) الفاظ میں لکھیے۔

(ب) ہر ایک جواب کے لیے پانچ (5) نشانات مختص ہیں۔

سوال 1 : لسانیات اور تاریخ کے رشتے کی وضاحت کیجیے۔

سوال 2 : نحو کے اہم مسائل پر روشنی ڈالیے۔

ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونی ورسٹی

شعبۂ اردو

ایم۔اے اردو

سال اول

نصاب۔I اردو لسانیات

مشق۔II

نشانات : 15 کامیابی کے نشانات : 6

ہدایات

- مشق پورا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ اس کے نشانات سالانہ امتحانات میں لیے گئے نشانات میں ملائے جائیں گے۔ پورے کیے گئے مشقوں کو مقررہ وقت میں داخل کرنا اور اس میں کامیاب ہونا بھی ضروری ہے۔
- سوالوں کا جواب لکھتے وقت کسی کتاب، مقالے یا مضمون سے نقل نہ کریں۔
- کسی اقتباس کا لکھنا ضروری ہے تو اس کتاب کا پورا حوالہ دیں۔
- ہر صفحہ کے ایک ہی جانب لکھیں۔
- ممتحن کو اپنی رائے لکھنے کے لیے جگہ چھوڑ کر لکھیں۔
- مشق پورا کرنے کے لیے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہ لیں۔

حصہ۔I (نشانات : 10 = 10 x 1)

ہدایات : (الف) درج ذیل سوالات میں سے کسی ایک کا جواب تقریباً پانچ سو (500) الفاظ میں لکھیے۔

(ب) ہر ایک جواب کے لیے دس (10) نشانات مختص ہیں۔

سوال 1 : صرف کی تعریف کیجیے اور اس کے اہم مسائل کی وضاحت کیجیے۔

سوال 2 : ہند آریائی کے ارتقا کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

حصہ۔II (نشانات : 5 = 5 x 1)

ہدایات : (الف) درج ذیل سوالات میں سے کسی ایک کا جواب تقریباً دو سو پچاس (250) الفاظ میں لکھیے۔

(ب) ہر ایک جواب کے لیے پانچ (5) نشانات مختص ہیں۔

سوال 1 : لسانیات اور نفسیات کے رشتے پر روشنی ڈالیے۔

سوال 2 : لغت نویسی کے مسائل کا اجمالی جائزہ لیجیے۔